# سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین

معارف اعظم گڑھ 1916ء - 2014ء کے منتخب مضامین

ترتیب: **حافظ عبدالغفار**

پی ایچ ڈی سکالر (سیرت) پنجاب یونی ورسٹی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

**کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

## ☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

**﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾**

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ یادگار سیرت کتاب نمبر 4

# سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین

ترتیب

حافظ عبدالغفار
پی ایچ ڈی سکالر (سیرت) پنجاب یونی ورسٹی



دار النوادر
0300-8898639

بیاد
پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ
۱۹۴۷ - ۲۰۰۹


۲۰۱۵ء

نام کتاب : سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین
ترتیب : حافظ عبدالغفار
اہتمام : دار النوادر، لاہور
مطبع : شفیق پریس، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 37320318-37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

# ترتیب

# مقالاتِ مستشرقین اور سیرتِ نبوی

از: ڈاکٹر عماد الدین خلیل موصل یونیورسٹی عراق
مترجم: حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔ رفیق دارالمصنفین

پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے، جس میں قومی تعصب، ذہنی تشنج، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور ان کی ارادی و غیر ارادی دونوں طرح کی جہالت اس کا احاطہ کیے ہوتی ہے، اسی لیے پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہ بہ تہ تاریکیاں حائل ہوگئی ہیں، غرض رسولِ اکرم ﷺ کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی و موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب و شتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لامذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلاخیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے، اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لیے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے، اور قلم میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے، مگر نقل کفر کفر نباشد کے بموجب ان کے بعض ہفوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ خیالات دورِ جدید کے مستشرقین کے ہیں، جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں، ایک مستشرق مونیپور کولی اپنی کتاب "الحث عن الدین الحق" میں لکھتے ہیں:

"مشرق میں ایک نئے دشمن اسلام کا ظہور ہوا جس کی بنیاد اور تعمیر طاقت اور شدید تعصب پر قائم ہے، محمد ﷺ نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں تلوار دے کر اخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے، اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ

کھسوٹ کی اجازت دے دی۔ لڑائیوں میں قتل ہوجانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنا لیا۔ ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا۔ آدھا فرانس بھی ان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہوگیا، اور تہذیب وتمدن پر سخت افتاد آئی ...... یہ عیسائیت تھی جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی، اور تقریباً دو سو برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں۔ جن کے نتیجہ میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے، تب عیسائیت کو نجات ملی، اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا۔ اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی۔''

ایک اور مستشرق مسیو کوین اپنی کتاب میتھالوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں:

''دین محمدیؐ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا۔ اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہی نہیں، بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے، جو انسان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر بیدار بھی کرتا ہے تو صرف خون ریزی، شراب خوری اور دوسری ساری برائیوں کے لیے، مکہ میں محمد ﷺ کی قبر بجلی کا ایسا ستون ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کردیتا ہے۔ اور انھیں ہذیان، ہسٹریا، عقل فراموشی اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کردیتا ہے، اور جو چیزیں اصل فطرت کو مرغوب ہیں ان سے نفرت کا خوگر بناتا ہے۔ مثلاً لحم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ اور ان میں سنگ دلی اور فسق وفجور کے جذبات وخیالات کی پرورش کرتا ہے۔''

مستشرق جویلیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں:

''محمد ﷺ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں انھوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں، اور سارے مذاہب کو تبدیل کر کے اپنے مذہب کا بول بالا کریں، ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بڑا فرق ہے، عربوں نے اپنے

مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ، ورنہ موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب کہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہو جاتے، تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی، آج ہم بھی الجزائری اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے۔''

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب ''تقدم التبشیر العالمی'' (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں، جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے، ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''محمد (ﷺ) کی تلوار اور قرآن، یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور دنیا پر اب تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے، اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں، ...... جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب وغریب مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی اس میں آمیزش ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ وہ نہایت پیچیدہ ہے، اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا، مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو تنہا ہے، بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جابر بادشاہ ہے جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ اسلام ان دونوں کے ربط و تعلق کا ذکر کرتا ہے...... محمد (ﷺ) ایک آمر مطلق تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قوم پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے، مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے، خود محمد (ﷺ) کی فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی، چنانچہ جو ان کی مرضی پر نہ چلتا وہ اسے قابل گردن زدنی سمجھتے تھے۔ ان کا عربی لشکر، تباہی و بربادی اور غلبہ وتسلط کا پیاسا تھا، جس کو اس کے پیغمبر نے ہدایت بھی یہی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے اور ان کے راستے سے دور ہو جائے، اسے قتل کر دیں۔''

مستشرق سفاری نے ۱۷۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ:

''محمد (ﷺ) نے اقتدار الٰہی کا اسی لیے سہارا لیا، تا کہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی

سے ) قبول کرلیں، پھر انھوں نے خود پر بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا، حالانکہ یہ اعتقاد محض ایک فریب تھا، جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا......"

اسی کج بحثی اور یاوہ گوئی نے دراصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی، اور دونوں میں ایسی شدید کشمکش پیدا کردی، جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کے تلخ وتند گھونٹ آج تک یورپ کے حلق سے نیچے نہیں اترے، اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کرسکا ہے، نومسلم محمد اسد (سابق لیو پولڈ ویلس) ایک تلخ تجربہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ اسلام سے متعلق، یورپ کو ورثہ میں جو حقارت کے جذبات ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ سے جو خلیج پیدا کی، اس پر کوئی پل نہیں بن سکا، اور وہ نہ صرف یہ کہ باقی ہے، بلکہ اسلام کی تحقیر وتذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیادی حصہ بن چکی ہے، درحقیقت یورپ کے اوّلین مستشرقین نے موجودہ دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ وروپ اختیار کرلیا ہے جن کی ریشہ دوانیاں عالم اسلام میں جاری ہیں، ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی تصویر پیش کی ہے کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بت پرست مذہب نظر آتا ہے، گو بعد میں علوم واستشراق مشنریوں کے اثر سے آزاد ہوگئے، اس لیے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا الزام بھی نہیں عائد کیا جاسکتا، تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے، ان کا سبب صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں، خود اسلام ہے، جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور اپنی بات کو منوالینے کی جو طاقت نیز حرکت وحرارت اور توانائی پوشیدہ ہے، اس کی وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تنہا دیوار اور رکاوٹ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی مسلم ورلڈ مطبوعہ ۱۹۳۰ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے:

"مغرب کی دنیا پر خوف ودہشت کا طاری ہونا ضروری ہے، جس کے چند اسباب ہیں: اسلام کا جب سے مکہ میں ظہور ہوا وہ عددی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا

اور پھیلتا رہا، اور اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہوگئے ہوں۔"

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ:

"عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرونِ وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پشتہ بن گیا اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہوگیا جو عیسائیت کے زیرنگیں تھے۔"

ایسے پر از تعصب ماحول اور کلیسائی طرز فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کی اصل روح وحقیقت کو سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہوسکتی تھی یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی و بیداری کے زمانہ میں دین کو سیاست سے جدا کردیا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی آ گئی، لیکن اسلام اور خصوصاً سیرت نبوی ﷺ کے بارے میں عیسائیت کے طرزِ فکر میں شمہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس تعصب پر مبنی طرز فکر کی تقویت کے لیے اسٹیج تیار ہوتے رہے، اور اسلامیات کے تجزیہ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مطالعہ کے لیے نسلوں کی نسلیں ان اسٹیجوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں، اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض تو خالص کلیسا کے آدمی تھے، جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے، لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو کلیسا سے کوئی سرکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ ان سے توقع ضرور تھی کہ پیغمبر اسلام (ﷺ) پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی، اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گزشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا۔ اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی چنانچہ لب ولہجہ اور سب وشتم میں کچھ شائستگی آ گئی۔ لیکن طرز فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سیرت نبوی ﷺ سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمائیاں بدستور جاری رہیں۔ بے سروپا تعلیل وتجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں۔ دانستہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جو محض وہم وخیال اور تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی، وہ

لوگوں کی نگاہ میں یقین، اعتماد اور اعتبار کے درجہ تک پہنچ گیا، طرز فکر، انداز بحث اور طریقہ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی ذیل میں نشان دہی کی جاتی ہے، اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض غلطیوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر ان کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں اور ان کی تقویت کے لیے شاذ وغریب حدیث کو پیش کرتے ہیں، اور اسے مشہور ومستند روایت پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ نقد وجرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو، یہ لوگ ایسا قصداً اس لیے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک وشبہات کو ہوا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سیرت نبوی ﷺ کے واقعات اور کارناموں کو وہ عیسائی، یہودی، اصولوں کی دین سمجھتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے، اس لیے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا، عیسائیت کے سر باندھتے ہیں، اور جو مستشرق یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صہیونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملا دیں۔ درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات وخواہشات کے تابع ہیں، مثلاً برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ ”اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد (ﷺ) کی غار حرا میں آمد ورفت کوئی ناممکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جا سکتے تھے۔ وہ غار حرا میں چلے جاتے رہے ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کی اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ خود محمد (ﷺ) کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی کی آرزو، امنگ اور رغبت پیدا کی ہو، یہی مستشرق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ”ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Moms) سے متعلق ہے، جس کے معنی شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے اور ورقہ بن نوفل نے جب محمد ﷺ پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ ومماثل ہے۔ مگر محمد ﷺ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں، اور جیسا کہ ابتدا میں ہوتا

ہے۔ محمد ﷺ شروع میں طبعی طور سے متردد تھے، اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی محمد ﷺ کی داخلی کیفیات کے لیے اہم چیز ثابت ہوئی، اسی لیے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔''

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہ رفع ہوجاتا ہے، اور معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں ہے، لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں، یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے مبلغوں کو بھڑکا دیا تھا، حال ہی میں پن گوئن سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مستشرق نے ایسے کئی موازنے کیے ہیں۔ جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا ناپختہ صورت ہے، مشہور مستشرق کانٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو بھی اسی صورت میں پیش کرنے اور ڈھالنے کی کوشش کی، جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے۔ کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان کی یہ کوشش، عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے، اس کا انجام ظاہر ہے کہ سوء فہمی اور بدعقیدگی کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا۔ کیونکہ یہ نقطہ نظر، قرآن کا عطا کردہ تھا، اسی لیے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں اتارے، لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارے میں ایک مسلمان کے اعتقاد ونقطہ نظر کو قبول کرنے سے روک دے، اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کو ردّ کرتا ہے، بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی ردّ کرتا ہے، اور دونوں رایوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا۔ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹ ویل سمتھ) اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام

بھی نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ایک مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح معلومات پیش کررہے ہیں، تاکہ انھیں منصف اور محقق تسلیم کیا جائے، لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کسی طور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محمد ﷺ نے یہودیوں کی کتاب تالمود اور دوسرے بعض تحریف شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے، اور مسیحیت کی نسبت وتعلق سے تو اس کا قوی احتمال ہے کہ محمد ﷺ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے، معروضی وموضوعی مطالعہ کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی شاعرانہ خیال آرائی بھی لائق توجہ ہے، جو مقالہ کے آخر میں درج ہے کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہیے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ یہ مستشرقین اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ ونہج اختیار کرتے ہیں اور نتائج کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں، ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اوّلین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے، اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین انھی کے نقش قدم پر گامزن ہیں، یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں، پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں، اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں، جو ان کی رائے کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں، باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں، کیتانی ذی رائے اور صاحب فکر تھے انھوں نے سیرت نبوی ﷺ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کرلیے تھے، چنانچہ جب انھوں نے سیرت سازی شروع کی، تو رطب ویابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کرلیا، اور ان روایتوں کو خاص طور پر قبول کرلیا، جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، اور ان کے ضعف یا قبح کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ انھیں دلیل بنالیا، اور پھر انھی کے مطابق اپنا فیصلہ بھی صادر کردیا، حالانکہ یقین ہے کہ وہ علمائے فن کے نزدیک وضعی اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق وسلاسل سے واقف رہے ہوں گے، لیکن وہ علماء کے اقوال وآراء سے چشم پوشی کرگئے۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے انھیں اپنے خیالات کو ثابت کرنا تھا، خواہ جس طریقہ سے

بھی یہ ممکن ہو، اگر وہ جدید طرز واسلوب کے مطابق نقد وجرح سے کام لیتے اور غلط روایات کو ردّ کرتے، تو پھر ''سیرت سازی'' کا کارنامہ کیسے انجام دیتے، نومسلم مستشرق ایتن ڈینیہ اپنی کتاب "الشرق کما یراہ الغرب" (مشرق مغرب کی نظر میں) میں اس طرز ونہج کے متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اسنوک سیر گونج کی یہ رائے درست ہے کہ ''محمد ﷺ کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں، تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔'' اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا کیونکہ اس سے انھیں ان پرانے امراض سے چھٹکارا ملے گا، جن کی وجہ سے ان کو مقدور سے زیادہ محنت وزحمت کرنی پڑتی ہے، اور وہ بلا شک وشبہ غلط نتائج تک جا پہنچتے ہیں، اور لامحالہ انھیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لیے بعض روایتوں کو باطل قرار دے کر ان کی جگہ دوسری روایتیں گھڑ کر پیش کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے، بیسویں صدی میں ایک عالم کے لیے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم اور ضروریات، رجحان اور میلانات جیسے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے، جو عقل وقیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں، اور جو افراد جماعت میں بہرحال اپنی تاثیر رکھتے ہیں۔ منٹگمری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کیے ہیں، جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں، کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا طریقہ مطالعہ ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رائے کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ مطالعہ وتجزیہ کے نام پر ایک بدنما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر وبیشتر غلط رخ دے دیتے ہیں، ان کا یہ طریقہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت وموضوعیت کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات وافکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں، مثلاً ایک عبارت میں "الاحابیش وعبید اھل مکہ" کا جملہ ہے، اس میں واؤ تفسیری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں، ایک اور عبارت میں ہے "الاحابیش

ومن اطلعهم ای القریشین من قبائل کنانه وتهامه" یہاں پر واؤ تمیز نام پر دلالت کر رہا ہے، لیکن لامانس نے اس عام نحوی قاعدہ کے برخلاف اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی، اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً بروکلمان نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو حملہ کرنے کے لیے اکسانے میں یہود کا حصہ تھا، اور نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی میں بنوقریظہ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ پھر مسلمانوں نے بنوقریظہ پر حملہ کر دیا، جن کا رویہ بہرحال خاموش و پوشیدہ تھا، مستشرق اسرائیل ولفن سون نے غزوۂ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کر کے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتماد کی وجہ سے پیش آیا۔ اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے لیے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں، خصوصاً یہودیوں کے لیے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسرائیل ولفن سون بنونضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملہ کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مؤرخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ مستشرقین اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حشر میں جو بنونضیر کی جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی تھی، کہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے، وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر چشم بنیاد رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے، اور اگر ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی تو وہ بجائے اس کے کہ آپ ﷺ پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے۔ آپ ﷺ کو اچانک گھات دیکھ کر قتل کر دیتے۔ اسرائیل ولفن سون شاید یہودیوں کی نفسیات سے واقف نہیں کہ یہ وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی براہِ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے، بروکلمان لکھتے ہیں، کہ مشرکین پر رسول اللہ ﷺ کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں۔ قدیم عربی شرافت فکر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے

روکتی تھی۔ مدینہ والے اپنے طاقتور پڑوسیوں سے صلح وامن کی فضا کو غبار آلود کرنا نہیں چاہتے تھے آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا، جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا، اور کافی مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا اس قدیم ضابطہ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے، مگر محمد ﷺ نے اپنے پیرؤوں کے عمل پر محض ہلکی سی نکیر کی اور کہا کہ ان لوگوں سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہوگیا ہے، گو کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا، بروکلمان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا عہد ابھی زیادہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے اور احبار یہود کے درمیان نزاع شروع ہوگئی، واقعہ یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں، اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء علم وادراک میں نبی ﷺ اسی سے بڑھ کر تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو کسی دوسری صورت سے بحال کریں چنانچہ غزوۂ احد کی شکست کے بعد ایک معمولی سی بات پر انھوں نے بنونضیر پر حملہ کردیا، مستشرق ول ہاؤزن لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا، بلکہ اس نے مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کردی، منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی علامت ہے، اور یہودیوں کو یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکن ہیں۔ چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں کو یا تو جلاوطن کردیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کردیا گیا، اور اس کے لیے چند لایعنی اسباب تلاش کیے گئے مارگولیتھ نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیبر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا، جس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ...... محمد ﷺ نے ہجرت کے بعد غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا، مکہ والوں سے تو اس طرزِ عمل کی گنجائش یوں ہوسکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ کو اپنے شہر سے نکالا تھا، ان کے مال وجائداد پر قبضہ کرلیا تھا، مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے محمد ﷺ کو انتقام لینا تھا، لیکن خیبر والے تو مدینہ سے بہت دور تھے، وہ محمد ﷺ یا ان کے متبعین کے حق میں کسی جرم وخطا اور ظلم وتعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کی سیاست میں کیسی عظیم تبدیلی آگئی تھی، مدینہ میں آنے کے بعد ہی انھوں نے یہ اعلان

کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا، لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چلا تھا، اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے، اس سے محمد ﷺ کی اس ہوس مال و جاہ کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انھوں نے پے درپے حملے کیے۔ اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا...... خیبر پر محمد ﷺ کا قبضہ اس اندیشہ کا اعلان تھا کہ اسلام امن عالم کے لیے خطرہ بن گیا ہے، مستشرق نولدیکی کو یہ حسرت ہی رہی کاش عرب قبائل نے محمد ﷺ کے خلاف اپنے معابد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کرلیا ہوتا، تو اُن کا جہاد کامیاب نہ ہوتا، افسوس، عرب متحد نہیں ہوئے، اور ان کے اختلاف وانتشار نے محمد ﷺ کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں، اور ان پر کبھی طاقت وقوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پر امن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہے۔

پانچویں بات یہ کہ ان مستشرقین نے سنت اور تاریخ کے عطایا اور ثمرات میں شکوک وشبہات پیدا کیے، اور اپنے ذوق وطبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا کیے، اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کر دیتے، بہرحال سیرت رسول ﷺ سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں، اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کرسکتے کہ تمام انبیاء ورسل میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے، درمنگھم اس نقطہ پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیوتھ، نولدیکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی، سین، گولیم، گولڈ زہیر اور گارڈ فرو وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے، اور ان کی کتابوں میں خاص طور سے سیرت وکردار کشی کی گئی ہے۔ رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ فکر برابر سلبی رہا ہے، فادر لامانس ممتاز مستشرق ہیں، مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں، اپنی شاندار کتابوں کو انھوں نے اسلام اور نبی اسلام کی دشمنی سے داغدار کردیا، ان عیسائی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ

میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضا یہ ہو کہ انھیں ردّ کر دیا جائے، اور ان سے ایک دوسرے کی تائید وتقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیوں کر ممکن ہوگی؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں، اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں، جن کا ذکر قرآن میں نہیں، اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کر کے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں، گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے، جس کا خاص مقصد حضرت محمد ﷺ کی مفصل سیرت کا استقصا ہے، اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور ﷺ کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں، وہ ناقابل قبول ہیں، اسپرنگر کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی آلِ عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے، اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے لیے محمد کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط وضبط کے بعد آپ ﷺ نے اپنے لیے یہ نام بطور اسم علم اپنا لیا: کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم ﷺ نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا، تو پھر وہ محمد کہاں ہیں جن کے بارے میں عہد نامہ قدیم وجدید میں بشارتیں موجود ہیں، سیرت سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرز ادا کے بارے میں منٹگمری واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمد ﷺ سے متعلق ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح اور تصحیح کریں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں۔ سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو، اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریروں میں لامذہبی غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے، وہ سیرت کے زمانہ کو موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ اِیتین ڈینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی

تحریروں کو اپنے جذبات ورجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالا تر رکھیں، اسی وجہ سے سیرت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم میں انھوں نے انتہائی درجہ تحریف وترمیم سے کام لے کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں، کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی تعصب سے پاک، حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ وعلمی ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ اگر مؤلف جرمن مستشرق ہے تو محمد ﷺ جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اگر وہ اطالوی ہے تو محمد ﷺ کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصنف کے ساتھ محمد ﷺ کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے، اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے، تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی۔ یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں، جو حقیقت سے تمام تر دور ہوتی ہیں۔ والٹر اسکاٹ اور الیکزنڈر ڈیماس نے تاریخی افسانوں میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے، لیکن ان مستشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا، اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں، ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں، لیکن محمد عربی ﷺ کا پتہ کہیں نہیں چلتا، یہ اور بات ہے کہ حق کے جویا محمد ﷺ کی روشن اور واضح سیرت کو پا ہی لیتے ہیں، اس لا مذہبی اور محدود ومقالی طرز استدلال نے اکثر مستشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال وہ ہے، جسے فلہاوزن اور ان کے چند رفقاء نے بیان کیا ہے تحریک اسلامی مکہ میں محدود تھی اور شروع میں مدینہ میں بھی اس کی یہی کیفیت رہی، مگر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی جس کے بارے میں اس سے پہلے محمد ﷺ نے سوچا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ مکی دور میں عدم تشدد کے قائل تھے، لیکن مدینہ میں جب انھیں قوت واقتدار حاصل ہوا، اور ان کے اردگرد جنگ جو اور لڑائی کرنے والے اکٹھا ہو گئے، تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو گئے، فلہاوزن کا خیال ہے کہ محمد ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں چونکہ وہ لوگ بھی تھے جن کا ان سے خونی رشتہ نہ تھا، اور ان کا عقیدہ چونکہ خونی رشتہ سے بڑھ کر تھا اس لیے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ

کو ختم کر دیتے، جو خونی رشتہ کا نتیجہ تھا، لیکن وہ خونی رشتہ ودائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ ودائرہ کا تصور نہیں کر سکے، مستشرقین کے اس واہیات نظریہ کی خود سر ٹامس آرنلڈ نے تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے، قرآن کی آیات بینات کے ہوتے ہوئے ہمارے کچھ مؤرخین نے کیسے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابتداءً بانی اسلام نے اسلام کو عالمی دین کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا، ان غلط مؤرخین میں سر ولیم میور بھی ہیں جو رسالت محمدیؐ کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں، بہت سی آیات واحادیث کے باوجود محمد ﷺ کو اس کا خیال نہیں ہوا، اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انھیں اس کا خیال ہوا تھا، تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا، اور جو عالم ان کے پیش نظر تھا، وہ صرف عرب تھا، کیونکہ یہ دین صرف اسی کے لیے ہی تھا، اور محمد ﷺ نے اپنی بعثت سے وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ گو اسلام کی عالمیت کا بیج بو دیا گیا تھا، لیکن اس کی نشو ونما اور اس کے برگ وبار لانے میں منصوبوں اور پروگراموں سے زیادہ حالات وواقعات کو دخل ہے۔ آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا فیضان ساری دنیا کے لیے عام تھا، جس طرح اس کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے، اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے جس کی جانب ساری انسانیت کو دعوت دی گئی، اس بحث میں آرنلڈ کی ہم نوائی میں گولڈ زیہر، نولدیکی اور سخاؤ بھی شامل ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا، بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات کے لیے ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اور محمدؐ چونکہ اللہ کے رسول تھے اس لیے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے، اور یہ اعلان، اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا، آرنلڈ نے فلہاوزن اور میور وغیرہ کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے کہ محمد ﷺ نے حالات کے تحت قوت وطاقت کا استعمال کیا ہے، مگر وہ یہ لکھ کر خود بھی غلطی کر گئے ہیں، کہ محمد ﷺ کی خواہش اور اس کے ایک اندرونی جذبہ نے انھیں ایک نئے دین کی تشکیل کے لیے آمادہ کیا تھا، اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے نئے طرز پر ایک جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی، حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی

کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کے فہم ومطالعہ کے لیے ایسی گہری نظر درکار ہے، جو اسلام کی تحریک کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی جس کا ارتقاء تدریجاً ہوا، اور یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا، رسول اللہ ﷺ کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ سے اپنی بے نظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی، قرآن گو حالات واقعات کی رعایت سے نجماً نجماً نازل ہوا ہے، لیکن یہ اس کے متعین مدنی پروگرام ہونے کے منافی نہیں ہے، دراصل وہ ایک بہترین نظام حیات ہے، جس میں جزئیات وکلیات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، یہ حالات وواقعات ایسے وقتی اور قطعی نہیں تھے، جو اسلام کی رفتار ترقی کو محدود کردیتے، وہ ایک ہدف اور مقصد تھا جو کبھی حالات وعادات زمانہ کے لیے روک، چیلنج اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا تھا، اس کا پوری طرح اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ اوّل قدم ہی پر جب رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کے رخ پر لا الٰہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا، اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا مقامی تقاضے تھے، جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی راہنمائی کی تھی، جس نے جاہلیت کو بیخ وبن سے اکھاڑ دیا تھا، اور اس کی یادگاروں، رسم ورواج، نشانات وعلامات اور معانی ومفاہیم سب کو تہہ وبالا کرڈالا تھا، آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا، کیونکہ وہ بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی، وہ مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست تعارض تھا، اسلام، عرب معاشرہ میں محض اس لیے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ ووحشیانہ رواجوں کا خاتمہ کردے، بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا، جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں، جو عام عربوں کے اس نقطہ نظر سے قطعاً مختلف تھیں، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نومسلم جن کو یہ اسلام سے پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں، قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی، جس کی آیتیں ہر نئے دور میں اور ہر زمان ومکان میں انسانیت کی راہنمائی کے لیے

نازل ہوئی ہیں، وہ سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا، جیسا کہ اکثر مستشرقین عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا خیال ہے، اہل مغرب سے ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت آسمانی کتاب کے ایمان لائیں اور محمد ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کریں، بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہوکر معروضیت اختیار کریں، اور سیرت نبوی ﷺ کا اسی حیثیت سے مطالعہ کریں اور قرآنِ کریم کو ایک مثالی، نظریاتی کتاب سمجھیں، جس کی تعلیمات، زمان ومکان اور وقتی حالات سے ماوراء ہیں، اس میں اگر چند وقتی حالات کا ذکر بھی ہے، تو یہ گوناگوں پاکیزہ قدروں اور اصولوں کا سرچشمہ ہیں، جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ وہ بھی ہے، جس نے اپنی دقت نظر سے سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ہماری تاریخ اسلام کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، لیکن اس غلط نہج اور طرز فکر کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں ہم پیش کرچکے ہیں، اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نتائج وثمرات بھی شامل کردیئے ہیں، اور یہ ایک فطری امر بھی ہے، کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے، اور موضوعیت سے بعد وانحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے، جو علم کی روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

اس مختصر مضمون میں کسی تفصیلی بحث ومطالعہ اور تجزیہ ومحاکمہ کی گنجائش نہیں، غور وفکر سے کام لینے والوں کو خود ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مستشرقین نے سیرت رسول ﷺ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی تہوں کے اندر ہر قسم کا تضاد اور فکری اضطراب لپٹا ہوا ہے۔ اور جس کا علمی بحث اور سنجیدہ اسلوب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہے، اور چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے خود بھی سنجیدہ طرز فکر کو اپنایا اور اپنے ہم قلم مستشرقین کی غلطیوں کو بھی واضح کیا، دیفیہ واٹ درمنگھم اور آرنلڈ کے بعض خیالات ہم گزشتہ صفحات میں پیش کرچکے ہیں، گو ان مستشرقین کا نقطہ نظر بھی زیادہ علمی اور پاکیزہ وشفاف نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی محال اور دشوار ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز اور روس میں بالشویکی انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ اور تاریخ اسلام کے متعلق ایک نیا موقف سامنے آیا، جو تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ تھا، اس کی یہ کوشش

رہی کہ اپنے دستور و نہج کے مطابق جارحانہ انداز سے سیرت نبوی ﷺ میں قطع و برید کر کے اس کی دھجی بکھیر دی جائے، تاکہ لوگوں کا اس سے تعلق ہی ختم ہو جائے، ان لوگوں کو جو کچھ اپنے موافق نظر آیا اسے تو لے لیا اور باقی کو نظر انداز کر دیا، اس طرح جو کچھ لیا اس کا تناسب نہ لیے گئے کہ مقابلہ میں ایک اور دس کا ہے۔ چونکہ سیرت کے واقعات ان کی تحلیل و تجزیہ اور مخفی اغراض و خواہشات کے سراسر خلاف تھے۔ اس لیے انھوں نے تفسیر و تاویل اور قطع و برید میں بڑے عناد اور انتہائی زیادتی سے کام لیا، نیز فلسفہ اور واقعات کے درمیان مطابقت کی تلاش و تحقیق اور تعلیل و توجیہ میں بھی ان لوگوں نے بڑی جانب داری کا ثبوت دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی واقعہ کے بارے میں ان کی رائے مختلف و متضاد ہو گئیں، حالانکہ وہ ایک ہی مکتب فکر کے خوشہ چیں اور ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بعض مارکسی مستشرقین کا خیال ہے کہ مکہ و مدینہ میں عرب معاشرہ نے پہلی بار ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مشاہدہ کیا جس میں غلاموں کو بھی حق ملکیت دیا گیا تھا، بیچولفسکایا کا خیال ہے کہ قرآن نے غلام کے حق ملکیت کے مرحلہ کو مرکوز ہونے کو تسلیم کیا ہے، ڈبلانیف کے اس خیال سے متفق ہیں کہ کمزور طبقہ کا یہ دور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ عرب دوسری قوموں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے، دوسرے مارکسی مستشرقین کہتے ہیں کہ کمزور طبقہ کا معاشرہ فعلاً وجود میں آ گیا تھا، کلیوفنخ کا خیال ہے کہ اسلام جائداد سے نئے نفع اندوز طبقات کے مفاد کی رعایت رکھتا ہے، اور کمزور طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بعض کا قول ہے کہ اسلام صرف غریب طبقہ کی سرمایہ داری کا محافظ ہے، بلانیف کی رائے ہے کہ اسلام جس کا نمائندہ قرآن ہے اور برسر اقتدار طبقوں کے معاشرتی اور سیاسی مفاد کا لحاظ نہیں رکھتا، اسی لیے مسلمان جدید طبقوں کے استحصال کو جائز کرنے کے لیے حدیثیں گڑھنے پر مجبور ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سرمایہ داری تھی، جس نے مقصد برآری کے لیے عربی قبائل کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، لیکن دوسرے مارکسی مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ قبائل وحدت کی طرف اچھل کود کر رہے تھے کہ اسلام کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے وحدت عمل میں آئی، خود نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ آپس میں تضاد رائے کے شکار ہیں۔ کلوفنخ کہتے ہیں کہ اور نبیوں کی طرح محمد ﷺ بھی ایک نبی تھے، آپ نے توحید کی بشارت دی

اور قبائل کو متحد کرنا چاہا، لیکن تولسٹوف، نبی کریم ﷺ کے وجود کے ہی منکر ہیں، اور آپ ﷺ کی شخصیت کو محض ایک افسانوی شخصیت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ظہور اسلام کے معترف ہیں، لیکن کلیونج کا خیال ہے کہ

اسلام کا ایک بڑا حصہ، بعد میں کمزوروں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں سامنے آیا، جس کا تعلق محمد ﷺ کی حیرت ناک کارکردگی سے ہے، ٹولسٹوف اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے خیال میں اسلام ایک من گھڑت افسانہ ہے، جو خلافت کے دور میں برسر اقتدار طبقہ کے مفاد کی خاطر گڑھا گیا، اور اس کے وضع و اختراع میں ان پرانے اعتقادات سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کو حقیقت کہا جاتا تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت ایک ایسا جدید مذہب ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بغض ونفرت میں عیسائیت سے کسی طرح کم نہیں ہے، موضوعی و معروضی مطالعہ سے انھیں بھی کوئی واسطہ نہیں، دراصل رسول اللہ ﷺ اور تاریخ اسلام کی حد تک، مارکسی جدید دور کے پادری ہیں جنھوں نے اپنے بھیس ضرور بدل لیے ہیں، لیکن اپنے اندرون میں وہ وہی قدیم عیسائی پادری ہیں، جو اپنے کو جدید مادیت سے منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے سیرت محمدی ﷺ کو اس سے کم دھندلا نہیں کیا ہے، جتنا قدیم نصاریٰ نے کیا تھا، ذیل میں مادی کلیسا کے ایک فرزند بندلی جوزی کے بعض خیالات پیش کیے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

مکے والوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی جو سیاست تھی وہ نئے عوامل کے زیر اثر اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پر جو حالات اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے، مدینہ میں بڑی حد تک بدل گئی تھی، مکہ سے وطن اصلی ہونے کے متعلق اور وہاں کے لوگوں سے قرابت اور غزوۂ احد وخندق کے بعد پیش آنے والے جذبات اور سیاسی عوامل کی وجہ سے آپ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی ومہربانی کی سیاست اختیار کی۔ خود مکہ کے برسر اقتدار طبقہ نے بدر کی شکست اور اس میں لاحق ہونے والے مالی نقصان کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ چند شرطوں کے ساتھ آپ سے صلح کرلی جائے، جو یہ تھیں کہ کعبہ حج اور زکوٰۃ کو اسی حال میں باقی رکھا جائے، جیسے وہ اسلام سے پہلے تھے،

اور ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کیا جائے۔ نیز آپ ﷺ ان کو بھی اپنے اس نئے عمل میں شریک کرلیں جن میں انھیں اپنے لیے خیر اور بہتری کی توقع ہو، ان کی یہ بھی شرط تھی کہ آپ ﷺ مدینہ ہی میں رہیں گے، اور مکہ والوں کے مالی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوئی اور تالیف قلوب کی سیاست اختیار کی گئی، جسے دوسرے لفظوں میں رواداری اور مصالحت کی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں لوگ خدا کے دین میں جوق در جوق شامل ہو گئے، مگر یہ لوگ اسلام کو صحیح دین سمجھ کر اس میں نہیں شامل ہوئے تھے بلکہ وہ اس لیے اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ نئے حکمراں طبقہ کا قرب حاصل کرسکیں اور اپنے قدیم مذہبی مرکزوں اور دولت کا تحفظ کرسکیں۔ بندلی جوزی کے خیال میں حدیبیہ یا کسی اور موقع کی ایک شرط یہ بھی تھی جس پر دونوں فریق متفق تھے کہ نبی کریم ﷺ مکہ کے سربرآوردہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے باز رہیں گے، اور وہاں کے غریبوں اور کمزوروں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں اسی بنا پر مدنی بالخصوص آخر دور کی سورتوں میں مکہ کے باشندوں کے بارے میں کوئی سخت آیت نازل نہیں ہوئی، نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی مدینہ میں آکر بدل گئی، اور اسی وجہ سے نبی کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہیں اور جیسا کہ اہل یورپ کہتے ہیں، اس میں نبی کریم ﷺ کے کسی قدر تساہل کو بھی دخل تھا۔'' یہ بالکل بے سروپا بات ہے، صلح حدیبیہ کی تمام شرطیں معروف مشہور ہیں، نہ ان میں اس کا کہیں ذکر ہے اور نہ کسی اور مقام اور زمانہ میں آپ نے اس طرح کی شرط عائد کی تھی، بندلی جوزی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا مکی دور تمہید تیاری کا دور تھا۔ جس میں مختلف طبقوں میں ایک نئی دعوت کو پھیلانے کی کوشش جاری تھی، اس دور میں ایک شخص جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص تھا اور اس کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان الفاظ کی جنگ جاری تھی جو اپنی قیادت اور دولت کے بارے میں خطرات محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اس شخص کے خلاف مقابلہ وصف آرائی ہوتی رہی۔ یہ دور کوششوں اور تمناؤں کا دور تھا، اگر یہ کوششیں بارآور ہوجاتیں تو پورا ملک یکسر بدل جاتا، یہ دور کتنا اچھا اور عمدہ تھا۔ نبی ﷺ کا دوسرا دور عمل، تنظیم، جنگوں اور سیاست کا دور تھا۔ لیکن اس میں طرفین کی جانب سے تساہل برتا گیا،

اس طرح کے موقعہ پر تساہل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اصول ترک کر دیئے جائیں اور بعض مطالبوں سے دستبرداری اختیار کرلی جائے، یا بعض اذکار وخیالات سے رجوع کرلیا جائے، یا انھیں اس انداز سے پیش کیا جائے، جس سے دونوں فریق خوش اور مطمئن رہیں۔ اسی نوعیت کا معاملہ نبی ﷺ اور صدر جمہوریہ مکہ ابوسفیان کے درمیان پیش آیا تھا۔ ابوسفیان نے نبی ﷺ کی روحانی وعالمی قیادت، بتوں کی ہجو، نماز اور زکوٰۃ کی ادائی منظور کرلی تھی، اور نبی ﷺ نے یہ منظور کرلیا تھا کہ مکہ کی روحانی اور دینی مرکزیت برقرار رہے گی، مکہ کے اعیان وعمائد کو نئی روحانی جمہوریت میں انتظام وانصرام کا حق ملے گا، اور ان کو ان کے حسب مقتضی زندگی گزارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، اس معاہدہ میں غریبوں اور کمزوروں کا تیسرا گروپ سب سے زیادہ خسارے میں رہا، حالانکہ اسی طبقہ کی خاطر جنگیں ہوئیں، اور اسی کی حالت درست کرنے اور بہتر بنانے کے لیے دعوت نبوی کا ظہور ہوا تھا، لیکن ابتدا میں ان لوگوں کو صرف کچھ صدقات وزکوٰۃ دے کر خوش کر دیا گیا۔ اور نبی ﷺ اور ان کے خلفاء کے دور کے بعد اس طبقہ کو قصداً یا بلاقصد وارادہ فراموش کر دیا گیا، چنانچہ یہ جیسا تھا ویسا ہی رہا، بلکہ پہلے سے بھی زبوں تر ہوگیا۔

یہی مستشرق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بلاشبہ نبی ﷺ نے اپنے اقوال وافعال کے ذریعہ مکہ ومدینہ میں معاشرے کے شر کے اسباب اور اس کے جراثیم کو ختم کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی، جس طرح کی کوشش آج کل کمیونسٹ کر رہے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ چاہتے تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار واختیار ہونے کے بعد اجتماعی امراض کے جراثیم ختم کر دیتے، اور وہ غریبوں اور کمزوروں اور غلاموں کے استحصال کو روک دیتے، اس حیثیت سے نبی ﷺ اپنے پیشتر کے دوسرے انبیاء ہی کی طرح تھے، ان سب نے ادبی وسائل کے استعمال کو فوقیت دی اور اس طریقہ کو نہیں اپنا جس کو یورپ کے مصلحین اور سیاست دانوں، مثلاً لینن اور مسولینی نے اختیار کیا، اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد ﷺ نے عرب کے معاشرتی واجتماعی امراض کی تشخیص تو کی، لیکن انھوں نے نہ علاج کیا اور نہ ان کے جراثیم کا استیصال کیا۔

# مستشرقین کے اعتراضات کی نشر و اشاعت کس طرح ہوتی ہے اور ان کی نوعیت، اغراض اور خاص محور

مترجم: ضیاء الدین اصلاحی

''گویا یہ مضمون الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب ''الرسول ﷺ فی کتاب مستشرقین'' کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے، مگر اس میں بعض مفید اور اہم باتیں آگئی ہیں، اس لیے مستشرقین اور اسلام کے سلسلہ میں اس کی اشاعت بھی مناسب معلوم ہوئی''

مستشرقین نے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اپنے اعتراضات میں ملمع کاری کر کے انھیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا ہے، اور دنیائے اسلام کے افکار و عقائد اور نظام تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہونے کے لیے عربی زبان میں ان کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ جو اسلامی مکتبوں (بک ڈپو میں) فروخت ہو رہے ہیں۔ بعض ممتاز اہل عرب اور مسلمان بھی ان کے خوشہ چیں ہیں، اور وہ ان سے استفادہ کے لیے مغربی ملکوں کا سفر کرتے ہیں، اور انھیں بھی اسلامی ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں، اس قسم کے لوگ دراصل اسلامی افکار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں مستشرقین کے شریک و معاون ہوتے ہیں۔

دنیا کے موجودہ اقتصادی پالیسی اور حکومتوں کا وفاق بھی مستشرقین کے شکوک و شبہات کے لیے کثیر رقم چڑھا رہا ہے، چنانچہ ان کے افکار نظریات کی اشاعت کے لیے کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے، اور ان کے خیالات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں، اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کے طعن و تشنیع اور افترا پردازی سے اسلام، اسلامی تہذیب اور بالخصوص آنحضرت ﷺ کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔ وہ مکمل تیاری اور منظم منصوبے کے بعد جب اسلام کے

خلاف بہتان تراشی کر کے شبہات وارد کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے عیسائی مبلغین اور استعمار پسند طاقتیں ان کو دنیا بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کی اسکیمیں تیار کرتی ہیں اور کانفرنس منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کو ہدف طعن بنانے والے بعض مستشرقین سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں مادی استعمار کی تعمیر واستحکام اور اسلامی افکار کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ عربوں اور مسلمانوں میں سے اپنے ان معاونین کا انتخاب کرتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں، اور جو ان کے مادی وفکری موقف کو درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ صورت حال انڈونیشیاء میں ہالینڈ کے غلبہ، عربی ملکوں میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار اور خصوصاً مصر پر نپولین اور الجزائر ومغرب پر فرانس کے حملہ کے زمانہ میں پیش آچکی ہے، مستشرقین کے اعتراضات والزامات کے نشوونما پانے اور ان کے نشرواشاعت کے خاص اسباب وذرائع یہ ہیں۔

## (الف) گرجا اور عیسائی مشنریاں

مونسیور کولی نے ''دین حق کی بحث وتحقیق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی تصویر بالکل مسخ کر کے پیش کی گئی ہے۔ مصنف نے عصبیت اور صریح جانبداری سے کام لے کر اسباب بیان کیے بغیر جارحانہ اور تحکمانہ انداز میں اعتراضات عائد کیے ہیں وہ لکھتا ہے، ''محمد ﷺ نے اخلاق وشرافت کو خیر باد کہہ کر اپنے پیروؤں کے ہاتھ میں تلوار رکھی، بدکاری اور لوٹ مار کی ان کو کھلی چھوٹ دی اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کو اس کی بشارت سنائی کہ انھیں دائمی لذت وراحت نصیب ہوگی۔'' ایسی صریح کذب بیانی اور یاوہ گوئی کے بعد مستشرقین صحیح دینی وتاریخی حقائق سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

اڈیسون نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف دو بہتان تراشے ہیں۔ اول یہ کہ آپ انجیل سے واقف تھے، اور اسی سے اخذ واستفادہ کرتے تھے، دوم یہ کہ آپ ﷺ کی انجیل سے واقفیت ناقص تھی، اور آپ نصرانیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، مگر اسی ناواقفیت اور نصرانیت کی بگڑی ہوئی صورت پر آپ ﷺ نے اپنے اس دین کی بنیاد رکھی جسے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ عیسائی

مبلغین نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے غلط اور بے جا الزامات مستشرقین کے ذہنوں میں نقش کر دیے ہیں، جس کے نتیجہ میں انھوں نے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام پر ایسے رکیک اور ناروا اعتراضات کیے ہیں جن سے ان کی سیرت اور شخصیت بالکل مسخ ہوگئی ہے۔

عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم، وسیع اور گوناگوں ہیں۔ وہ مشرق میں ان کی اشاعت کے لیے مبلغین بھیجتی ہیں۔ امریکہ نے اس میدان میں سبقت کی اور بیروت، قاہرہ، استنبول اور دمشق وغیرہ میں اپنے قدم جمائے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، اور اسی انداز پر اب تک مغربی افکار واعمال کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہالمٹن گب اور چار مستشرقین کے مباحثہ میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اسلام کا نظریہ'' میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(ب) مادی استعمار

مستشرقین کی فکری واعتقادی کاوشوں پر استعمار پسند پورا اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں، اور ان میں مزید ایسے شکوک واعتراضات کا اضافہ کرتے ہیں جن کا اسلام اور ذات نبوی ﷺ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کو اطمینان ہے کہ مسیحیت مشرق میں مغربی استعمار کی بنیاد ہوگی۔ اس بنا پر وہ مشنریوں کو ہموار اور وسیع کرنے کے لیے ان کی ہر ممکن امداد واعانت کرتے ہیں، ان کے لیے مال واسباب مہیا کرتے ہیں، اور انھیں اقتدار واختیار بھی عطا کرتے ہیں۔ دراصل شروع میں مستشرقین عیسائی مبلغین اور راہبوں کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں۔ پھر وہ استعماریت سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ کے اعتبار سے مستشرقین کی تگ ودو کا مقصد بھی فکری استعمار ہے۔ وہ اسے مستحکم کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ (۱) اسلام کی تاریخی اور عظیم الشان شخصیتوں کو مجروح اور کمتر قرار دیتے ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہے، اور (۲) اس کے مقابلہ میں استعمار پسندوں کی شخصیتوں کو اہم اور برگزیدہ ثابت کرتے ہیں، اس لیے استعماریت کے دور میں عالم عرب اور دنیائے اسلام کو استعمار پسندوں کے حالات اور کارناموں سے جس قدر واقفیت ہوئی اس قدر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی، سیرت اور کارناموں سے نہیں ہوئی۔ جو لوگ استعمار پسندی کے اس دور کو دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستشرقین اپنے

ان دونوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے یا تو کلیسا کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں یا پھر استعمار اور توسیع پسندوں کے اشتراک سے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، ان کو حق کی تلاش و جستجو سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ شبہات وارد کرنے اور پروپیگنڈا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور عیسائی مشنریوں اور مشرق میں ان کے نمائندہ مبلغین کے لیے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے علوم و افکار، عقائد، اشخاص اور زبان و تہذیب کی اچھی طرح مذمت اور تنقیص کی جا سکے۔

## (ج) تجارتی کمپنیاں

استعمار پسندوں نے عربوں اور مسلمانوں کے بیش قیمت علمی سرمایہ میں سے بہت کچھ چیزیں سرقہ کی ہیں۔ اس پر تجارتی اداروں اور کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ اہل عرب کو اپنے علوم و آداب کی قدر قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لیے انھیں نہایت سستے اور معمولی داموں پر ان سے حاصل کر کے مستشرقین کی تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کیا گیا، اور اشاعت کے لیے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو غیر اہم اور فکری حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھیں، تاکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ معمولی چیزوں کی طرف مرکوز ہو کر مڑ جائے۔ پھر ان اداروں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی کتابوں کی تجارت اپنے لیے مخصوص کر لی جس کا منافع مستشرقین پر خرچ کیا جاتا تھا تاکہ وہ ترتیب و تحشیہ اور طباعت کا کام پوری دلچسپی اور سرگرمی سے انجام دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر دو طرح کے اغراض تھے۔ (۱) اسلام کو مغربی اور اسلامی دنیا میں مسخ کر کے پیش کرنا اور اس کی شخصیتوں کو مجروح اور داغدار بنانا۔ اپنی اس ناپاک مہم کو فروغ دینے کے لیے وہ مستشرقین کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات والزامات کی کرید کرنے پر آمادہ کرتی تھیں (۲) اسلامی علوم کی کتابوں کا حق طباعت اپنے لیے مخصوص کر کے ناجائز کمائی کرنا۔

## (د) معاشی و شخصی

مستشرقین کو تقویت اس طرح بھی ملی کہ بعض لوگوں کے لیے رزق کے دوسرے وسائل وذرائع مسدود ہو گئے تو انھوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کیا، کچھ ایسے لوگ بھی ان کے ہم نوا ہوئے جنھوں نے محسوس کیا کہ ان کی فکری و عملی صلاحیت دوسرے فضلا اور ماہرین علوم کے برابر نہیں

ہے۔ اسی طرح بعض حضرات مسیحی سوسائٹی میں اپنی براہ راست ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے لیے بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے، غرض ان لوگوں کا مقصد اپنی کوتاہی اور فکری عجز ونقص پر پردہ ڈالنا، اور حصول معاش تھا، کیونکہ رزق ومعیشت کے دوسرے وسائل وذرائع کے مقابلہ میں یہ زیادہ آسان صورت تھی اور اس میں کم تگ ودو بھی کرنی پڑتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جذبہ بھی ان بے شمار الزامات کا سرچشمہ ہے، جو اسلام پر عموماً اور رسول اللہ ﷺ پر خصوصاً عائد کیے گئے ہیں۔ اوپر بیان کیے گئے اسباب کی جن اسلامی تصنیفات میں نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

المستشرقون، المستشرقون والدراسات الاسلامیہ، التبشیر والاستعمار، دفاع عن الاسلام، یہ تمام کتابیں ان کی کتابوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں۔ جو مستشرقین کے شکوک وشبہات اور آراء وافکار پر مشتمل ہیں۔ جیسے وجہتہ الاسلام اور الغارۃ علی العالم الاسلامی، محبّ الدین خطیب نے اخبار المؤید میں ان کا ترجمہ کیا تھا، ان سے عیسائی مشنریوں اور استعمار پسندوں کے منصوبوں اور عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

رہی برتوکولات صہیون (یہودی یادداشت) تو یہ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی مگر اس کی شہرت گزشتہ صدی کے آخر میں ہوئی۔ محمد خلیفہ تونسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس سے اخلاق وانسانیت کو رسوا وبرباد کرنے، آسمانی عقائد کو ضعف واضمحلال سے ہم کنار کرنے اور نفرت وحسد کی آگ بھڑکانے میں یہودیوں کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے، اور دنیا پر غلبہ وتسلط حاصل کرنے کے ان کے ناپاک عزائم اور ارادے بھی معلوم ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف الزام اور شبہات عائد کرنے اور بغض وعداوت پھیلانے میں یہودی مستشرقین کی ریشہ دوانیاں زیادہ خطرناک ہیں، وہ اپنے مذہبی احکام کے مجموعہ تالمود کو خدا کی وحی سے بھی زیادہ مقدس اور برتر مانتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو تورات سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ دوسرے یہودی مستشرقین بھی اس قسم کی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ قرآن واحادیث نبوی ﷺ کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلام عقائد واحکام کا استخفاف کرتے ہیں۔

## (ھ) علمی و تہذیبی

بعض ذاتی و طبعی اسباب و ذرائع سے بھی مستشرقین کے خیالات کی نشر و اشاعت ہوئی، کیونکہ کچھ فارغ البال لوگ اس لیے مشرقی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کو سیر و سیاحت سے طبعی دلچسپی ہوتی ہے، اور وہ دنیا کی قدیم تاریخ و تہذیب سے واقف ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔

## اعتدال پسند گروہ کی مفید خدمات

یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اعتدال پسند مستشرقین کے ایک گروہ نے سیرت نبوی ﷺ کے قدیم و اولین ماخذ کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں ابن ہشام کی سیرت، واقدی کی کتاب المغازی، ابن اثیر کی الکامل اور طبری کی تاریخ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مستشرقین نے ان پر حواشی تعلیقات لکھ کر اور ان کی متعدد فہرستیں مرتب کر کے دوسروں کو مزید کاوش سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے اکثر کتابوں کے ملکی زبانوں میں ترجمے بھی کر دیے ہیں۔ تاکہ بحث و تحقیق کرنے والوں کو ان سے مدد مل سکتے اور وہ ان کی جانب رجوع کر سکیں۔

بہر حال اس گروہ نے تاریخی سرمایہ اور خاص طور پر سیرت نبوی ﷺ سے متعلق کتابوں کی نشر و اشاعت میں سعی بلیغ کی ہے، اور محنت و دیدہ ریزی کے علاوہ اپنا خطیر سرمایہ بھی لگا دیا ہے، کئی کئی افراد مل کر ایک کتاب کو متعدد جلدوں میں مرتب کرتے ہیں، اکثر محققین علمائے اسلام ان کی ان کاوشوں کے مداح اور شکر گزار ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر نجار نے مذاہب التفسیر الاسلامی اور شیخ احمد شاکر نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدموں میں اس کا اعتراف کیا ہے، اور محمد کرد علی نے بھی ان کی کوششوں کے نتائج کو سراہا ہے۔

اس جماعت کی کاوشوں سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ جب سیرت نبوی ﷺ کے اولین ماخذ مکمل صورت میں چھپے اور ان کے محققانہ نسخے دوسرے مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچے تو سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ و تحقیق اچھے اور بہتر انداز میں کیا جائے گا اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آئے۔

یہ گروہ ایسا ہے جو بحث و مطالعہ کا صحیح رخ متعین کر کے اصل تاریخی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن عام اور بڑی جماعت کی عصبیت و جانبداری کا وہی حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، اور

اس کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مستشرقین کے اعتراضات والزامات استعمار پسندوں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کے مضبوط باہمی تعاون کے نتیجہ میں وجود میں آئے اور پروان چڑھے ہیں، ان کا مشترکہ پروگرام اور مقصد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور خاص کر آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس اور سیرت مبارکہ کو مغربی افکار کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔

## ۲۔شکوک والزامات کی نوعیت

گو مستشرقین کے تمام شبہات واعتراضات کی نوعیت متعین اور ایک ہے۔ تاہم آسانی کے لیے انھیں حسب ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

### فکری

انھیں مندرجہ ذیل وجوہ سے فکری کہا جاسکتا ہے۔

(الف) یہ انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں، اور ان کی بنیاد ذہنی وسائل پر ہے۔

(ب) ان میں انسانی نفسیات کے خواص کی بحث و کرید اور ان کے طول وعرض کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان پر عائد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کیا جائے۔

(ج) یہ اسلامی فکر کو متزلزل کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی اس سیرت وشخصیت کو مسخ کرتے اور بگاڑتے ہیں۔ جو منصب نبوت پر فائز اور قیادت وسیادت کے لحاظ سے بہترین نمونہ تھی۔

(د) رسول اللہ ﷺ کے بارے میں عربی وغیر عربی افکار میں تردد اور شکوک پیدا کرتے اور ان کی جانب سے لوگوں کی تنفر اور بے زار کرتے ہیں۔

(ہ) ایک طرف حق کی تائید وحمایت کرنے والے جذبات وافکار کو مضمحل اور پست کرتے ہیں، اور دوسرے جانب ناپاک اور خودغرضی پر مبنی افکار کے ذریعہ شبہات کے دائرہ کو وسعت وقوت بخشتے ہیں۔

(و) اس اعتبار سے بھی ان کو فکری کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اصل اور تمام بنیاد فکر پر ہے، اور اس فکر اور ذہنی مفہوم کی رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت وجہاد کے ذریعہ آب یاری کی ہے، اس بنا پر آپؐ کی ذات، شخصیت، سیرت اور سنت کے بارے میں جو بھی طعن وتشنیع کیا جائے گا۔ وہ اسلامی

فکر ہی کے بارے میں سمجھا جائے گا۔

دینی

یہ شبہات ان حیثیتوں سے دینی دائرہ میں آتے ہیں۔

(الف) ان کا خاص تعلق احادیث نبوی ﷺ سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل، تقریر وارشاد کا مجموعہ اور اسلام کا دوسرا اہم ماخذ ومصدر ہے۔

(ب) احادیث کے بارے میں یہ وہم اور غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بیان کیے گئے آنحضرت ﷺ کے افکار واعمال آسمانی کتابوں یا انسانی سرچشموں سے ماخوذ ومستنبط ہیں۔

(ج) رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی ایسی غلط اور مادی تفسیر وتعبیر کرتے ہیں۔ جس سے شجاعت، ذہانت، عبقریت اور آزادی فکر کو اس کی جانب منسوب کیا جا سکے مگر وہ وہبی وربانی کمالات سے تمام تر عاری ہو۔

(د) کبھی اسلام میں تضاد اور کبھی اس میں تطبیق دے کر لوگوں کے دلوں میں شک وتذبذب پیدا کرتے اور رسالت پر عقیدہ وایمان کو متزلزل کرتے ہیں، جب کہ اسلام کا جیتا اور جاگتا نمونہ خود نبی اکرم ﷺ ہی کی زندگی اور ذات ہے۔

(ہ) وحی ونبوت پر مستشرقین کے طعن وتشنیع کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ رسول کے اوصاف وکمالات میں سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے۔ اگر اسی کو مشکوک اور مشتبہ کر دیا جائے تو دوسرے تمام اوصاف وکمالات خود بخود بے حقیقت ہو جائیں گے۔

(و) اعتراضات کا تعلق دین کے سب سے مہتم بالشان مسائل سے ہے کیونکہ یہ آپ کے عقیدہ وفکر یا طرز زندگی اور جہاد وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں شبہ واقع ہونے کے بعد خود مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

تاریخی

ان اعتراضات کی نوعیت تاریخی بھی ہے کیونکہ

(الف) یہ ان تاریخی واقعات سے پیوستہ ہیں جن کا تعلق اسلام سے قبل وبعد رسول اللہ ﷺ

کی زندگی سے ہے بلکہ تاریخ کی ابتدا و انتہا سے بھی۔

(ب) یہ تاریخ کو اس کے اصلی موضوع سے ہٹا دیتے ہیں اور ان سے تاریخ کے علمی و واقعاتی کے بجائے ذاتی رجحان و مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

(ج) یہ الزامات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے ارد گرد گردش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔

(د) ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی افترپردازی اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے، اس بنا پر حقائق و غیر حقائق، تحلیل و اعتراض اور تاریخ و افسانہ میں حد فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

(ہ) تاریخ کا مقصد اللہ کی جانب انسانیت کی رہنمائی ہے، جیسا کہ آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی مشہور کتاب ''نظریہ تاریخ'' میں لکھا ہے، اس لیے اگر رسول اللہ ﷺ ہی کی تاریخ مطعون کر دی جائے، تو رہنمائی کی کون سے راہ باز ہو سکتی ہے؟

(و) ول ڈیورنٹ نے ''تمدن کی کہانی'' میں لکھا ہے کہ ''تاریخ انسانی تمدن کے کمال و زوال اور جائزہ مطالعہ کا نام ہے۔'' اس بنا پر اگر اسلامی تمدن ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گیا، اور اسے دفن کر دیا گیا تو تمدن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تحقیر ہو گی۔

مستشرقین کے اعتراض والزام کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ:

(الف) مسلمانوں کی اعتقادی، فکری اور اخلاقی زندگی کو ڈھالنے اور اکھاڑنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ یہ ایسے بہادروں اور لیڈروں کی زندگی کو محبوب بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے جن کے اصول وضوابط اور طور وطریق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) یہ موجودہ دنیائے اسلام کا اس کے ماضی سے فکری، شعوری اور تاریخی رشتہ کاٹ کر اسے بہت حقیر گھٹیا بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ جدید اسلامی فکر اس اسلامی فکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کی بنیاد قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات نے رکھی ہے۔

(ج) یہ انسانی زندگی کے اس روحانی پہلو کو مسمار کر دیتا ہے، جس کا سب سے اعلیٰ اور مکمل

نمونہ مسلمانوں کے رہنما اور پیغمبر کی زندگی میں تھا، اور اسے تاریخ کے خوبصورت فریم اور چوکھٹے میں منجمد کر دیتا ہے۔

(د) وہ جہاد اور احکام اسلام کو ناقابل عمل اور مشکل بتاتا ہے، اس بنا پر فکری وعملی زندگی کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

(ہ) وہ ایسے رہنماؤں اور قائدوں کو نمایاں اور ممتاز قرار دیتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے قائدانہ اوصاف اختیار کرنے کے بجائے فکری، اعتقادی اور اجتماعی حیثیت سے مغربی قائدین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

(و) انور جندی نے ان گوناگوں خطرناک شبہات کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ مغرب کا سب سے خطرناک ارادہ اور منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا دل ودماغ توحید، اخلاق، روحانیت اور ایمان سے عاری ہو کر اس تیز وتند ہوا کے سامنے آ جائے جو تعلیم، صحافت، ادب، فلم اور لباس وغیرہ کے راستہ سے زہر بکھیر رہی ہے۔ ان چیزوں کے مسموم اثرات سے ایسی نسل تیار ہو رہی ہے، جو تخریب اور بربادی کی طرف اس کو ترقی وتمدن کا نام دے کر چلی جا رہی ہے، اور اسلامی تاریخ وتہذیب اور اس کے اصول ومبادی کو مسخ کر کے مستشرقین ومبلغین کی پیروی کر رہی ہے، اور ان ہی کی طرح اس دور کو حقیر اور کمتر خیال کر رہی ہے، جو تاریخ عالم کی نمایاں اور مفید خدمت انجام دے چکا ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس کے ناقص اور فروتر ہونے کا احساس وشعور پیدا کر رہی ہے۔

## ۳۔ اسلام پر الزام تراشی کے اغراض ومقاصد

عیسائی مشنریاں اور استعمار پسند کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز اور حاوی ہونے کے درپے ہیں۔ اس کے لیے وہ کانفرنس اور اجتماعی، ادبی اور طبی اجلاس کرتے ہیں لیکن مستشرقین کے اغراض ومقاصد علم ومعرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی غرض وغایت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا نشانہ اسلام کے تمام احکام ومسائل اور اس کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہے۔ اس کے خلاف طعن وتشنیع اور افترا پردازی

کے پیچھے جو جذبات و مقاصد کارفرما ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

## ۱۔ نصرانی قبائل اور اس کے درمیان حائل ہونا

اسلام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن پر پردہ ڈالنے سے ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں نظام حیات بننے کی صلاحیت نہیں، صلیبی جنگوں کے بعد ہی سے یہ بات دہرائی جا رہی ہے، قرآن مجید کے ترجمے بھی یہ ثابت کرنے اور اس کے اندر نقص نکالنے کے لیے کیے گئے ہیں۔ اہل یورپ کے اندر عثمانیوں کے یورپ پر چھا جانے کے بعد اس کے خلاف کراہیت، نفرت اور ذہنی جنگ کی مستقل فضا پیدا کردی گئی ہے، اور اسلام کے نافذ العمل ہونے کے بارے میں انھیں شکوک وشبہات میں ڈال دیا گیا ہے۔

## ۲۔ مسلم ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش

دوسری غرض یہ تھی کہ جہاد کی تاویل وتوجیہ کرکے مسلمانوں کو اس کی جانب سے غافل کردیا جائے اور انھیں عافیت وآرام پسندی کا درس دیا جائے تاکہ اسلام کی قوت مقابلہ پاش پاش ہوجائے، اور جنگ وجہاد کی خوگر قوم کو عبادت وریاضت میں مشغول کرکے یہ باور کرایا جائے کہ جہاد اکبر یہی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کردیا گیا، اور اسلامی سلطنتوں کے حصے بخرے کردیے گئے، مسلمانوں کی سوسائٹی سے معاشرت وسیاست کے اسلامی قوانین معطل کردیے گئے اور مغرب کا مکمل تسلط قائم کرنے کے لیے اسلام کے قانونی، سیاسی اور تربیتی نظام میں خلل ڈال دیا گیا۔

## ۳۔ مسلمانوں کو ان کی اصل بنیادوں اور سرچشموں سے دور کردینا

اسلام کے اصول تبدیل کرکے مسلمانوں کو ان کے سرچشموں سے دور کرکے اور ان کی انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور عقلی خصوصیات ختم کرکے انھیں استعماری فکر وتہذیب کے سامنے سرنگوں کردیا گیا۔ اس طرح مسیحی تبلیغ ودعوت کو ان کے عقائد ونفوس میں پیوست کرنے کا دروازہ کھل گیا، اور بہت سے کمزور عقیدہ کے لوگ الحاد میں مبتلا ہوگئے۔

## ۴۔ دنیائے اسلام کو کمزور اور پسماندہ بنانے کی اسکیم

مستشرقین عالم عرب اور دنیائے اسلام کو پس ماندگی اور بدحالی سے ہم کنار کرکے اس پر

اظہار ہمدردی کرتے ہیں، اور پھر مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی پس ماندگی کا سبب اسلام کی پیروی اور محمد ﷺ کی اقتدا ہے، اس مقصد کے لیے انھوں نے اسلام، اسلامی اصول وقوانین، اس کے تصور عبادت، نظام اور تاریخ کے بارے میں بے شمار شبہات والزامات گڑھے ہیں۔ استعمار پسندوں کا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا ہے، کہ عربوں اور مسلمانوں کے تنزل وانحطاط کی وجہ اسلام ہے، علم وتاریخ کی میزان اور کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اس کا کھوٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے، اس لیے صحیح تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر عربوں اور مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے، اگر اسلام کے درست نظریے اور بنیادی اصول کو وہ اختیار کیے ہوتے تو اس مشکل میں نہ پھنستے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے، اور دوسری طرف اکثر اہل مغرب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور فکری ومادی قوت کے دوبارہ عود کرنے سے خائف اور لرزہ براندام ہیں، انھیں اندیشہ ہے کہ اسلام اور اس کے امتیازی اصول وتشخصات مغربی دنیا کا استیصال کردیں گے، اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ معمورۂ ارضی کے دور دراز گوشوں تک وسیع ہو جائے گا۔ لارنس براؤن کہتے ہیں۔ ''مغربی استعمار کے لیے اصلی خطرہ اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء میں پوشیدہ ہے، کیونکہ اس کے اندر چھا جانے اور سب کو سرنگوں کر دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ انور جندی لکھتے ہیں۔'' یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصول ومناہج کو مضبوطی سے اختیار کرلیں، اپنی قدر وقیمت کو پہچان لیں، اور اپنے امتیاز وتشخص کو برقرار رکھیں تو ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، ہمارا وجود استعماری اور نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد بھی صرف عمدہ فریم میں بند رہا، اور موثر اور موزوں نہ بن سکا۔

### ۵۔ سنت نبوی ﷺ کو عضو معطل کردینا

مستشرقین کی یہ کوشش بھی ہے، اور وہ اسے لوگوں کی نظر میں صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اعمال وتوجیہات اور آپ کے قیادت ورہنمائی دور جاہلیت کی برائیوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لیے تو موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن اب یہ مرحلہ ختم ہو چکا ہے، دور حاضر کی اخلاقی واجتماعی قیادت اور اعتقادی اصلاح کے لیے اسلام کو گھسیٹنا درست نہیں، کیونکہ دونوں زمانے میں بڑا فرق ہے، وہ احادیث کے خلاف افترا پردازی کر کے مسلمانوں اور عربوں کو بھی

ان کی جانب سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ جونبل احادیث کو ہدف بنا کر ان کے تناقض کے متعلق لکھتا ہے۔ ''زمانہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مرویات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنی تائید کے لیے احادیث گڑھتا رہا...... اس طرح ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی رائے کو کسی نہ کسی حدیث کے موافق ثابت کر دے، یہی وجہ ہے کہ موضوع ومتناقض حدیثوں کی کثرت ہے اور آنحضرت ﷺ کی ایک ہی سنت کے بارے میں سخت متضاد حدیثیں پائی جاتی ہیں۔''

احمد شاکر مرحوم نے اس اعتراض کا بہت طویل جواب دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وضاعین وکذابین کی وضع وافترا سے انکار نہیں...... یہ بھی تسلیم ہے کہ سچے راویوں کی بعض حدیثوں میں غلطیاں موجود ہیں۔ خود علمائے فن اور محدثین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے احادیث کی جو یہ تصویر پیش کی ہے کہ حلال وحرام اور طہارت ونظافت کے تمام مسائل ہی موضوع حدیثوں پر مبنی ہیں۔ اس سے تو اس کا سارا ذخیرہ ہی باطل اور مردود قرار پاتا ہے، اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ کچھ فرمایا اور نہ کچھ کہا۔''

احادیث پر ان کی بہتان تراشی کے نمونے یہ بھی ہیں کہ بعض حدیثیں انجیل کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے آباؤ اجداد کے طور طریقے بدل کر کچھ نئے طریقے جاری کر دیے، اس طرح انھوں نے آپ کی نبوت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے آپ کے ان اقوال کو بہت نمایاں کیا ہے۔ جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تاکہ انھیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں، لیکن ہمارے علمائے محققین نے مدلل طور پر ان افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے، اور علمی انداز میں مستشرقین کے باطل خیالات کی تردید کی ہے۔

## ۶۔ شبہات واعتراضات کا محور ومرکز

مستشرقین کے سارے الزام کا محور دو ہے۔ (۱) محمد ﷺ نبی اور رسول نہیں تھے۔ بلکہ محض ایک انسان تھے۔ (۲) اسلام انسانی نتیجہ فکر اور ذہنی اختراع ہے، وحی الٰہی نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب مستشرقین برابر اور یکساں ہیں۔ خواہ وہ آپ ﷺ کو ایک اجتماعی مصلح،

منفرد عبقری، بے مثال بہادر اور انسانیت کا قائد و رہنما سمجھتے ہوں یا آپ کو گھناؤنی عادتوں مکرو فریب، پرخوری، ہوس رانی، شہوت، بزدلی، سنگ دلی، سفاکی اور خوں ریزی سے متہم کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ آپ ﷺ گزشتہ آسمانی کتابوں کی پیروی کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو ایجابی یا سلبی نظر سے دیکھنے والے مستشرقین بھی برابر ہیں، نیز جو آپ کی شخصیت کو اعتدال وانصاف کی میزان میں تولتے ہیں، اور جو بھونڈی اور مذموم اغراض کی میزان میں تولتے ہیں سب ہی برابر ہیں۔ کیونکہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ جزیرہ عرب کے ایک فرد تھے اور جس طرح دوسرے اور آخری گروہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کی طرح آپ پر ایمان لائے گا۔ آپ کو نبی رسول تسلیم کرے گا، اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا۔ اس طرح پہلے گروہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ مستشرقین کی ایک تیسری جماعت بھی ہے، جس کی حق گوئی، اعتراف حقیقت اور انصاف پسندی نے اسے اسلام قبول کرنے اور اسے قولاً وعملاً اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر تمام فکری دائروں میں اسلام اور نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دینے لگے۔

مستشرقین کے بعض اعتراضات کے شروع میں نبوت کے دفاع کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے نام اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے اور بعد کی زندگی کو زیر بحث لاکر اسی پہلے محور کے گرد پہنچ جاتے ہیں۔ ابتدا میں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو تسلیم کرلیں گے اور آپ ﷺ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بحث کرکے اس کی گوناگوں خوبیاں اور کمالات واضح کریں گے، مگر اس کے بعد بھی وہ اس امر کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر بھی اسی طرح وحی نازل ہوئی تھی۔ جس طرح گزشتہ انبیاء حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر اتری تھی۔ جن کی نبوت کے یہ لوگ بھی قائل ہیں، بے شک اسی کا نام عصبیت اور جانبداری ہے۔

ان کا دوسرا محور یہ ہے کہ اسلام کسی مصلح یا عبقری شخص کے ذہن کی پیداوار ہے، حالانکہ نامور مستشرقین اور قانون کے ماہرین شناخت وغیرہ کو اعتراف ہے کہ قانونی حیثیت سے اسلام کو رومن

لاء پر فوقیت حاصل ہے، اور وہ اکثر جدید قوانین سے بھی افضل و برتر ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ توحید واقعیت وحقیقت کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے آسمانی عقیدہ وتصور سے ممتاز ہے۔ اسلامی عبادت کے بعض اعمال گو بعض لوگوں کی نظر میں جاہلیت کی یادگار ہیں، اور وہ انھیں قدیم مشرقی مذاہب سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ ان کا خاص مقصد انفرادی واجتماعی اصلاح ہے۔ رہے اخلاقی معاملات تو بعض لوگ انھی کو اصل اور تمام اسلام قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے اندر انسانیت کی بنیادی قدر و قیمت کی ضمانت ہے۔ جیسے آزادی، عظمت وکرامت احساس ذمہ داری اور زندگی کی مخالفت وغیرہ۔ ان حیثیتوں سے اسلام دوسرے مذاہب میں منفرد ہے۔ اسی طرح اسلام کے اقتصادی، سیاسی، خاندانی، اور اجتماعی نظام، قانون قضا اور نظم مملکت سے بھی اس کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے، اور اسلام اپنے اسی تمدن وشائستگی کی وجہ سے گزشتہ زمانہ میں زمین پر حکمرانی کرتا رہا ہے اور اب بھی اس میں زندگی اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی ایسی قدریں ہیں، جن کی بدولت وہ از سرنو زمین پر حکومت وفرماں روائی کرے گا۔

یہی وہ محور ومرکز ہیں۔ جہاں سے پھر الزامات کا رخ سیرت نبوی ﷺ کی جانب ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہم مستشرقین کے ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ جو اسلام کے اوصاف ومحامد بیان کرتے ہیں یا اس کے معائب ومثالب کی کرید کرتے ہیں اور اس پر نکما، آزادی اور کھل چھوٹ دینے، غلامی بیل ڈالنے، عورتوں کے حقوق غصب کرنے، رحم وشفقت سے عاری ہونے اور اسی نوعیت کے بہت سارے اسلام کے اصول وقوانین سے میل ومطابقت نہ رکھنے والے الزامات عائد کرتے ہیں۔

اب ہم ان کے سیرت نبوی ﷺ پر بعض اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

## آپ پر بحیثیت آدمی کے اعتراضات

مستشرقین کی جانب سے آنحضرت ﷺ پر مختلف نوعیت کی تہمتیں لگائی گئی ہیں، سب سے پہلے آدمی کی حیثیت سے آپ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

## (الف) پُرخوری کا الزام

لامانس کہتا ہے: ''آپ بڑے پرخور تھے، آپ کا جسم لذیذ اور مرغوب کھانوں کی وجہ سے بھاری اور موٹا ہو گیا تھا۔'' مگر کھانے کے بارے میں آپ کے جو عام اور مشہور آداب بیان کیے گئے ہیں، اور جو مؤرخین کے نزدیک بھی ثابت وتسلیم شدہ ہیں۔ یہ قول ان کے بالکل برعکس ہے۔ آپ ﷺ کی حالت تو یہ تھی کہ اس دنیا میں رخصت ہو گئے مگر کبھی جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، پانی اور روٹی ہی اکثر آپ ﷺ کی غذا ہوتی تھی، انھیں آپ اسودین [1] کہتے تھے، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں کھانے میں آپ ﷺ کی معمول اور عادت مبارکہ یہی تھی، کہ موجود کو مسترد نہ کرتے اور غیر موجود کے لیے زحمت نہ دیتے، جو میسر ہوتا اسے تناول فرماتے، ورنہ صبر کرتے، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے، مہینوں گزر جاتے اور آپ ﷺ کے گھر میں آگ بھی نہ جلتی، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ نے مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے، اور اسے حسن بتایا ہے، اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے لیے پیٹ بھرنے سے زیادہ خراب کوئی اور برتن بھرنا نہیں ہے، اس کے لیے چند لقمے کافی ہیں۔ جو اس کی پیٹھ کو سیدھی رکھیں، اگر کوئی شخص اپنے نفس سے مغلوب ہو جائے تو ایک تہائی پیٹ میں کھانا کھائے، ایک تہائی میں پانی پیے اور ایک تہائی پیٹ خالی رہنے دے، امام بخاری کی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جن کے سامنے بھونی بکری تھی، لوگوں نے ان سے کھانے کی فرمائش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا، اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور کبھی انھوں نے شکم سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی، وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد آل محمد ﷺ نے کبھی مسلسل تین رات گیہوں نہیں کھایا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

اس سے قطع نظر معترض نے رسول اللہ ﷺ کے ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ آپ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھتے تھے اور پیر اور جمعرات کو تو

---

[1] اسودین سے پانی اور کھجور مراد ہے۔

عموماً روزے سے ہوتے تھے، کبھی کبھی روزے رکھنے پر آتے تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ آپ افطار نہ کریں گے، اسی طرح رمضان میں صوم وصال کا اہتمام فرماتے تھے، یعنی دو یا کئی کئی دنوں تک مسلسل روزے رکھتے اور شب میں بھی کھانا پینا ترک کر دیتے تا کہ رات ودن کے بیشتر اوقات عبادت میں گزاریں، مگر صحابہ کرام کو اس سے منع کرتے، انھوں نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میرا خداوند مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو علوم ومعارف کی غذا عطا کی جاتی ہے، اور آپ ﷺ کے دل پر مناجات کی لذتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی تخریج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہینہ کے بعض حصوں میں افطار سے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ آپ روزہ ہی نہ رکھیں گے، اور روزہ رکھنے لگتے تو خیال ہوتا تھا، کہ اب آپ افطار سے نہ ہوں گے، اس طرح شعبان میں بھی اکثر روزے سے رہتے تھے، اس کے بعد پرخوری کا الزام کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

## بزدلی اور لڑائیوں میں گھبراہٹ اور بے صبری کا الزام

قدیم وجدید کسی مؤرخ نے بھی آپ پر یہ الزام عائد نہیں کیا ہے مگر مستشرق پادری لامانس نے مؤرخین وارباب سیر کے اجماع عام کے برخلاف آپ کو اس الزام سے متہم کر کے تمام عربوں کو بھی اسی لپیٹ میں لے لیا ہے، وہ کہتا ہے "لوگ عربوں کو شجاعت سے متصف مانتے ہیں، اور اسی کو دور اول کی اسلامی فتوحات میں ان کی کامیابی کی وجہ قرار دیتے ہیں، لیکن مجھے اس انتہائی مبالغہ آمیز رائے کو ماننے میں سخت تردد ہے۔" ڈاکٹر عبدالکلیم رسول اللہ ﷺ کی شجاعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں" آپ لڑائیوں میں خود فوج کی قیادت کرتے اور کسی جنگ میں بھی آپ پراگندہ خاطر نہ ہوئے، یہاں تک کے احد کی لڑائی میں جب مسلمان عظیم ابتلا سے دو چار ہوئے اور غزوۂ خندق میں جب دشمنوں کا لشکر جرار اُمنڈ پڑا تھا، اور حنین کے روز جب مینھ کی طرح نیزوں اور تیروں کی بارش ہو رہی تھی تب بھی آپ ﷺ خائف اور مرعوب نہیں ہوئے۔

ان شواہد کے بعد بھی لامانس نے یہ افسانہ تراشا ہے کہ آپ ﷺ میں شجاعت، دلیری اور ہمت نہیں تھی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ سند روایت نقل کی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھ کر سخی تھے۔ اہل مدینہ گھبرا اٹھتے مگر آپ ﷺ پر خوطاری نہ ہوتا اور سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہو جاتے، وہ جبیر بن مطعم سے روایت کرتے ہیں کہ حنین سے واپسی کے وقت آپ نے ارشاد فرمایا تم لوگ مجھے جھوٹا بخیل اور بزدل نہ پاؤ گے، آپ ﷺ بزدلی سے پناہ مانگتے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عمرو بن میمون ازدی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ مسند روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ ''اے اللہ میں عجز و درماندگی، کاہلی و سستی، وحشت و بزدلی اور بڑھاپے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' داعیان حق کا یہی حال ہوتا ہے، وہ جو پیغام پہنچاتے ہیں، اور جسے نافذ و جاری کرتے ہیں، اس کی شدید و بے پناہ مخالفت کی جاتی ہے، اس بنا پر ان کا شجاع اور نڈر ہونا ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ تو سب سے زیادہ بہادر تھے، اس لیے یہ الزام کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

## (ج) خواب و منام کی کثرت کا الزام

یہ بہتان قرآن وحدیث کی صراحت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، رسول اللہ ﷺ کے عام اوصاف وعادات سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اس بنا پر لامانس کا یہ کہنا کہ ''آپ ﷺ بہت زیادہ سوتے تھے'' یا تو اس کی واقعی جہالت کا نتیجہ ہے۔ یا اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ کیونکہ عربوں میں نقد و انتقاد کی قوت و صلاحیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، اگر وہ آپ ﷺ کی زندگی میں کسی ایسی بات کا مشاہدہ کرتے جو قرآن کی اس خبر کے مطابق نہ ہوتی کہ آنحضرت ﷺ رات کا ایک بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے، تو وہ آپ کی پیروی اور تصدیق نہ کرتے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ﴾ (مزمل : ۲۰)

''بے شک تیرا خداوند خوب جانتا ہے کہ تم اور تمھارے ساتھ کے لوگ (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات قیام کرتے ہیں۔''

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات میں اس قدر

طویل قیام کرتے کہ پائے مبارک میں ورم آ جاتا تھا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ رات میں نماز کے لیے قیام فرماتے۔ اس کی وجہ سے آپ ﷺ کی پائے مبارک پنڈلیوں میں ورم آ جاتا تھا۔ اس بارے میں جب آپ ﷺ سے کچھ کہا جاتا تو فرماتے کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

حافظ ابن حجر قرطبی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ استفسار کرنے والوں کا خیال تھا کہ عبادت الٰہی کے لیے مشقت جھیلنے کی وجہ گناہوں کا خوف اور رحمت و مغفرت کی طلب ہے۔ نبی ﷺ کی مغفرت ثابت شدہ امر ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو عبادت کی شکر گزاری اور اس نعمت میں غیر مستحقین کو شریک کرنا بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے اتنا لمبا قیام کیا جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک برا خیال پیدا ہوا۔ لوگوں نے دریافت کیا، کون سا برا خیال پیدا ہوا، فرمایا میں نے ارادہ کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آپ ؐ کو چھوڑ دوں، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے بقرہ، آل عمران اور نساء کی سورتیں ایک ہی رکعت میں پڑھیں۔ اس درمیان میں جب آپ کوئی ایسی آیت تلاوت کرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ ﷺ پڑھنے لگتے۔ سوال کا تذکرہ ہوتا تو سوال کرتے، تعوذ کا موقع ہوتا تو تعوذ فرماتے، پھر قیام سے کچھ کم دیر تک رکوع میں رہے، اور اس سے کم دیر تک قومہ میں رہے اور قیام یہی کے کچھ کم دیر رکوع میں رہے اور اس کم دیر تک قومہ میں رہے اور قیام ہی کے بقدر لمبا سجدہ کیا، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کبھی بستر پر سوتے، کبھی چمڑے کے فرش پر، کبھی چٹائی پر، کبھی زمین پر، کبھی تخت پر، کبھی ریت پر اور کبھی سیاہ کمبل یا بوریا پر، آپ کا بستر گندمی رنگ کے چمڑے کا تھا۔ اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، آپ ﷺ کے پاس ایک ٹاٹ تھا، آپ اس پر دو تہہ کرکے سویا کرتے تھے۔ ایک روز چار تہہ کرکے بچھایا گیا تو آپ نے ناگواری ظاہر کی اور فرمایا اسے پہلے کی طرح کر دو تاکہ اس کی وجہ سے رات کی نماز میں رکاوٹ نہ پیش آئے۔

ذرا غور کیجیے جب رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل یہ تھا تو مستشرقین کی افترا پردازی کس قدر لغو ہے۔

## نبی کی حیثیت سے آپ ﷺ پر الزامات

نبی ﷺ کی ذات پر بحیثیت آدمی مستشرقین کے اعتراضات کا مختصر جائزہ لینے کے بعد اسی طرح کے چند بے سروپا اور الزام ملاحظہ ہوں، ان کا تعلق آپ ﷺ کی نبوت ورسالت سے ہے۔

### (الف) رسول کے نام پر اعتراض

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ نبی ﷺ کا اصلی نام قثم تھا۔ ولادت کے تھوڑے عرصہ بعد یا بعثت کے بعد اسے بدل کر آپ ﷺ نے اپنا نام محمد رکھ لیا۔ حالانکہ اس کی نوعیت نام سے زیادہ لقب کی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی کنیت عرصہ تک ابو القاسم رہی، لا مانس وغیرہ نے بھی رسول کے نام کو ایک معما اور لاینحل مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہوار اپنی کتاب تاریخ العرب میں یہ تعلیل وتوجیہ پیش کرتا ہے کہ محمد کا لفظ اصلاً وصف ہے۔ اس کے ایک خاص معنی ہیں۔ اسی لیے لوگوں نے اسے ان کا لقب قرار دیا ہے۔ ڈرمنگھم کی کتاب کا مترجم اس افترا پردازی کے متعلق لکھتا ہے: ''یہ عجیب وغریب الزام ہے، سب سے پہلے اسپرنگر نے اس کا ذکر کیا۔ اس کا ماخذ سیرت حلبیہ کی ایک روایت ہے جو امتاع سے اس طرح نقل کی گئی ہے کہ عبدالمطلب کے بیٹے قثم نو برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے تین سال قبل فوت ہو گئے کہ عبدالمطلب کو اس کا بڑا قلق ہوا۔ اس لیے جب آنحضور ﷺ کی ولادت ہوئی تو انھوں نے آپ کا نام قثم رکھا۔ مگر حضرت آمنہ نے کہلایا کہ انھیں خواب میں بچے کا نام محمد رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس بنا پر عبدالمطلب نے پھر ان کا نام محمد رکھ دیا۔''

اس روایت کا وضعی اور جعلی ہونا بالکل واضح ہے، اور اگر اس کی علتوں کو نظر انداز کر کے اسے مان بھی لیا جائے تو ادنیٰ غور وفکر کرنے والے کو بھی اس سے صرف یہی معلوم ہوگا کہ عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کی ولادت کے چند ہی لمحے بعد حضرت آمنہ کے اشارہ پر آپ کا نام قثم سے تبدیل کر کے محمد رکھ دیا۔ مگر برشفلڈ اسپرنگر کی اس رائے نے مستشرقین کے لیے قیاس آرائی اور افترا

پردازی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا، اور انھوں نے اس عجیب وغریب، اور نہایت بعید از قیاس نتائج اخذ کر لیے اور اس طرح کی بے سر پیر کی بات اڑادی کہ آپ کا نام محمد بعثت کے بعد رکھا گیا، اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک ستم ڈھایا کہ قرآن میں جہاں محمد و احمد کا ذکر ہے۔ وہ بعد کا اضافہ ہے۔ مثلاً

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِي إِسْرَآئِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (صف : ٦)

''اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمھارے پاس خدا کا بھیجا ہوا تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کی اور ایک پیغمبر کی بشارت سناتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔''

لیکن یہ ساری باتیں اسلام کے خلاف ان کے بغض وحسد کا نتیجہ ہیں، ورنہ یوحنا کی انجیل کے باب اصحاح (۱۴) میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے، جو محمد ہی کے ہم معنی ہے۔ ان مستشرقین نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ان کے اس بے بنیاد الزام کے ماخذ سیرت حلبیہ کے اندر اس کا بھی ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے تقریباً سولہ اشخاص کا نام محمد تھا۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں قثم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا بدن گٹھا ہوا ہو یا جو جسمانی اعتبار سے کامل وجامع ہو، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا تم قثم ہو اور تمھاری خلقت درست ہے، پتہ نہیں مستشرقین اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟ اس تو ثابت ہوتا ہے کہ بعثت کے بعد فرشتے نے آپ کو قثم کا خطاب عطا کیا تھا۔

## (ب) رسول کی امیت

بار کہتے ہیں...... دوسری آیت یہ ہے:

﴿وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَبِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ

يَعْلَمُوْنَ﴾ (آلِ عمران: ۷۵)

''اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس سے وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔''

اس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ بت پرستوں کے لیے امی یا امیین کا لفظ اہل کتاب یا یہودیوں نے وضع کیا تھا۔ اس رائے کی مزید تائید ہارنٹر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ عبرانی میں اس کا مقابل لفظ اموت یا عولام ہے، پھر وہ کہتے ہیں کہ محمد کی لفظ امی سے کیا مراد تھی؟ اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنی مشکل ہے، بول کا خیال ہے کہ امی سے وہ شخص مراد ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو۔ اس کے معنی وثنی (بت پرست) نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض اسباب کی بنا پر امی کے معنی کا یہ تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ عربی میں ''امتہ'' عبرانی میں ''اما'' اور آرامی میں ''امتیا'' کا لفظ کسی امت یا قوم کی جہالت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا،...... بعض لوگ کہتے ہیں کہ امی کا لفظ حضرت محمد ﷺ کے لیے اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ امی کا ان سب معنوں سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾

(البقرہ: ۷۸)

''اور ان میں امی (ان پڑھ) ہیں جو کتاب الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیین سے مراد نوشت وخواند سے ناواقف لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو منزل من اللہ آسمانی کتابوں سے ناواقفیت تھی۔

مستشرقین کے اقوال کے تعارض وتضاد کو نظر انداز کر کے ان کے اس شبہ کی تردید میں چند

باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

(۱)...... نبی اکرم ﷺ کی شان میں امی کا لفظ سورہ اعراف کی دو آیتوں میں آیا ہے، یہ مکی سورہ ہے، چونکہ اس وقت تک آپ ﷺ کا یہود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس بنا پر یہ خیال صحیح نہیں ہوسکتا کہ اسے یہود نے بت پرستوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ عبرانی و آرامی میں اس کے مقابل کا ہونا بھی اس کے یہود کی وضع و اصطلاح ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۲)...... امی کا لفظ قرآن مجید میں چھ جگہ آیا ہے۔ اعراف کی دو آیتوں (۱۵۷۔۱۵۸) میں اور آل عمران کی دو آیتوں (۲۰، ۷۵) میں اور ایک جگہ جمعہ (۲) اور بقرہ (۷۸) میں ان آیتوں کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد نوشت وخواند سے بے بہرہ لوگ ہیں اور یہی عربی زبان میں اس لفظ کے معروف معنی ہیں، لغت کے ائمہ اور عربیت کے ماہرین نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے، طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ ''عربوں کے نزدیک امی وہ شخص کہلاتا تھا۔ جو لکھنا نہ جانتا ہو۔'' ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔'' نوشت وخواند سے ناواقف امی کہلاتا ہے۔ ام کی جانب اس کی نسبت بھی اس معنی کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرأت وکتابت عورتوں کا عمل وشغل نہیں، قرآن نے آپ کی امیت کی صراحت اس طرح کی ہے۔

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا۟ مِن قَبْلِهِۦ مِن كِتَـٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ﴾ (العنکبوت : ٤٨)

''اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے، ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔''

رسول کی امیت تواتر سے ثابت ہے، اور مستشرقین اس کی ذات سے جس نبوت کو سلب کرنا چاہتے ہیں اس کے دلائل میں امیت بھی ہے۔

(۳)...... اوپر نقل کی گئی آیت (ومنهم اميون) سے مقالہ نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ اس سے مقصود خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں سے عربوں کی عدم معرفت ہے یہی رائے بعض مفسرین کی

بھی ہے۔ ❶

طبری سے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر بھی نقل کیا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی تصدیق نہیں کی تھی، اور خدا نے اس نام سے انھیں اس لیے موسوم کیا کہ اس کی کتابوں اور رسولوں کے منکر تھے لیکن اس اثر کی سندیں ضعیف ہیں، اور نقل بھی ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ ضحاک اگرچہ ثقہ ہیں لیکن ان کی نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات ثابت ہے اور نہ کسی اور صحابی سے اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تو مجازاً ہی یہ مفہوم مراد ہو سکتا ہے، مگر طبرانی نے اس کی تردید کی ہے، اور یہ تاویل کلام عرب کے معروف استعمال کے خلاف بھی ہے۔

## (ج) قرآن خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے

پہلے الزام سے زیادہ خطرناک دوسرا الزام یہ ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے جو آپ ﷺ کے عمل اور کاریگری کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے، یہ بات کتنی عجیب ہے کہ ان غرض پسند مستشرقین کی نظر اللہ کے کلام اور رسول کے کلام کے فرق پر نہیں جاتی جو اسلوب اور اعجاز وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں ہے گو کہ رسول کا کلام بھی انسانی بلاغت و بیان کا سب سے عمدہ وارفع نمونہ ہے، قرآن نے جب تمام انسانوں کو عموماً اور عربوں کو خصوصاً یہ چیلنج کیا کہ قرآن جیسا کوئی کلام یا اس کی کسی سورہ جیسی کوئی سورہ پیش کریں تو سب سے پہلے اس چیلنج کو خود محمد ﷺ ہی کو سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ آپ ﷺ نے تو اپنی زندگی میں حدیث کی کتابت سے بھی منع کر دیا تھا تاکہ قرآن وحدیث ایک دوسرے سے گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ ❷ یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ کوئی مصنف برسرعام ایسے شاندار کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کرنے کی تردید کرے گا، اور اس پر خود اپنی اس قدر شدید ملامت کرے گا۔ نیز کیا عربوں کا رسول کے کلام اور خدا کے کلام میں فرق و امتیاز کرنے سے عاجز رہنا ممکن ہو سکتا ہے، جب کہ ان کی زبان دانی اور طاقت لسانی مشہور ہے، بیان و بلاغت کا کوئی نکتہ

---

❶ گو کثرت سے علما نے اس معنی کو مراد لیا ہے، جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، مگر محققین کے نزدیک صحیح قول دوسرا ہے، گو رسول اللہ ﷺ کا نوشت وخواند سے عاری ہونا ثابت ہے، مگر تمام عربوں کا یہ حال نہ تھا۔

❷ یہ ممانعت ابتدائی دور کے لیے تھی، بعد میں رسول اللہ ﷺ نے تحریر وکتابت کی اجازت دے دی تھی۔

شناس اور عربیت کا رمز آشنا قرآن مجید کے خدا کی وحی ہونے کا منکر نہیں ہوسکتا، انور جندی تحریر کرتے ہیں۔ مستشرقین کی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ذہانت، عبقریت، فہم وفراست کی بنا پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن اس ماحول کے اثر سے آپ کے ذہن ودماغ میں ڈھلا جس میں آپ کی نشو ونما ہوئی تھی اور جس میں آپ نے زندگی بسر کی تھی یا پھر وہ باطنی عقل کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ اس پروپیگنڈا کا مقصد مسلمان کا قرآن سے رشتہ کاٹنا ہے، کیونکہ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ وہ محمد کا کلام ہے۔ تو لامحالہ یہ بھی ثابت ہوجائے گا کہ وہ انسانی فکر وعمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری عظمت اور معنوی بلندی خاک میں مل جائے گی، اور مسلمان متفرق اور پراگندہ ہوجائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں نظم ونسق اور گوناگوں پہلوؤں سے نہایت واضح اور بین فرق ہے۔ علاوہ ازیں محمد ﷺ امی تھے۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔'' تنہا یہی ایک ایسی دلیل ہے۔ جن سے ان لوگوں کی مکمل تردید ہوجاتی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو گذشتہ کتابوں سے واقفیت تھی، جب آپ کو اپنی قوم کے سوا کسی اور قوم کے واقعات وحالات کا علم ہی نہ تھا تو آخر کسی ذات نے آپ کو اگلے لوگوں کے واقعات اور قصوں سے مطلع کیا تھا؟

## (د) رسول اللہ ﷺ کی اعصابی کیفیتیں

اسپرنگر کہتا ہے کہ آپ کو اعصابی عوارض لاحق ہوگئے تھے، اور یہ انھیں اپنی ماں حضرت آمنہ سے وارثۃً ملے تھے، کیونکہ زمانہ حمل میں وہ ایسے خواب دیکھتی تھیں جو از قسم خرافات تھے۔ مگر اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسپرنگر کی طرح ہمیں خوابوں کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ شیخ محمد عرفہ لکھتے ہیں ہم کو خوشی ہے کہ خود مستشرقین نے اسپرنگر کے اس خیال کی تردید کردی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اعصابی کیفیتیں اور حالتیں پیش آتی تھیں۔ جو انھیں اپنی ماں سے وراثۃً ملی تھیں لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ حضرت آمنہ کے خواب از قسم خرافات تھے، کیونکہ ان کا خواب دیکھنا محال اور ناممکن نہیں، اسی طرح خواب دیکھنے کے لیے اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہونا ضروری نہیں ہے۔

مستشرقین اور مسلمانوں میں سے متعدد محققین اور علم تاریخ کی روشنی میں اس الزام کی تردید کی ہے انھوں نے انسانی نفسیات کے مطالعہ اور آدمی کی صحت ومرض کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ اعصابی

بیماریوں میں مبتلا اشخاص سے عظمت و برتری کے کمالات، قابل رشک وفخر کارنامے اور غیر معمولی ذہنی نتائج کا ظہور ناممکن ہے، نیز وحی کے حالات وکیفیات اعصابی امراض (مرگی اور بیہوشی وغیرہ) کی حالتوں اور کیفیتوں سے بالکل مختلف ہیں، ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں: مستشرقین کی تحقیقات نے ان کی رہنمائی اس امر کی جانب کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مرگی کی بیماری تھی، اس لیے آپ ﷺ پر جنونی کیفیتیں طاری ہو جاتی تھیں، اس حالت میں آپ پوشیدہ ہو جاتے، بدن سے پسینہ بہنے لگتا، جسم میں تشنج آ جاتا، اعضاء وجوارح سکڑ جاتے اور منہ سے جھاگ گرنے لگتا، جب افاقہ ہوتا تو آپ مسلمانوں کے سامنے تلاوت کرتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے مجھ پر وحی ہوئی ہے، حالانکہ یہ سب باتیں مرگی کے دورے کے نتیجہ ہوتی تھیں۔ مگر محمد ﷺ پر وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی اور آپ پر جو کچھ فیضان ہوتا اس کی یہ تعبیر وتوجیہ علمی حیثیت سے نہایت غلط ہے، کیونکہ جس پر مرگی کا دورہ ہوتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے اس اثنا میں پیش آنے والی باتیں یاد رہ جائیں بلکہ افاقہ کے بعد وہ ان سب باتوں کو بھول چکا ہوتا ہے، اور اسے بالکل ہی یاد نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا تھا، کیونکہ فکر وشعور کی حرکت اس حالت میں یکسر معطل ہو جاتی ہے، لیکن وحی کے وقت پیغمبر کا یہ حال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ہوش وحواس بجا رہتے ہیں، ادراک کی قوت بیدار رہتی ہے اور جو کچھ اسے ملتا ہے وہ پوری توجہ سے سنتا اور محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ نزول وحی کے وقت روحانی ادراک گو مکمل طور پر بیدار رہتا ہے۔ تاہم جسم کی اصل کیفیت کا اس وقت زائل ہو جانا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ اکثر تو نزول وحی کے وقت آپ عادی طریقے پر بالکل بیداری کی حالت میں ہوتے تھے۔ سورہ فتح کے نازل ہونے کے وقت آپ کی وہی کیفیت تھی، یہ سورہ واقعہ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ واپسی کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اعصابی بیماریاں انسان کے ہوش وحواس کو معطل کر کے ایسی حالت میں کر دیتی ہیں جس میں شعور، احساس اور ادراک مفقود ہو جاتا ہے لیکن وحی میں یہ صورت پیش نہیں آتی بلکہ دراصل یہ روحانی ارتقا کا نام ہے جو انبیاء علیہم السلام ہی کو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے، اور اس کے

ذریعہ اعلیٰ اور یقینی حقائق کو نبیہ ان پر القا فرماتا ہے تا کہ وہ انھیں لوگوں تک بھی پہنچا دیں اعتدال پسند مستشرقین کی تصنیفات میں بھی اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ (آ ینا دینہ) حیات محمد (ڈرمنگھم) حیات محمد (آرونگ) تہذیب وتمدن کی کہانی (ول ڈیوران) مشرقی تحقیقات (ڈاگویہ) وغیرہ۔

سنوک ہرگرنگ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کا وزن تسلیم کرنا چاہیے۔ وہ تاریخ عالم کے ممتاز ترین فرد تھے۔ دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی اس پر طویل بحثیں موجود ہیں اور انھوں نے وحی کی کیفیت بیان کرنے میں صحیح حدیثوں اور معتبر کتب سیرت کو ماخذ بنایا ہے۔

**معجزات نبوی ﷺ کا انکار**

وحی کا خارق عادت ہونا بالکل واضح ہے، اور جب اس کی مختلف شکلیں احادیث سے ثابت ہیں تو دوسرے خوارق ومعجزات بھی اگر صحیح حدیثوں سے ثابت ہوں تو انھیں تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہوسکتا ہے، مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد یہ تصور اپنے دل سے نکال دینا چاہیے کہ آپ کی زندگی کا صرف ایک ہی معجزہ قرآن ہے، اور اگر کسی کا آپ پر ایمان ہی نہ ہو تو بھلا وہ آپ کے کسی معجزہ کو کیا تسلیم کرے گا۔ خواہ یہ معجزہ قرآنی ہی کیوں نہ ہو۔

معجزات کی من مانی تاویل اور ان کی اپنی خواہشات کے مطابق توجیہ بڑی ناروا جسارت ہے، نہ یہ بحث وتحقیق کا صحیح انداز ہے، اور نہ کسی معقولیت پسند شخص سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے، معجزات کو مقتضائے عادت کے خلاف ہونے ہی کی بنا پر خوارق کہا جاتا ہے، اور جو چیزیں عادی اور مانوس طریقے کے مطابق ہوں، لیکن عالم ودانش کا کبھی بھی یہ فیصلہ نہیں رہا ہے کہ مالوف اور عادی چیزیں ہی صرف ممکن الوقوع ہوتی ہیں، اور نا مانوس اور غیر عادی چیزوں کا وقوع غیر ممکن اور محال ہے۔ اگر تم معجزات وخوارق کے متعلق علم، قانون اور ضابط کا فیصلہ معلوم کرنا چاہو گے تو ان کی زبان حال سے جس کو ہر صاحب علم ونظر سمجھتا ہے، یہی جواب ملے گا کہ معجزات وخوارق کا تعلق فنی وعملی موضوعات سے نہیں ہے، اس لیے وہ ان کے بارے میں کوئی متعین حکم نہیں لگا سکتے بلکہ خارق عادات چیزوں کے ظہور کے بعد ہی وہ بحث وتجزیہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔

## براق، اسراء اور معراج

کارادافو (Carra de vawx) کہتے ہیں، براق کا لفظ جو برق کے لفظ سے متصل اور جڑا ہوا ہے، افسانوں اور قصوں میں ایک عجیب شکل وصورت کے اس انوکھے اور بے بنیاد جانور کے لیے آیا ہے، جس پر رسول اللہ ﷺ معراج کی شب میں سوار ہوئے تھے۔

احمد محمود شاکر اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسراء معراج کی حدیث میں اس کی صراحت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو رات میں لے جانے کے لیے ایک چوپایہ لایا گیا تھا۔ جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا، اور اس کا رنگ سفید اور رفتار بہت تیز تھی، محدثین اور علمائے فن کے نزدیک ان حدیثوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں بلکہ یہ متواتر اور قطعی الثبوت ہیں، ان کو مفسرین کے اقوال قرار دینا غلط ہے، مقالہ نگار کو تعبیر وبیان کا یہ طریقہ اور ایسے نامناسب الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا۔ مسلمانوں کے علماء کے نزدیک جو چیزیں تواتر سے ثابت ہوں ان کا صحیح اور یقینی ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہوتا ہے، ان کی نوعیت اساطیر اور افسانوں جیسی نہیں ہوتی، در حقیقت براق کا تعلق ان غیبی امور سے ہے، جن کی آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے، اور جو ماوراء مادہ ہونے کی وجہ سے آدمی کے احساس اور گرفت میں نہیں آسکتے ہیں، اس زمانہ میں فلکیات سے متعلق جو علمی انکشافات ہوئے ہیں ان کی حقیقت اس سے پہلے غیر معلوم تھی۔

مقالہ نگار نے اسراء ومعراج کو آنحضرت ﷺ کا خواب کہا ہے، لیکن صحیح وصریح متواتر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم خواب کا واقعہ نہ تھا، بلکہ روح وجسم کی بیداری کی حالت میں پیش آیا تھا، اس کی اس خصوصیت واعجاز کے قریش منکر تھے، انھوں نے اس سلسلہ میں بعض مسلمان اہل قلم کا حوالہ بھی دیا ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ معراج روحانی تھی، ان لوگوں کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے وہم ہوا ہے کہ ''معراج کی شب آپ ﷺ کا جسم مبارک اپنی جگہ پر موجود تھا۔'' مگر یہ بے اصل جھوٹی اور گڑھی ہوئی روایت ہے، اس کی سندیں درست نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی مدینہ میں ہوئی جب کہ اسرا کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ میں پیش آیا تھا۔ [1]

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا وہی نقطہ نظر ہے جس کی فاضل مصنف نے ترجمانی کی ہے، مگر محققین اور علمائے حق کی ایک جماعت کی رائے وہی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ⇦⇦

مستشرقین کے رسول اللہ ﷺ کے انکار وعدم تصدیق کی یہ ایک مثال تھی، یہ عجیب بات ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کے خوارق ومعجزات کو تو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کے اسی قسم کے معجزات کو مستبعد قرار دیتے ہیں اور انھیں افسانہ اور خرافات شمار کرتے ہیں۔ اعتدال پسند مستشرقین ڈینہ، بوڈلی اور کارلائل وغیرہ کا حال یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے دوسرے معجزات کو نظر انداز کر کے صرف معجزہ قرآنی سے آپ ﷺ کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں، کیونکہ یہی آپ کا دائمی فکری معجزہ ہے، اسے تعریف وتوصیف کے پیرایہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی ملائکہ سے بات چیت ہوئی یا عجائب وغرائب کا ان سے صدور ہوا، اور طبعی قوانین کے خلاف خرق عادت چیزیں ظاہر ہوئی بلکہ یہ فرمایا کہ میں تم ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں'' ان لوگوں کا مقصد جو بھی ہو مگر اس سے غرض پسند مستشرقین کے لیے انکار نبوت کا مواد فراہم ہوتا ہے، اور معتدل مستشرقین کو بھی آپ ﷺ کی اہمیت کو کم کرنے اور آپ ﷺ کی ذات کو نکتہ چینی کا نشانہ بنانے کا موقع ملتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات انشقاق قمر (چاند کا ٹکڑے ہوجانا) نبع جذع (درخت کے تنے سے آواز نکلنا) تکثیر الطعام (تھوڑے کھانے کا زیادہ ہوجانا) نبع الماء (انگشت مبارک سے پانی کے چشمہ کا جاری ہونا) وغیرہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں بلکہ ان میں سے بعض معجزات کے طرق اسناد حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لیے مستشرقین کے انھیں نظر انداز کرنے اور نہ کرنے سے نہ تو کسی مسلمان کا ایمان ہی ڈگمگا سکتا ہے اور نہ انسانی عقل ان کے وقوع کو محال خیال کرسکتی ہے، موجودہ تاریخی حقائق نے بھی آپ ﷺ کے بعض معجزات کے ثبوت مہیا کردیے ہیں، چنانچہ سائنس کے جدید انکشافات کے بعد چاند کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اینا ڈینہ لکھتے ہیں کہ تمام مذاہب کے علمبرداروں میں صرف پیغمبر اسلام ہی وہ واحد شخص ہیں جن کی رسالت کا ثبوت معجزات کا محتاج نہیں ہے، آپ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل خود قرآن مجید کی بلاغت ہے، قرآن مجید کی مندرجہ

⇦⇨ منقول ہے، سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے، آخر میں مصنف سیرت بھی جمہور کے مسلک ہی کو صحیح سمجھنے لگے تھے مگر دوسرے قول کو سراسر بے اصل قرار دینا بھی درست نہیں ہے، علاوہ ازیں معراج جسمانی ہوئی ہو یا روحانی، دونوں صورتوں میں اس کا معجزہ اور خارق عادات ہونا ظاہر ہے۔ (مترجم)

ذیل آیات میں اس کی جانب یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿وَ مَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ﴾

(بنی اسرائیل: ۵۹)

''اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لیے موقوف کر دیں کہ اگلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔''

ڈینہ کا مقصد رینان کی تردید ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدح ومنقبت کے ثبوت میں ان کے معجزات کو پیش کر کے کہتا ہے کہ اس طرح کے معجزات دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ظہور میں نہیں آئے، وہ معجزات کو اس لیے محال قرار دیتا ہے کہ وہ تاریخ وعلم النفس کے اصول وقواعد کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی اس رائے سے عقلی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے بعض مسلمان محققین بھی متاثر نظر آتے ہیں، عقاد کا بیان ہے کہ مخالفین کو دعوت دینے میں نبی کے خوارق مفید نہیں ہوتے کیونکہ وہ لوگ تو معجزہ کو سحر وشعبدہ یا مدہوشی اور دیوانگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور اس کے ذریعہ سے انبیاء علیہم السلام کے لیے چاہے آسمان کا دروازہ ہی کیوں نہ کھل جائے۔ رسالت ونبوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہوگی کہ قرآن میں اس کی تو تاکید پر تاکید کی گئی ہے کہ آسمانی رسالت لوگوں کی عقل وضمیر کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک بنائی گئی ہے، مگر نبوت پر ہر قسم کے اعتراضات واوہام کے باوجود اس کی صحت کو خوارق یا اخبار غیب سے مشروط نہیں کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَ يَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَقُلۡ اِنَّمَا الۡغَيۡبُ لِلّٰهِ فَانۡتَظِرُوۡا اِنِّيۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ﴾ (یونس: ۲۰)

''اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی؟ کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ ہی کو ہے، سو تم انتظار کرو! میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔''

وہ اس مفہوم کی مزید آیتیں نقل کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علم غیب سے صرف اللہ ہی کو

واقفیت ہوتی ہے۔ مگر اس مسئلہ کا معجزات سے کوئی تعلق نہیں، قدیم علمائے اسلام اور دور جدید کے فضلاء نے معجزہ کی حقیقت اور تمام انبیاء کے لیے اس کے ثبوت وامکان کے مسئلہ کو اچھی طرح واضح کردیا ہے، پس اسلام کی رو سے معجزہ کا ثبوت درست اور مسلّم ہے یہ اس خارق عادت امر کا نام ہے، جو انبیائے مرسلین سے ان کی نبوت کی صحت وصداقت ظاہر کرنے کے لیے صادر ہوتا ہے، پس معجزات کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مادی علوم کے منافی ہو مگر انسان عقل وادراک کے ناقص ومحدود ہونے کی بنا پر ان اسباب ومقاصد سے واقف نہیں ہوتا جن کے لیے یہ رونما ہوتے ہیں، مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب وعلل اور اصول وقوانین کے صانع ہے۔ اس لیے وہ ان کو تبدیل کر دینے اور انبیاء کے ذریعہ مقتضائے عادت کے خلاف چیزیں ظاہر کر دینے پر بھی قادر ہے،...... آنحضرت ﷺ کا سب سے اہم اور عظیم الشان معجزہ قرآن مجید ہے، یہ ابد تک قائم وباقی رہے گا اور اس اعتبار سے وہ دوسرے انبیاء علیہ السلام کے معجزات سے ممتاز ہے، اور اس کے ماضی حال اور مستقبل کے حقائق سے دائمی مطابق ہونے کی مثال دی جاتی رہے گی۔

## شارع کی حیثیت سے نبی ﷺ پر اعتراضات

مستشرقین نے ان شرعی احکام وقوانین پر بھی اعتراضات کیے ہیں۔ جن کی نبی اکرم ﷺ نے دعوت دی ہے جیسے اسلامی عبادات، معاملات جہاد اور شریعت کے حکم واسرار وغیرہ، اختصار کی وجہ سے چند ہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱)...... حج، ڈرمنگھم اپنی کتاب حیات محمد ﷺ میں لکھتا ہے۔ قریش عہد جاہلیت میں حج کے جو مراسم ومناسک اختیار کیے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے اہل مدینہ کی امید وتوقع کے برخلاف ان ہی کو جاری وباقی رکھا، کیونکہ آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے قریش اسلام کی جانب راغب ہو جائیں گے اور یہ بتدریج ان چیزوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو روحانی بلندی کی موجب اور کتاب مقدس کی تعلیم وہدایت کے مطابق ہیں۔

اس شبہ کی تہہ میں متعدد اور شبہات بھی پنہاں ہیں، چونکہ فاضل مستشرق نے حج کے اعمال ومناسک کو آپ ﷺ کی جانب منسوب کیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس پر رد وکد کی ضرورت پیش

آئی، اس کا تحلیل و تجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) ڈرمنگھم یہ لکھ کر قارئین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ حج کے اعمال و مناسک خود نبی ﷺ کے وضع کیے ہوئے ہیں۔اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے قریش کو اسلام سے قریب کرنے کے لیے ان کی خاطر داری و دلجوئی کا پورا لحاظ رکھا ہے۔مگر فاضل مستشرقین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے احکام و مسائل سرے سے کسی نبی یا رسول کی خواہش پر مبنی نہیں ہوتے، ان کی اصل نوعیت تو یہ ہے۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ (النجم: ٤)

''یہ تو وحی (حکم خداوندی) ہے جو (ان کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔''

جس نبی کی صداقت، امانت اور پیغامِ حق کو بے کم و کاست پہنچانے کی مسلمہ شہادتیں موجود ہیں وہ بھلا اس قدر پست سطح پر کیسے اتر سکتا ہے کہ سیاسی قیادت کی ہوس کرے اور حق کے اصول و مبادی سے دستبردار ہو جانے اور ان کے بارے میں بھاؤ تاؤ کرنے کی خیال بھی اپنے دل میں لائے چاہے یہ ڈرمنگھم ہوں یا کوئی اور مستشرق، جب یہ لوگ یہ اور اسی طرح کے دوسرے دعوے کرتے ہیں تو ان کی دلیلیں کیوں نہیں پیش کرتے، اس کے بغیر کون ان کی باتوں سے مطمئن ہوسکتا ہے۔

(ب) ڈرمنگھم کا مقصد یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ حج کے اعمال و مناسک ملت ابراہیمی کی یادگار نہیں ہیں، بلکہ ان میں قریش کے حج کی نقل و متابعت کی گئی ہے، لیکن یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے، اور شریعت محمدی سے اس کے برعکس ثبوت ملتا ہے، صحیح مسلم، ابو داؤد نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ میں ایک حدیث منقول ہے، جس کے متن کا خلاصہ، امام مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے۔

عن جعفر بن محمد عن ابیه قال دخلنا علی جابر بن عبدالله فسئال عن القوم حتیٰ انتهی الی فقلت انا محمد بن علی بن حسین فاهوی بیده الی راسی...... فقلت اخبرنی عن حجة رسول الله ﷺ فقال بیده فقد تسعا...... فلما کان یوالتردیة توجهوا الی

منیٰ فاھلوا بالحج ورکب رسول اللہ ﷺ فصلی بھا الظھر والعصر والمغرب والعشاء والفجر ثم مکث قلیلا حتیٰ طلعت الشمس وامر بقبة من شعر تفرب له بنمرة فساء رسول اللہ ﷺ ولا تشك قریش الا انه واقف عندالمشعر الحرام کما کانت قریش تصنع فی الجاھلیة فاجاز رسول اللہ ﷺ حتیٰ اتی عرفة فوجد القبة قد ضربت له بنمرة فنزل بھا حتیٰ اذا زاغت الشمس امر باقصواء فرحلت له فاتی بطن الوادی فخطب الناس..... .

”جعفر بن محمد (امام جعفر صادق) اپنے والد محمد بن علی (امام باقر) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم چند لوگ جابر بن عبداللہ کے پاس گئے، انھوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کون ہیں (سب نے اپنا تعارف کرایا) یہاں تک کہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا میں محمد بن علی بن حسین ہوں، چنانچہ انھوں نے دست شفقت میرے سر پر رکھا...... میں نے عرض کیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے حجۃ الوداع کے بارے میں بتایئے! انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے نو کی گنتی کا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا...... جب یوم الترویہ (۸ ذی الحج) ہوا تو ہم لوگ منیٰ کے لیے روانہ ہوئے (اور جو عمرہ کرکے احرام ختم کر چکے تھے) انھوں نے حج کا احرام باندھا اور رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر منیٰ چلے اور وہاں آپ نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نماز ادا کی، فجر بعد تھوڑی دیر آپ اور ٹھہرے، یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو آپ عرفات کو روانہ ہوئے، آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ صوف کا بنا ہوا خیمہ آپ کے لیے نمرہ میں نصب کیا جائے، قریش کو اس میں شک نہ تھا کہ آپ مشعر حرام کے پاس قیام کریں گے کیونکہ وہ زمانہ جاہلیت میں ایسا ہی کرتے تھے، مگر آپ (ان کے علی الرغم) مشعر حرام سے آگے بڑھ کر عرفہ پہنچ گئے اور نمرہ میں جو خیمہ آپ کی ہدایت کے مطابق نصب کیا گیا تھا آپ اسی میں اتر گئے یہاں تک کہ جب آفتاب ڈھل گیا تو آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی قصوا پر کجاوا کسنے کا حکم دیا، جب کجاوا کسنے

کے بعد وہ لائی گئی تو آپ اس پر سوار ہو کر وادی کے درمیان آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔'' (صحیح مسلم بشرح النووی، ج ۸۔ ص ۱۸۱)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی حج کے اندر ایسی جو باتیں داخل کر لی گئی تھیں جن کا ملتِ ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس حدیث میں ان کو باطل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قریش عہد جاہلیت میں بیت اللہ کے مجاور و متولی ہونے کی بنا پر حدود حرام سے باہر نہیں نکلتے تھے، بلکہ اس کی حدود کے اندر مزدلفہ کے علاقہ میں مشعر حرام کی پہاڑی قزح کے پاس ہی وقوف کرتے تھے، اور اسے اپنا خاص امتیاز سمجھتے تھے، ان کو یقین کامل تھا کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے اسی خاندانی دستور کے مطابق مشعر حرام ہی کے پاس وقوف کریں گے اور وہاں سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ لیکن چونکہ ان کا یہ طریقہ غلط اور ملت ابراہیمی کے خلاف تھا۔ اس لیے آپ نے آگے بڑھ کر عرفہ اور وادی نمرہ میں حدود حرم سے باہر قیام کیا جس کی ہدایت آپ کو اس آیت میں دی گئی تھی۔

﴿ثُمَّ اَفِیۡضُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (بقرہ: ۱۹۹)

''پھر تم لوگ (قریش) بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں۔''

یعنی جس طرح ہم لوگ حدود حرم سے باہر عرفہ تک جاتے ہیں وہیں آپ ﷺ اور آپ کے اہل خاندان بھی قیام کریں، اس میں قریش کو کوئی امتیاز اور خصوصیت حاصل نہیں ہے۔

(۲)...... حج کے سلسلہ میں مستشرقین کا دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ اور سامی قبائل کی رسموں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

(الف) مستشرقین اپنے پہلے دعویٰ کے ثبوت میں رمی جمرات (کنکریاں مارنے) کو پیش کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ رسم بت پرستی سے ماخوذ اور اسی کی یادگار ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، صرف سیرت کی کتابوں اور حدیثوں ہی میں اس کا ذکر ملتا ہے، اسلام سے قبل جمرات کے پاس خون سے رنگے ہوئے چند پتھر رکھے رہتے تھے، اور یہیں قربانی کی جاتی تھی۔

احمد محمد شاکر مرحوم اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: رمی جمرات بت پرستی کی علامت اور یادگار نہیں ہے، بلکہ حج کے شعائر اور دین ابراہیمی کی قدیم یادگاروں میں ہے۔ عربوں میں اس کی بعض چیزیں وراثۃً چلی آ رہی تھیں، مگر اکثر چیزوں میں انھوں نے تحریف وتغیر کر ڈالا تھا، اسلام نے حج کے تمام شعائر کو خدائے واحد کی خالص عبادت کے لیے مخصوص کر دیا، وہ توحید اور خدا پرستی کا دین ہے، رسول اللہ ﷺ کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ مسلمانوں کے اعمال، اقوال، عقائد اور عبادات میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔

(ب) احرام

دوسرے دعویٰ کے سلسلہ میں مستشرقین کا خیال ہے کہ احرام کے لیے غسل کرنا اور خضاب اور خوشبو لگانا بھی ایسی رسم ویادگار ہے جس کا سلسلہ ان عبادتوں اور دعاؤں سے جا ملتا ہے جو قدیم زمانہ میں شیاطین کو بھگانے اور دور کرنے کے لیے کی جاتی تھیں، اسی طرح احرام کا کپڑا قدیم سامی لوگوں کے یہاں بھی بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کاہنوں اور زاہدوں کی چادریں بھی اسی وجہ سے سفید ہوتی تھیں، نیز بعض دینی رسمیں انجام دینے کے وقت جسم کی جانب توجہ نہ کرنا سامی قبائل کی معروف عادت تھی۔

اس سلسلہ میں بھی وہی جواب مناسب ہے، جو اوپر گزر چکا ہے، مزید وضاحت کے لیے یہ بتانا کافی ہوگا کہ اسلام خدا کی شریعت اور قانون کا نام ہے، یہ اپنے تشخص، امتیاز اور جداگانہ خصوصیات کی بنا پر دوسرے تمام شرائع وقوانین سے بالکل مختلف وممتاز ہے۔ اس پر کسی اور زیب وشریعت کی کوئی چھاپ نہیں ہے، اگر کوئی اسلامی عبادت کسی قدیم عمل کے مشابہ ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا تعلق بھی آسمانی والہامی شریعت سے ہوگا، اسلام کسی الٰہی قانون اور اسلامی عبادت کو برقرار رکھنے میں مزاحمت نہیں کرتا کیونکہ اس طرح کی عبادت فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ غسل، خضاب اور سفید کپڑا پہننا وغیرہ بھی عین فطرت کے مطابق ہیں، اسلام کسی چیز کو اس وقت تک ناگوار اور معیوب نہیں قرار دیتا جب تک کہ وہ توحید خالص کے تصور کے منافی نہ ہو، غرض حج کے اعمال ومناسک کو بت پرستی کی علامت قرار دینا یا سامی قبائل کی یادگار بنانا مستشرقین کا ایسا فرضی

دعویٰ ہے، جس کی تائید کسی قابل اعتماد تاریخی دلیل سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس حج کے تمام اعمال کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عبادتوں سے جڑا ہوا ہے، سامی قبائل کی جسم کی جانب سے اہمال وغفلت کی مشہور رسم کو اسلام نے نہ حج کے اندر باقی رکھا ہے، اور نہ حج کے باہر، رہے وضو، غسل اور طہارت تو یہ مسلمانوں کی ہمہ وقتی عبادتوں کا خاص جز ہیں۔

(ج) جہاد

مستشرقین کے نزدیک جہاد قتل وخوں ریزی اور دوسری قوموں کو زیر اور مغلوب کرنے کا نام ہے۔ وہ اس کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں اس کی سونتی ہوئی تلوار ہی کا حصہ ہے۔ اسلام نے عام مذاہب کے برخلاف دنیا کو (اس قدر حیرت انگیز سرعت سے جو بیخ وبن سے اکھاڑ دیا تو اس کا راز بھی اس کے تشدد وطاقت ہی میں پنہاں ہے، اس طرح اسلام اور دوسروں کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں وہی تعلق ہے جو ایک جڑ سے نکلنے والے دو درختوں میں ہوتا ہے کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے، اس لیے تخریب، ہلاکت، دہشت، بربریت، خوں ریزی اور سفا کی ہی اسلام کے برگ وبار ہیں اور جبر و استبداد اور لوگوں کو زبردستی حلقہ اسلام میں داخل کرنا اس کا شیوہ ہے۔

جہاد کے خلاف مستشرقین کی ان چند ہی ہرزہ سرائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت الی اللہ، بہترین حکمت وموعظت کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ واشاعت، اسلامی حقائق پر لوگوں کا انشراح متعدد قبائل کا رضا ورغبت سے اسلام قبول کرنا، اسلام کا عقیدہ وفکر کی آزادی کا اعلان کلمہ پیش کر کے اسلام کی تلقین وغیرہ کے واقعات نہ کبھی پیش آئے اور نہ اسلام نے اپنی دعوت وتبلیغ کا کبھی یہ انداز ہی اختیار کیا۔

میکڈونالڈ لکھتا ہے، ''تلوار کے ذریعہ اسلام کی نشر واشاعت سارے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔'' جہاد کے مفہوم کی اس تحریف کے بعد اس نے جو نتیجے اخذ کیے ہیں، وہ سب بھی نہایت بے بنیاد اور سراسر غلط ہے۔ مثلاً پڑوسی قوموں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو خطوط لکھے یا ان کے پاس جو وفود سفرا بھیجے، اس کا مقصد فاضل مستشرق کے نزدیک کشور کشائی اور

ان قوموں کو سرنگوں اور مغلوب کرنا تھا، حالانکہ اگر کوئی انصاف پسند قرآن واسلام کے مقصد وروح کو واقعی سمجھے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت وسیرت مبارکہ کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسلامی جہاد ایک ایسا دقیق قانون ہے جو نہ تو جلدی اور روا روی میں تیار ہوا ہے، اور نہ عدم غور فکر کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ خدا کی طرف سے وحی کردہ ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ اسلام ساری انسانیت کا دین بن جائے، اور اسے تمام مذہبوں پر برتری وبالادستی حاصل ہو جائے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے، جو پورا ہوگا۔

﴿وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ﴾ (ص : ۸۸)

''اور تم اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔''

مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے اسلامی جہاد کی جو تعبیر کی ہے اس سے اسلامی فتوحات اور جہاد کے اصل اسلامی اغراض ومقاصد کا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے، کرین کا بیان ہے کہ فریضہ جہاد کی بنا پر کسی شخص کو بھی اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے، حالانکہ یہ نہ اسلام کا اصول ہے اور نہ علمائے اسلام نے اس کی کہیں صراحت کی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں محض جنگ وقتال ہی جہاد کی صورت نہیں ہے، بلکہ کلمہ تلقین ودعوت اور علم کی طلب واشاعت کا نام بھی جہاد ہے۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ بھی جہاد ہے، نیز نفس اور اس کی خواہشات سے بھی جہاد کیا جاتا ہے، یہ سب صورتیں بھی جہاد کے مفہوم میں داخل ہیں اور بہت مشہور ہیں۔

### ۳۔ اسلام صرف وعظ وپند کی دعوت ہے

کہاں تو یہ اعتراض تھا کہ اسلام قتل وخوں ریزی کا مذہب ہے۔ اور کہاں اس کے بالکل برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ جہاد کا حکم تو صرف نبی ﷺ کی زندگی ہی تک کے لیے تھا، اور اب اس کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، ان لوگوں کی نظر میں اسلام صرف پند، موعظت، رہبانیت اور درویشی کا نام ہے، اور بعض مستشرقین کے نزدیک جہاد کی حیثیت دفاعی ہے، اسلام قتال کی اسی وقت اجازت دیتا ہے جب خود اس کو برباد کرنے کے لیے اس پر حملہ کیا جائے، مستشرقین کے اس پروپیگنڈا کا یہ اثر ہوا کہ خود مسلمانوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرلیا ہے اور بقول مولانا مودودیؒ اپنی اس طرح

صفائی دینا شروع کی ہے کہ:

''حضور! بھلا ہم جنگ وقتال کیا جانیں؟ ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پرامن مبلغ لوگ ہیں، چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اوران کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرالینا بس یہ ہمارا کام ہے، ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا، سواب ہم تو اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں، حضور کی طمانیت کے لیے تلوار والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے، اب تو جہاد فقط زبان وقلم کی کوشش کا نام ہے۔''

اس پروپیگنڈا سے برطانوی استعمار کو ہندوستان پر اپنا تسلط جمائے رکھنے میں بڑی مدد ملی، اس سلسلہ میں ان کو قادیانیوں سے بھی خوب سہارا ملا جو جہاد بالسیف کو موجودہ زمانہ میں باطل قرار دے کر انگریزوں کے معاون اور پشت پناہ بن گئے تھے۔

## سیرت نبوی کے متعلق مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح

آنحضرت ﷺ کی سیرت کے واقعات کو مسخ کرنے اور انھیں توڑ مروڑ کر کیا سے کیا بنا دینے میں مستشرقین نے کس قدر تلبیس وتدلیس سے کام لیا ہے، ان سے ان کی فتنہ پردازی بدنیتی اور تعصب کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے مستشرقین کے پیش رو اہل کتاب کے متعلق جو یہ کہا تھا کہ

﴿يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (آلِ عمران : ۷۱)

''اے اہل کتاب تم حق کو باطل میں کیوں گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو، درآنحالیکہ تم جانتے بھی ہو۔''

دوسری جگہ پر ہے:

﴿وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ

يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (آلِ عمران: ٤٨)

''اور ان اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب (تورات) کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں تا کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب میں سے ہے، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا اور کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور خدا پر جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔''

تو وہ ان مستشرقین پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔'' (مترجم)

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی مستشرقین کی غلطیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اسلام اور مسلمانوں کے واقف کار اور ماہر فرنگیوں کی تصنیفات عجیب وغریب اغلاط کا مجموعہ ہوتی ہیں، جنھیں دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ان سے اور ان کی تحقیقات دونوں سے نفرت اور بدگمانی ہوتی ہے۔'' (مجلہ المجمع العلمی العربی دمشق، ۲۱-۳-۱۹۴۶ء)

محمد کرد علی نے مستشرقین کی غلطیوں کی متعدد قسمیں بتائی ہیں:

(۱) لفظی۔ (۲) فکری یا حسی۔ (۳) موضوع سے مصنف کی عدم واقفیت کے نتیجہ میں سرزد ہونے والی غلطیاں۔

اس قسم کی غلطیاں کرنے والوں کا دارو مدار غیر معتبر کتابوں پر ہوتا ہے، چنانچہ یہ لوگ سفرناموں، افسانوں، ناولوں اور مزاح نگار صحافیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں، حالانکہ ان کتابوں کے مصنفین اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے نادر اور انوکھی باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور جب اس میں انھیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود اپنے ذہن وتخیل سے اس طرح کی باتوں کا اختراع کرتے ہیں اور انھیں حقائق بنا کر پیش کرتے ہیں بعض غلطیاں جان بوجھ کر قصد وارادہ سے کی جاتی ہیں، ان میں دینی عصبیت یا سیاسی اغراض کارفرما ہوتی ہے، اور بعض دفعہ بیک وقت ان دونوں ہی باتوں کو دخل ہوتا ہے۔ (مجلہ المجمع العلمی العربی دمشق، ۲۱-۳-۱۹۳۶ء)

ان تہہ بہ تہہ اور زبردست غلطیوں کے اسباب وعوامل یہ ہیں۔ علوم ومعارف اسلامیہ کی وسعت، مستشرقین کا مبہم انداز بیان وجہالت، نیز اسلام وپیغمبر اسلام کے خلاف ان کی سازش و

ریشہ دوانی۔

یہ کہنا کہ ہر بحث وتحقیق کرنے والے کی نگاہ سے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں اور اس سے سہواً کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو تحقیق کے مقدمہ و بنیاد ہی کے اندر ایسی خرابی اور غلطی راہ پا جاتی ہے جس کے نتیجہ میں صحیح کے ساتھ غلط اور رطب کے ساتھ یابس شامل ہو جاتا ہے۔ پس اگر غلطیوں کے بارے میں اس سے دوبارہ گفتگو کی جائے اور ان کی نشان دہی کر دی جائے تو بحث ومباحثہ میں شدید اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے بلکہ وہ حق کی طرف رجوع کرلے گا کیونکہ رجوع الی الحق ایک علمی فضیلت و برتری ہے جو علماء وثقات کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، مگر مستشرقین عموماً دیدہ ودانستہ ایسی قبیح غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی غرض وغایت اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں پر واضح ہو جاتی ہے، اور وہ ان سے انھیں متنبہ کر دیتے ہیں تو وہ کبھی تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور کبھی ان غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ خود مستشرقین کی غلطیوں سے واقف نہ ہوسکے تو ان کی غلطیاں تسلیم شدہ علمی حقائق ومسلمات بن جاتی ہیں جنھیں علمی وادبی بحث وگفتگو میں بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

عرب محققین میں رافعی، عقاد، کرد علی، جندی اور قطب وغیرہ نے مستشرقین کی بعض غلطیوں کو نمایاں کیا ہے اور خود بعض مستشرقین نے بھی اپنے ساتھیوں کی تاریخی، ادبی، لغوی، دینی اور علمی وفنی غلطیوں کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ بالقصد و بالارادہ کی جانے والی اکثر غلطیاں شکوک وشبہات اور طعن وتشنیع کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں خرافات کے علاوہ فتنہ وفساد انگیزی کا بھی دخل ہوتا ہے۔

ذیل میں مستشرقین کی غلطیوں کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں پہلے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کی زندگی کے چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ اور آخر میں بعثت کے بعد کے واقعات زندگی کے بارے میں ان کی بعض غلط بیانیوں کا ذکر کر کے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

## آنحضرت ﷺ کے کھیل کے بارے میں غلط بیانی:

ارنج لکھتا ہے:

"اس اثنا میں کہ محمد ﷺ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ کھیتوں میں کھیل رہے تھے

...... (سیرت پر مصنف کی کتاب (ص:۴۴) اس کے بعد اس نے شق صدر (سینہ مبارک چاک کیے جانے کا واقعہ نقل کیا ہے، حالانکہ وہاں نہ کھیت تھے، اور نہ جھاڑیاں، جیسا کہ سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، سیرۃ ابن ہشام میں صرف اس قدر ہے کہ "حلیمہ کا بیان ہے کہ ہم انھیں (محمد ﷺ) کو لے کر جب اپنے گھر لوٹے تو چند ماہ بعد ایک روز وہ اپنے (رضائی) بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے بھیڑ بکریوں کے گلے میں تھے کہ دفعتاً ان کا بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور مجھ سے اور اپنے باپ سے کہنے لگا کہ "ہمارے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑ کر ......

(سیرت ابن ہشام، جلد:۱، ص:۱۷۳)

اسی مفہوم کی روایت البدایہ والنہایہ میں بھی ہے:

"حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد وہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بھیڑ کے ریوڑ میں ہمارے گھروں کے پیچھے تھے کہ ان کا بھائی دوڑتا ہوا آیا۔ ❶ (البدایہ والنہایہ، جلد:۲، ص:۲۷۴)

نوجوانی میں بھی اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کی مراسم شرک و جاہلیت سے حفاظت:

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ "محمد ﷺ کو دو بار خیال ہوا کہ شہر کے اطراف میں پہنچ کر شہوت اور نوجوانی کے لطف و لذت سے متمتع ہوں، مگر اچانک ایسی صورت پیش آ گئی کہ وہ اس سے باز رہے۔" (ڈرمنگھم کی کتاب، ص:۶۹)

صحیح یہ ہے کہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام بیہقی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے سنا کہ

❶ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے اور محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ، جلد سوم، ص:۴۹۰)

اہل جاہلیت عورتوں کے قصد وارادہ سے جو کام کیا کرتے تھے۔ مجھے دوراتوں کے سوا کبھی اس قسم کا جاہلانہ خیال تک نہیں آیا مگر ان دونوں موقعوں پر بھی اللہ نے میری حفاظت کی، ایک رات میں مکہ کے بعض نوجوانوں کے ساتھ تھا، ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تم میری بکریاں دیکھتے رہنا تاکہ میں مکہ جا کر قصہ گویوں کی مجلس میں حصہ لوں، چنانچہ جب میں مکہ میں داخل ہوا، اور پہلے گھر کے قریب پہنچا تو وہاں گانے بجانے کی آواز سنی، لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے میں یہ منظر دیکھنے کے لیے بیٹھا مگر مجھے ایسی نیند آئی کہ سورج نکلنے کے بعد ہی آنکھ کھلی، دوسری شب میں بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ ❶ (البدایہ والنہایہ، جلد ۲، ص: ۲۸۴)

کامل ابن اثیر کے الفاظ اس سے مختلف ہیں، ملاحظہ ہوں:

”جاہلیت کے زمانہ میں لوگ جو کام کرتے تھے میں نے بجز دوبار کے کبھی ان کا قصد و ارادہ نہیں کیا، مگر دونوں بار اللہ تعالیٰ میرے اور اس کام کے درمیان حائل ہو گیا اور پھر میں نے اس طرح کے کام کا کبھی ارادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی

---

❶ یہ روایت نہایت ضعیف ہے علامہ ابن کثیرؒ نے اسے نقل تو کیا ہے مگر اس کے متعلق صراحت کر دی ہے کہ یہ نہایت غریب ہے اور اس کے بعض سلسلے حضرت علیؓ ہی پر جا کر ختم ہو گئے ہیں، یعنی یہ درایت مسند کے بجائے موقوف ہے۔ صحیح واقعہ علامہ شعبی کے بیان کے مطابق صرف اس قدر تھا کہ ”عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق وشوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا۔ لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔
ایک واقعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اول، ص: ۱۴۵) نساء کا لفظ صرف اسی روایت میں ہے حالانکہ روایت میں بیان کیے گئے مضمون سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی نے سیرت کے حاشیہ میں سرولیم کی لائف آف محمد سے یہ بھی لکھا ہے۔
ہماری تمام تصانیف محمد کے بارے میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی متفق ہیں۔ (سیرت النبی، جلد اول، ص: ۱۸۶)

نبوت سے سرفراز فرمایا۔'' (الکامل، جلد۲، ص: ۳۸)

طبری کے الفاظ بھی قریب قریب اسی طرح کے ہیں۔ (تاریخ طبری، ص:۲/۲۷۲)

## عبادت نبوی ﷺ

ڈرمنگھم نے آپ ﷺ کی عبادت کے متعلق بھی یہ غلط بیانی کی ہے کہ ''آپ ﷺ نے غرض کے نام پر ایک سفید بکری کی قربانی کی تھی۔ ❶ مگر سیرت ابن ہشام میں عبادت نبوی ﷺ کے سلسلے میں اس طرح کی نجس وناپاک حرکت کی مطلق نفی کی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ جوان ہوگئے مگر جاہلیت کی خباثت اور ناپاکی سے کبھی آلودہ نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ کو آپ کرامت اور نبوت مقصود تھی اس لیے اس نے آپ کو جاہلیت کی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔

(سیرت ابن ہشام، ج۱، ص: ۹۴)

ابن کثیر رحمہ اللہ امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اصاف ونائلہ کے نام سے تانبے کا ایک بت تھا، جسے طواف کرتے وقت مشرکین چھوا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میں بھی طواف کر رہا تھا۔ چنانچہ جب اس بت کے پاس سے گزرا تو اسے چھو دیا۔ آپ نے منع کیا مگر میں نے اپنے جی میں کہا میں اسے ضرور چھوؤں گا، تاکہ دیکھوں کیا ہوتا ہے، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آئے۔''

(البدایہ والنہایہ، جلد۲، ص: ۲۸۸)

غور کرو جب رسولِ اکرم ﷺ جاہلیت کے میلے ٹھیلے میں بھی نہیں جاتے تھے، اور نہ بتوں کو چھوتے تھے بلکہ انھیں چھونے سے منع کرتے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بت کے لیے سفید بکری کی قربانی کرتے۔ ❷

---

❶ ڈرمنگھم، ص ۷۵۔

❷ علامہ شبلی نے بھی اس روایت کو ذکر کرکے اس کی تردید کی ہے مگر انھوں نے سفید رنگ کے بجائے خاکی رنگ کی بھیڑ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: ''مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا۔ بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھو مارگولیس کی کتاب صفحہ ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ ⇦ ⇦

## دکان، تجارت اور سفر کی کثرت:

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ ''ایک زمانہ میں مکہ کے اندر محمد ﷺ کی ایک دکان تھی۔'' یہ قطعاً غلط ہے، سیرت کے مآخذ سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ مزید برآں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''محمد جزیرہ عرب کے طول وعرض میں حضرت خدیجہ کے تجارتی قافلوں کی سربراہی کرتے تھے۔'' (ڈرمنگھم، ص:۶۱)

ارنج کا بیان ہے:

''حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے چند برس بعد سے آنحضرت ﷺ مستقل تجارت کرنے لگے تھے، اور قافلوں کے ساتھ دور دراز کا سفر بھی کرتے تھے۔'' ❶ (ص:۵۳)

---

⇦⇦ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے، لیکن اوّلاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے۔ ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے جو مشہور دغلو ہے۔ حاشیہ سیرۃ النبی جلد اوّل، ص: ۱۸۰۔

❶ آگے رسول اللہ کے سفر اور مقاماتِ سفر کے سلسلہ میں مصنف کے خیالات محتاج وضاحت ہیں اس لیے اس کے بارے میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی جلد اوّل سے جستہ جستہ بعض اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں: ''تجارت کی غرض سے شام وبصریٰ سے اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کیے تھے۔ (ص: ۱۰۳) آنحضرت نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کیے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے...... حضرت خدیجہ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا۔ ان میں جرش بھی ہے جو یمن میں ہے۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے...... نبوت کے بعد جس سال آپ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''میں نے تمھارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔'' (مسند ابن حنبل، ج:۸، ص: ۳۰۰) مؤرخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف ومعلومات سیر وسفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے۔ (مارگولس، ص: ۱۵۷) مؤرخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈسی (بحرمیت) کا بھی معائنہ کیا تھا لیکن تاریخی دفتر ان دعاوی سے خالی ہے۔'' (سیرت، جلد اوّل، ص: ۱۷۷) حاشیہ میں مولانا سیّد سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں، یورپین مؤرخین جن کی بنیاد صرف قیاس رائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن آنحضرت کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے بحری سفر آپ ⇦⇦

بوڈلے کا کہنا ہے کہ:

’’محمد سولہ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے اتنے سفر کر ڈالے جتنے سفر مکہ کا کوئی باشندہ عمر بھر نہیں کرتا، مکہ سے یمن، شام، فلسطین اور فارس کا سفر آپ کا معمول اور عادی امر بن گیا تھا۔ آپ کے زمانہ میں لوگ اس کثرت سے سفر صرف زیارت کعبہ کے لیے کرتے تھے۔‘‘

صحیح یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی لیکن آپ کی تجارت کی وہ شکل جو ان لوگوں نے بیان کی ہے، غیر معروف ہے۔ آپ یمن اور فارس تشریف نہیں لے گئے تھے، البتہ دمشق کے مضافات میں گئے تھے، مگر دمشق میں داخل نہیں ہوئے، رہے رسول اللہ ﷺ کے سفر تو ان کی تعداد چند ہی ہے، غالباً رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے سفر کے لیے نکلنے کی کثرت وزیادتی سے مستشرقین کا دو مقصد ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ گزشتہ اور موجودہ مذاہب سے واقف تھے۔ اور ان مذہبوں کے ماننے والوں سے آپ کے تعلقات تھے، ❶ دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تجارت سے آپ کی فطری دلچسپی اور اس میں تجربہ، مہارت اور ہوشیاری کی بنا پر آپ اس لائق ہوئے کہ لوگوں کی سیاسی راہنمائی اور قیادت کر سکیں۔

## دوسروں سے تحصیل علم:

بوڈلے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بحیرا کی صحبت میں رہ کر عرصہ تک اس سے استفادہ کرتے رہے، یہ راہب جب اس کم سن عربی سے گفتگو کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے کسی رفیق سے گفتگو کر رہا ہے، چنانچہ اسی نے انھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بتوں کی پرستش کے حماقت ہونے سے

---

⇦⇦ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب وشام کے درمیان ہے جہاں سے آپ کئی بار........

❶ اس کے متعلق علامہ شبلی کا یہ بیان گزشتہ حاشیہ میں گزر چکا ہے۔ ’’مؤرخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف ومعلومات سیر وسفر سے ماخوذ ہیں۔‘‘ (سیرت جلد اوّل، ص: ۱۷۷) آگے بحیرا راہب کے مشہور واقعہ کے ضمن میں مزید تفصیل پیش کی جائے گی۔

(مترجم)

مطالع کیا اور محمد ﷺ اس کی باتوں کو نہایت غور و توجہ سے سنتے تھے۔ ❶

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ:

> ''گو محمد ﷺ کی مکتبی تعلیم کم ہوئی مگر انھوں نے حصولِ درس کے لیے جانے والے اور دن دن بھر حجرۂ درس میں بیٹھے رہنے والے طالب علموں سے بھی زیادہ حصولِ علم کیا تھا۔'' (ص: ۴۸)

وہ اور دوسرے مصنفین یہ بھی کہتے ہیں کہ عکاظ کے سینہ اور قس بن ساعدہ کے خطبوں ❷ کے ذریعہ سے محمد ﷺ نے نصاریٰ اور ان کے فرقہ نسطوری کے اثرات بھی قبول کیے تھے۔ (ص: ۴۰)

---

❶ بحیرا کے مشہور واقعہ کا دار و مدار جس روایت پر ہے، وہ سنداً ضعیف اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے، مولانا شبلی نے اس پر مفصل نقد و جرح کی ہے، ملاحظہ ہو (سیرۃ النبی جلد اوّل، ص: ۱۶۷ تا ۱۶۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں ''تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مارگولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی مذہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے، انھی پر آنحضرت نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انھی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔ عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرقِ عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔ (سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص: ۱۶۷)

مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب میں لکھتے ہیں بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری علم کی تعلیم دی۔ آپ کے نا تربیت یافتہ لیکن خاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ...... بعد میں آپ کے طرزِ عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں، (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا۔ سر ولیم صاحب بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی وہ ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا تو سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب و مشاہدات کے نتائج تھی لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہونا ناممکن تھا توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔ (سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص ۱۶۴)

❷ قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ بہت مشہور ہے مگر وہ بھی سر تا پا مصنوعی اور موضوع ہے، مولانا شبلی نے اس کے درات پر مفصل جرح کی ہے اس سے قطع نظر نفس خطبہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر ⇦⇦

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا کتاب مقدس دیکھنا یا اسے پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں ہے، گو یہ تسلیم ہے کہ اس کے اور بعض قرآنی قصوں میں مماثلت ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے جب بحیرا سے ملاقات کی تھی تو اس وقت آپ کی عمر نو برس تھی، اور یہ بالکل خلاف عقل وقیاس ہے کہ صرف ایک ملاقات نے آپ کے تمام اثرات محو اور زائل کر دیے ہوں، علاوہ ازیں اسلام کا

⇐⇐ اسے ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں: ادب ومحاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے، اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآنِ مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفی ہیں اس لیے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت نے یہ طرز انھی سے لیا ہے..... ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے، بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہوگیا تھا، کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزو القراۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے۔ ابن ہشام میں حضرت خدیجہ، ابوبکر، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کیے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہر ان اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں ...... یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً قس بن ساعدہ کا خطبہ...... اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآنِ مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآنِ مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں...... ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولوس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ''قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے۔'' ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے۔ اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔ (سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص: ۱۸۳)

عقیدۂ توحید جس کی آنحضرت ﷺ نے دعوت دی اور انبیاء علیہم السلام کے جو خصوصیات اور جنت ودوزخ کے جو اوصاف بیان کیے اور شرائع واخلاق کے سلسلہ میں جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ سب نجران کے نصاریٰ اور نسطوریوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہیں۔

یہ بات بھی نہایت عجیب وغریب ہے جس سے کتب سیرت کا تمام ذخیرہ خالی ہے کہ اس زمانہ میں مکہ کے اندر مدرسے تھے، اور محمد ﷺ ان کے ایک فائق وبرتر طالب علم تھے۔

اب آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد کے واقعات کا سلسلہ میں مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

## وحی کی ابتدا

ونیسک لکھتا ہے:

"حضرت جبرائیل کے پہلی بار ظہور اور نبی پر غشی طاری ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بہت خوف زدہ ہوئیں اور ایک گوشہ نشین راہب کے پاس آئیں، جس کا نام سرجیوس تھا، اس نے اطمینان دلایا اور بتایا کہ یہ جبریل علیہ السلام تھے، جو فرشتہ ہیں، اور تمام انبیاء علیہم السلام کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ پر غشی اور بیہوشی طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ کپکپی طاری ہوئی تھی جو عموماً خوفزدہ لوگوں پر طاری ہوجاتی ہے، رہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو وہ اس واقعہ سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کو یہ تسکین دے رہی تھیں کہ "بخدا اللہ آپ کو کبھی ذلیل ورسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور راہ حق کی صعوبتوں اور شدتوں میں مدد کرتے ہیں۔"

احمد محمد شاکر فرماتے ہیں:

"یہ سمجھنا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا بالکل غلط اور صحیح ثابت حدیثوں کے خلاف ہے، پھر وہ صحیح بخاری سے نزول وحی کی ابتدا سے متعلق

حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے جن چچا زاد بھائی (ورقہ بن نوفل) کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئی تھیں وہ عربی النسل تھے، کوئی عجمی النسل شخص سرجیوس نہ تھے۔" (دائرۃ المعارف، ۹۔۶۔۵۷۶)

## دعوت نبوی کا آغاز

ارنج کہتا ہے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارادہ سے بنی ہاشم اور قریش کے لوگوں کو مطلع کیا...... انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کھل کھلا اور جہراً کیا تھا۔" (ص:۶۲)

مگر ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں:

"آپ نے اپنے راز سربستہ کا تذکرہ اپنے متعلقین میں ان لوگوں سے کیا جن کے بارے میں مکمل اطمینان تھا، چنانچہ تمام لوگوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد آپ پر ایمان لائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔" (جلد دوم، ص: ۵۰)

طبری کا بیان ہے:

"اللہ نے نبوت سے سرفراز فرما کر آپ پر اور اپنے بندوں پر جو انعام کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پوشیدہ طور پر اپنے انھی متعلقین سے ذکر کرتے جن کے بارے میں اطمینان تھا، عمرو بن عنبسہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ عکاظ میں تھی، عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کن لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کی ہے؟ فرمایا دو آدمیوں نے جن میں ایک آزاد دوسرا غلام ہے، یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ نے، اس کے بعد میں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ طبری یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اور آپ کی اتباع کرنے والے شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید بن حارثہ تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ اسلام لانے میں سبقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔"

(طبری، جلد ۱، صفحات: ۳۰۶، ۳۱۳، ۳۱۶)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز پوشیدگی سے کیا تھا۔ اور ابتداءاً اپنے متعلقین اور ان دوستوں سے اس کا تذکرہ کیا تھا جو قابل اطمینان اور لائق اعتماد تھے، دعوت کا اعلان تو آپ ﷺ نے تین برس بعد کیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ اللہ نے نبی کو بعثت کے تین برس بعد حکم دیا کہ جو کچھ انھیں عطا کیا گیا ہے، اسے کھلم کھلا اور علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ ❶

## حضرت خدیجہ اور ابو طالب کی وفات کا غم

ارنج لکھتے ہیں:

> ''محمد ﷺ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور اپنے چچا ابو طالب کی وفات کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا تھا، اور جس سال دونوں کی وفات ہوئی تھی اسے عام الحزن (غم کا سال) کہتے تھے۔'' (ص:۹۶)

اس قدر صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے، سیر کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے، لیکن ماتمی لباس پہننے کی بات درست نہیں ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

---

❶ تاریخ طبری، جلد۲، ص ۳۱۸ و سیرت ابن ہشام، جلد۱، ص: ۲۸۰۔ دراصل یہ تاریخ اسلام کا بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیوں کر پھیلا۔ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے، اس غلط بیانی سے مستشرقین کا یہی مقصد ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں: آنحضرت نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں اگر آپ کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ و دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیم کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیاء کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جاسکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق دعوے کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے ...... لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے ...... تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا صاف حکم آیا۔ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر) ''اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔''
(سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص: ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۵)

''ابوطالب اور حضرت خدیجہ کی وفات ہجرت سے تین برس پہلے ہوئی تھی، ان دونوں کی وفات سے رسول اللہ ﷺ کو بڑا صدمہ لاحق ہوا، آپ فرماتے تھے کہ قریش کی جانب سے مجھے ناگوار اور تکلیف دہ حد تک مصیبتیں ابوطالب کی وفات کے بعد ہی پہنچیں۔'' ❶

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان کیا ہے:

''خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابوطالب کی وفات ایک ہی سال ہوئی۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ابوطالب کی وفات کے تین روز بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا، ❷ ابن جوزی نے سنداً ثعلبہ بن صغیر اور حکیم بن حزام سے روایت کی ہے کہ پانچ دنوں کے فرق سے ابوطالب اور خدیجہ کی وفات ہوئی، اس طرح رسول اللہ ﷺ دو مصیبتوں سے بیک وقت دوچار ہوئے، غم اس قدر شدید تھا کہ گھر میں پڑے رہتے تھے، اور باہر کم نکلتے تھے، اس کے بعد قریش کی ایذا رسانیاں بہت بڑھ گئیں۔'' ❸

## رسولِ اکرم ﷺ کا منبر:

ڈرمنگھم نے منبر نبوی ﷺ کے متعلق اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

''آپ ﷺ وعظ کے وقت اپنے اسی منبر کے جو بیک وقت آپ ﷺ کی کرسی، منبر اور تخت سب ہی تھا ایک زینہ پر کھڑے ہوتے اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ یا سونے اور ہاتھی کے دانت سے جڑا ہوا عصا ہوتا جس سے نشانات اور لکیریں بناتے، منبر کے نیچے حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک سونتی ہوئی تلوار لیے کھڑے رہتے، اس کا قبضہ چاندی کا تھا، محمد ﷺ نے یہ طریقہ آخر میں عربوں کو متاثر کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔''

حالانکہ کرسی اور تخت کبھی آپ کے استعمال میں نہیں رہے، آپ تو صحابہ کرام کے درمیان اس

---

❶ الکامل، ج:۲، ص:۹۰، ۹۱۔ ❷ البدایہ والنہایہ، ج:۳، ص:۱۲۷۔
❸ ایضاً، ص:۱۳۴۔

طرح مساویانہ بیٹھتے تھے کہ نووارد کو پتہ نہیں چلتا کہ آپ کون ہیں، اسی طرح سونا جڑا ہوا عصا، اور چاندی کے قبضہ کی تلوار بھی آپ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی، کیونکہ سونے اور چاندی کا استعمال اسلام میں حرام ہے، فاضل مستشرق نے منبر کی نسبت جو کچھ کہا ہے، اس کا کوئی ذکر کتب صحاح، حدیث کی صحیح اور معتبر کتابوں میں نہیں ملتا۔

## رسول اللہ ﷺ کا پائجامہ پہننا

دائرۃ المعارف الاسلامیہ [1] میں لفظ سرول کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ پائجامہ پہنتے تھے۔ متعدد حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ پائجامہ پہنتے ہیں، فرمایا ہاں سفر وحضر دونوں میں مجھے ستر کا حکم دیا گیا ہے، اور پائجامہ سے بڑھ کر ستر پوش کوئی لباس نہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے، بلکہ سرتاپا بے اصل اور موضوع ہے اس کے ایک راوی یوسف بن زیاد بصری منکر الحدیث ہیں جو خرافات واباصیل بیان کرنے میں شہرت رکھتے تھے، اس روایت کے علاوہ دائرۃ المعارف میں اور بھی جتنی حدیثیں نقل کی گئی ہیں وہ سب کی سب مصنوعی، موضوع اور سراسر بے اصل ہیں۔

## تکبیر واقامت

جونبل کہتے ہیں:

''اقامت اذان ہی سے بنی ہے، اور اذان نصاریٰ کے طریقہ عبادت کی نقل ہے۔ انھوں نے اپنی تائید کے لیے خطط مقریزی (جلد۲، ص۲۷۱) کا حوالہ بھی دیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اذان اور اقامت دو چیزیں ہیں، دونوں کے الفاظ اور کلمات کی تعداد میں بھی فرق واختلاف ہے اور اذان میں قطعاً کلیسا کے طرز عبادت کی کوئی نقل نہیں کی گئی ہے، کتب صحاح میں اذان کے بارے میں جس حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے الفاظ محدود اور ترکیبیں معروف ہیں۔ محمد عرفہ نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے، آخر میں انھوں نے مقریزی کے حوالہ کی

---

[1] یہ مستشرقین اسلام کی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا عربی ترجمہ ہے۔

حقیقت یہ بتائی ہے۔

خطط مقریزی کی جانب مراجعت کرنے پر معلوم ہوا کہ مقریزی کا اشارہ اس تسبیح کی طرف ہے، جو رات کو مناروں سے کہی جاتی ہے، اس بدعت کی ابتدا دور آخر میں مصر کے اندر ہوئی تھی، سلف میں اس کا کوئی رواج نہ تھا...... اس سے مستشرقین کو وہم ہوا کہ مقریزی نے اذان کی ابتدا کے مسئلہ پر بحث و گفتگو کی ہے، حالانکہ ان کی بحث کا تعلق اس تسبیح کی ابتدا سے ہے، جو مناروں سے رات میں کہی جاتی تھی۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ مع حاشیہ، جلد ۱، ص ۴۵۶)

عقیدہ

ماکڈونلاڈ نے اللہ کے بارے میں کریمر اور ہوتسمان کے حوالہ سے جو کچھ نقل کیا ہے، اس میں متعدد فحش اور قبیح غلطیاں ہیں۔

(الف) محمد ﷺ نے اللہ کو جن صفتوں سے متصف کیا ہے، وہ عام لوگوں کے لیے معیوب و مذموم خیال کی جاتی ہیں، جیسے جبار و متکبر۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ان صفتوں کے جو معنی ہیں وہ اللہ کی عظمت وجلال کے بالکل شایان شان ہیں چنانچہ جبار وہ ذات ہے جو اپنی مخلوق کو اپنے ارادہ پر آمادہ اور مجبور کرتی ہے۔ اور متکبر وہ ہستی ہے جو اپنے بندوں کے ظلم سے بلند و برتر ہے۔ ❶

❶ مصنف نے ان صفتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے، مفسرین نے اسے بھی لکھا ہے مگر درحقیقت جبار کے اصلی معنی تگڑے اور زور آور کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں اس زور آور قوم کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے جس سے ڈر کر بنی اسرائیل نے عمالقہ کی بستی میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا ﴿إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ﴾ یعنی اس بستی میں بڑے زور آور اور تگڑے لوگ ہیں۔" اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ نہایت تگڑا اور زور آور ہے، اس سے زیادہ تگڑے اور زور آور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سے ان مشرکین کی تردید مقصود ہے جو ہر زبردست اور زور آور کے سامنے اپنے کو جھکا لیتے، ان کی پرستش کرنے لگتے، اور اسے دیوی، دیوتا سمجھنے لگتے ہیں۔ اور متکبر کے معنی ہیں اپنی عظمت، برتری اور بڑائی کا احساس رکھنے والا یہ احساس اللہ کے سوا کسی کے اندر ہو تو یقیناً باطل ہے، اس لیے کہ کسی کی بڑائی اس کی ذاتی شے نہیں ہے، بلکہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اللہ کی عظمت اور تکبر اس لیے مناسب ہے کہ اس کی بڑائی ذاتی، ازلی اور ابدی ہے اللہ تعالیٰ اپنی اسی کبریائی کی وجہ سے اپنی عبادت اور خدائی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ (مترجم)

(ب) ان لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ کے لیے متضاد و متناقص صفتیں بیان کی ہیں۔

ان لوگوں نے اس تناقض و تضاد کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے، غالبًا ان کی مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی صفت عفو وغفور ہے، اور دوسری طرف منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، مگر دراصل یہ کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ یہ صفتیں اپنے متعلق کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے غفور وعفو ہے جن سے عفو ومغفرت کی اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، اور منتقم اور شدید العقاب ان لوگوں کے لیے ہے جن کو سزا دینا اس کی حکمت و مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ درج ذیل آیت ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بظاہر متضاد صفتیں بیان ہوئی ہیں، حالانکہ وہ متضاد نہیں ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾

(فتح: ۲۹ ۔ دائرة المعارف الاسلامیہ، جلد۲، ص: ٥٦٤)

''محمد ﷺ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت، آپس میں رحم دل ہیں۔''

## اسلامی حدود

ڈرمنگھم کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی پر جو منافقین کا سردار تھا، اس لیے حد جاری نہیں کی کہ وہ اپنی قوم اور اہل مدینہ میں غیر معمولی اثر ونفوذ رکھتا تھا۔

(حیات محمد از ڈرمنگھم، ص: ۳۰۵)

صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ کو منافقین کا نام بنام علم تھا، مگر اس کے باوجود آپ نے کسی منافق کو کبھی کسی قسم کی سزا نہ دی، خواہ وہ لیڈر ہو یا کوئی اور، اس کی وجہ یہ امید اور توقع تھی کہ شاید وہ صحیح طریقہ پر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی صف اور جماعت میں شامل ہوجائیں، علاوہ ازیں آپ ﷺ کو ان سے قتال کرنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا تھا۔ رہی یہ آیت:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ﴾ (تحریم: ۹)

''اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔''

تو مفسرین کا خیال ہے کہ منافقین سے جہاد کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اسلام کی دعوت دی

جائے اور اس سلسلہ میں جس قدر بھی ممکن ہو کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے اگر رئیس المنافقین کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو غزوہ بنی المصطلق ❶ کے بعد خود ان کے صاحبزادے ہی انھیں رضا و رغبت سے قتل کر ڈالے ہوتے۔

## ہجرت

ہجرت کے وقت آپ کے گھر سے نکلنے کے بارے میں ارفنج نے لکھا ہے:

''واقعہ کے متعلق ایک محتمل روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) اپنے گھر کے پیچھے کی دیوار سے کود کر نکلے تھے، اور اترتے وقت ان کے خادم نے انھیں سہارا دیا تھا۔ اور آپ نے اس کی پشت سے سیڑھی کا کام لیا تھا۔'' (ص: ۱۱۸)

وہ آگے یہ بھی لکھتا ہے: ''ابھی آنحضرت (ﷺ) اور ان کے رفیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک گھوڑوں پر سوار ایک جماعت ان کے پاس آ گئی، جس کی قیادت سراقہ بن مالک کر رہے تھے۔'' (ص: ۱۱۹)

---

❶ یہ غزوہ ۵ھ میں غزوۂ خندق سے کچھ پہلے ہوا تھا، یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس غزوہ میں غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی شریک تھے، جو ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، عبداللہ بن ابی جو راس المنافقین تھا اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے، جب آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، بولے ارشاد ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دی جائے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا کرنا پسند کرتے ہو کہ محمد ﷺ اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔

عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ تھا، باپ جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا، یہ اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں لیکن اگر حکم ہو تو میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، آپ نے اطمینان دلایا کہ قتل کے بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔

حالانکہ سیرت کے عربی مآخذ میں اس روایت کا ذکر تک نہیں ہے، اس لیے یہ جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہے، سراقہ کے واقعہ میں بھی غلط بیانی کی گئی ہے۔ صحیح وثابت یہ ہے کہ وہ تعاقب میں تنہا اور پوشیدہ نکلے تھے۔'' ❶

## امّ المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا

ارنج کا بیان ہے کہ آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے اپنی دوسری بیویوں کی طرح محبت نہیں کرتے تھے، اور چند برس بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے اہمال اختیار کرلیا تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک قلبی معاملہ ہے، جس کا ادراک دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔ دوسرے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے واقعہ سے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت ومحبت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی اکیلی بیوی تھیں، ❷ ان کے نکاح کا واقعہ ابن کثیر وغیرہ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ خولہ بنت حکیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے والد کے پاس گئیں اور نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے کہا محمد شریف کفو ہیں لیکن

---

❶ سراقہ کے واقعہ کی تفصیل استیعاب ابن عبدالبر وغیرہ میں موجود ہے، ملاحظہ ہو آنحضرتؐ کے مکہ سے نکلنے کے بعد مشرکین نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد اور ابوبکر کو قتل کردے گا یا انھیں زندہ پکڑ لائے گا اس کو گراں قدر انعام دیا جائے گا، سراقہ اپنے قبیلہ بنی ربیع کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ میں نے بھی ساحل کی طرف سیاہی دیکھی ہے میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہیں سراقہ کو یقین ہوگیا لیکن انعام کی طمع میں انھوں نے تردید کی کہ نہیں وہ لوگ نہیں ہیں تم نے فلاں شخص کو دیکھا جو ابھی ہمارے سامنے گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سراقہ اٹھ کر گھر گئے اور لونڈی سے کہا کہ گھوڑا تیار کرکے انھیں ایک مقام پر دے اور نیزہ سنبھال کر چپکے سے گھر کی پشت سے نکلے۔ لونڈی سے گھوڑا لیا اور لوگوں کی نظر بچا کر نکل گئے اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنحضرت کے پاس پہنچ گئے۔

❷ چونکہ حضرت سودہ اور حضرت عائشہؓ کا نکاح قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لیے مؤرخین کا اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے اور اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے۔ عبداللہ بن محمد عقیل کا قول ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں تاہم اس قدر مسلم ہے کہ حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً ساڑھے تین برس تک میکہ ہی میں رہیں، اس بنا پر اس عرصہ میں عملاً حضرت سودا گویا آنحضرت کی تنہا بیوی تھیں۔

سودہ سے بھی تو دریافت کرو، خولہ نے کہا انھیں یہ پسند ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سودہ بوڑھی ہوگئیں تو انھوں نے اپنی باری مجھے دے دی۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی ایک عورت حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جن کے پہلے شوہر سے پانچ یا چھ بچیاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا مجھ سے تمھیں کیا مانع ہے؟ عرض کی اے اللہ کے رسول! آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں، میں آپ کی نہایت تعظیم وتکریم کرتی ہوں، یہی میرے لیے مانع ہے کہ آپ کے سر پر یہ بچیاں صبح وشام سوار رہیں گی۔ آپ نے فرمایا: کوئی اور مانع تو نہیں ہے؟ عرض کی نہیں خدا کی قسم اور کوئی مانع نہیں۔ ارشاد ہوا اللہ کی تم پر رحمت ہو، قریش کی نیک بخت عورتیں اپنے چھوٹے بچوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہوتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کا کتنا لحاظ اور خیال رکھتی ہیں۔'' (البدایہ والنہایہ، جلد۳، ص: ۱۳۲، ۱۳۳)

یہ واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے شادی کرنے کی رغبت بھی تھی اور شادی کے بعد آپ ان سے محبت بھی کرتے تھے، اور دوسری ازواج مطہرات کی طرح باریوں کی تقسیم میں ان سے مساوات بھی برتی تھی، مگر انھوں نے خود بطیب خاطر اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی تھی۔ ❶

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ

مارگولیتھ مدعی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے کوئی خط جزیرۂ عرب کے باہر کے بادشاہوں اور امرا کو نہیں لکھا۔ (تاریخ اسلام، جلد۱، ص ۱۵۷)

میور کہتے ہیں کہ

> ''آپ نے بعثت سے لے کر وفات تک عربوں کے سوا کسی اور ملک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔''

---

❶ حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت سودہ جب بوڑھی ہوگئیں تو ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلاق دے دیں اور وہ شرف صحبت سے محروم ہوجائیں، اس بنا پر انھوں نے اپنی باری خوشی خوشی حضرت عائشہ کو دے دی، اتنی سی بات کو مستشرقین نے افسانہ بنا دیا کہ آنحضرت کو اور بیویوں کی طرح ان سے محبت نہ تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عملاً اپنا تعلق ختم کرلیا تھا۔ نعوذ باللہ من ھفواتھم.

بروکلمن نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ کہتے ہیں: ''یہ ثابت کرنا آسان نہیں جب کہ نبی خود باور کرا رہے تھے کہ وہ عالمی پیغمبر ہیں اور انھیں ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی دعوت دی گئی ہے۔'' (تاریخ الشعوب الاسلامیہ، ج ۷، ص ۱۷)

قرآنِ مجید نے خود ہی بعثت نبوی ﷺ کی صحیح نوعیت اس طرح واضح کر دی ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سباء: ۲۸)

''ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔''

نیز:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

''ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر۔''

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت جابر کے واسطے سے آپ کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

اعطیت خمسا لم لعطهن لحد قبلی کان کل بنی یبعث الی قومه خاصة وبعثت الی کل احمر واسود.

(صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة)

''مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، ہر نبی خاص اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں ہر کالے گورے (ساری دنیا) کے لیے مبعوث ہوا۔''

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

فضلت علی الانبیاء بست اعطیت جوامع الکلم ونصرت بالرعب واحلت لی الغنائم وجعلت لی الارض طهورا و مسجدا وارسلت الی الخلق کافة وختم بي النبیون.

(صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة)

''مجھے دوسرے نبیوں پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی، مجھے جوامع الکلم عنایت

ہوئے اور رعب اور دھاک کے ذریعہ فتح ونصرت دی گئی اور مال غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا اور تمام روئے زمین میرے لیے پاک اور مسجد بنائی گئی اور میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی اور میری ذات پر انبیاء کا سلسلہ ختم ہوا۔''

## اسلامی فتوحات

ڈرمنگھم، سنت نبوی سے ناقص واقفیت کی بنا پر بہت سی حدیثوں کے منکر ہیں۔ اور انھیں خلفاء اور جنگی قائدوں کا اضافہ بتاتے ہیں، ان کی متابعت اور ہم نوائی کرنے والے وہ مستشرقین بھی بڑی تعداد میں ہیں جو آنحضرت ﷺ کو حدیثوں کی وجہ سے ہدف طعن بناتے ہیں اور خاص طور پر ان حدیثوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو مطعون بھی کرتے ہیں، اور ان کا انکار بھی کرتے ہیں۔ جن میں قیامت سے قبل کے واقعات کا ذکر ہے، یا اسلامی فتوحات کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے، جیسے وہ حدیثیں جن کی امام مسلم نے اپنی صحیح میں تخریج کی ہے۔

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

نصرت بالرعب وبينا انا نائم اتيت بمفتاح خزائن الارض فوضعت بين يدي قال ابوهريرة ...... فذهب رسول الله ﷺ وانتم تنتشلونها . (صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوة)

''میری رعب اور دھاک کے ذریعہ مدد کی گئی، خواب میں مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئیں اور وہ سب میرے آگے رکھ دی گئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا تو انتقال ہوگیا، مگر تم لوگ زمین کے خزانے نکال رہے ہو۔''

اسی طرح ایک حدیث میں فتح قسطنطنیہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اور بعض دوسری حدیثوں میں فارس وروم کی فتح اور دجال پر غلبہ کا ذکر ہے۔ مستشرقین کے نزدیک یہ سب حدیثیں درست نہیں جو ان کے قلت علم اور حدیث سے ناقص واقفیت کا نتیجہ ہے۔

## جہاد

ڈرمنگھم کے نزدیک جہاد کا حکم صرف نبی ﷺ کی زندگی تک کے لیے تھا، وہ آیات جہاد کو

عام نہیں مانتے۔

اس غلطی میں وہ سب مستشرقین شریک ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا اس کا مغربی استعمار نے اس ڈر سے کہ اسلام دنیا کو نیست ونابود کر دے گا، خوب پروپیگنڈا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی آیتیں دو طرح کی ہیں: ایک تو وہ ہیں جو مخصوص و متعین غزوات بدر، احد اور خندق وغیرہ کے رے میں نازل ہوئی ہیں۔ دوسری طرح کی آیات کا تعلق کسی خاص غزوہ سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دوام واستمرار کی شان پائی جاتی ہے۔ اس لیے وہ دائمی ہیں بلکہ متعین غزوات کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی علمائے تفسیر کا یہی خیال ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں لفظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا، اور خاص سبب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح جہاد اور اس کے فضائل سے متعلق حدیثیں بھی دائمی ہیں۔

ان دلائل وشواہد کی موجودگی میں کون ان مستشرقین کی باتوں کو باور کرے گا۔

## غزوۂ حنین

ڈر منگھم لکھتے ہیں: ''غزوۂ حنین کے خاتمہ کے بعد لوگ قیدی عورتوں پر پل پڑے۔'' یہ دعویٰ کتب سیر کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، تاریخ طبری اور سیرت ابن ہشام میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے امیرانِ جنگ اور مالِ غنیمت کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں۔'' (تاریخ طبری، جلد۳، ص:۸۱ وابن ہشام، جلد۲، ص۲۹۴)

ابن جریر طبری دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''آپ نے طائف کی روانگی کے وقت ہوازن کے اسیروں کے بارے میں حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں، ان کے کچھ آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا، ان کا ایک وفد خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا کہ اللہ کے رسول ہم لوگ مصیبت زدہ ہیں۔ ہم پر احسان کیجیے، ارشاد ہوا تمھاری اولاد اور تمھاری عورتیں تمھیں زیادہ محبوب ہیں، یا تمھارا مال واسباب؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے ...... پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اور بنی

عبدالمطلب کے حصہ میں جو کچھ تھا، واپس کردیا، اس طرح اور لوگوں نے بھی ان کی اولاد اور عورتوں کو واپس کردیا۔" (تاریخ طبری، جلد۳، ص۸۶)

ابن اثیر فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں اور مالِ غنیمت کو جعرانہ میں جمع کرنے کا حکم دیا اور ہذیل بن ورقا خزاعی کو ان کی نگرانی کے لیے مامور فرمایا۔"

(کامل ابن اثیر، ج:۲، ص:۳۶۶)

ان تصریحات سے تو یہ معلوم ہوا کہ غزوۂ حنین کے بعد قیدی عورتوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی، بلکہ ان کی مکمل حفاظت کے خیال سے انھیں جعرانہ جیسے دور دراز مقام پر رکھا گیا، اور ہذیل بن ورقا کو ان کی نگرانی سپرد کی گئی، پھر قبیلہ ہوازن کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کے قیدیوں کو واپس کردیا گیا، اس تمام جتن کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان پر دست درازی کی گئی۔

یہ اور اس طرح کی بیشمار غلطیاں مستشرقین بالقصد اس لیے کرتے ہیں کہ اسلام اور ہادی عظیم ﷺ کی ذات گرامی کو ہدف طعن وتشنیع بنائیں، انھیں مستشرقین کی فروگذاشتیں اور خطائیں کہہ کر ہم ان سے صرف نظر نہیں کرسکتے، ان کا مقصد تو شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔

## مقالات بحث وتحقیق میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بحث وتحقیق میں علمی نہج وطریقہ اختیار کرنے سے یکساں نتائج برآمد ہوتے ہیں ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بحث وتحقیق کرنے والے اپنے مطالعہ وتحقیق میں مثبت ومنفی، مدح وقدح اور حق وباطل دونوں ہی رخوں اور پہلوؤں کو اختیار کرلیں، مگر اس کے برخلاف مستشرقین کی بحث وتحقیق میں عموماً شدید اختلاف وتعارض بلکہ کبھی کبھی تو سخت تناقض بھی ہوتا ہے۔

اگر واقعتہً ان کی تحقیقات علمی اور معروضی اصول ونہج پر مبنی ہوتیں تو ہرگز یہ اختلاف وتعارض نہ ہوتا، بعض مسلمان مصنّفین نے اس تضاد وتعارض کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ محض مستشرقین کی

جہالت وحیرانی ہی کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کی تہہ میں ان کے یہ اغراض بھی کارفرما ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جاہل ثابت کرنا اور ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کا یہ تعارض وتضاد کبھی تو خود اپنی ہی تحقیق کے خلاف ہوتا ہے جیسے وہ کبھی ایک موضوع پر اظہار کرتے ہوئے کوئی چیز ثابت کرتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی نفی وتردید کر دیتے ہیں یا کسی مبحث کے سلسلہ میں ایک موقع پر جو رائے ظاہر کرتے ہیں، اسی بحث میں دوسرے موقع پر اس سے مختلف کوئی اور خیال پیش کر دیتے ہیں، مثلاً کبھی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی امیت (ناخواندہ ہونا) ثابت کرتے ہیں اور کبھی اس کی نفی وتردید کر دیتے ہیں، کبھی یہ تسلیم کرتے ہیں، کہ قرآن مجید وحی الٰہی ہے، پھر خود ہی اپنے اس خیال کو منہدم کر کے کہتے ہیں، کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے ذہن ودماغ کی اختراع ہے۔

مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کی دو نوعیتیں ہیں:

(۱)......خود اپنی ہی رائے وتحقیق سے انحراف واختلاف

(۲)......دوسرے مستشرقین سے ان کا اختلاف

## پہلی نوعیت

اس میں شبہ نہیں کہ ایک انصاف پسند محقق کے سامنے کبھی کبھی مختلف نقطہ ہائے نظر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں وہ علمی ومنطقی واصول ترجیح سے کام لے کر کسی ایک نقطہ نظر کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، علمائے محققین کسی خاص روایت وحدیث یا ثبوت وسند کی بنا پر پہلے کوئی رائے قائم کرتے ہیں، مگر جب اس سے زیادہ قوی اور مرجح کوئی صورت ان کے سامنے آجاتی ہے تو یہ پہلی رائے کو ترک کر دیتے ہیں، اجتہادی امور ومسائل میں یہ طریقہ ہمارے علماء کے یہاں بہت معروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء سے ایک ہی مسئلہ میں متعدد آراء واقوال منقول ہوتے ہیں اور ہر قول کی کوئی نہ کوئی دلیل وحجت ضرور ہوتی ہے، مگر آخر میں وہ زیادہ صحیح اور مرجح قول کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مستشرقین کے یہاں جو تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے، اسے نہ بحث تحقیق سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ معروضیت اور معقولیت سے کوئی تعلق، یہ سب کے سب یا اکثر اپنی پچھلی غلطیوں

اور اوہام سے رجوع کے باوجود ان کی تلافی پر قادر نہیں ہوتے۔

جرمن مستشرق نولدیکی کو مسلمان محققین اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ اس کی کتاب تاریخ القرآن میں قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ پر رکیک حملے کیے گئے ہیں، یہ دوسرے مستشرقین کا قابل اعتماد ماخذ ہے، حالانکہ یہ کتاب اس نے جوانی میں لکھی تھی، اس میں جن غلطیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے ان کے بارے میں معذرت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ''شباب کی بے پروائی اور غلطی کے، اثرات اسی وقت محو ہو سکتے ہیں جب گزشتہ تحریر پر مکمل نظر ثانی کی جائے یا نئے سرے سے ایسی کتابیں لکھی جائیں جو پرانی کتاب کے اثرات زائل کر دیں، کیونکہ پہلے جن مسائل کو میں صحیح سمجھتا تھا، بعد کی تحقیق سے وہ غیر صحیح ثابت ہوئے۔

سیرت نبوی ﷺ کے علاوہ دوسرے موضوعات ومباحث قرآن وحدیث اور عقائد وغیرہ میں بھی مستشرقین کے یہاں اس قدر تعارض اور تناقض ہے، جو حد شمار سے باہر ہے، اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں گولڈ زیہر کی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی کے صفحات ۱۲، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۱۰۷، ۴۸، ۵۹ اور ۹۶ پر خاص طور سے اس کی تحقیقی بے راہ روی نظر آتی ہے، اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر عبدالحلیم نجار نے اس کی نشاندہی کی ہے، اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے کتاب السنۃ ومکانتھا میں مستشرقین کے ساتھ اُن عرب علماء محققین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کو بھی نمایاں کیا ہے جو مستشرقین ہی کا انداز اور طریقہ بحث اختیار کیے ہوئے ہیں۔

خاص سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر مارگولیتھ نے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے نہایت نادر ونامانوس اور عجیب وغریب باتیں بھی لکھی ہیں اور یہ کذب وباطل کا مجموعہ بھی ہے اس کی ایک نہایت مضحکہ خیال یہ ہے کہ محمد (ﷺ) نے مصر کا سفر کیا تھا، کیونکہ اس کے بارے میں آپ نے جو کچھ بیان دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو مصر کے بارے میں واقفیت تھی، مگر یہی مصنف دوسرے مواقع پر تحریر کرتا ہے کہ آپ نے محض ملک شام کا سفر اپنے چچا کے ساتھ اپنی بیوی کا مال تجارت لے کر کیا تھا۔

فاضل مستشرق نولدیکی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ ''محمد'' کو یہ معلوم نہ تھا کہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، اگر انھوں نے وہاں کا واقعی سفر کیا ہوتا تو وہ اس بات کو ضرور جانتے کیونکہ یہ عام بات تو کسی بھی واقفیت رکھنے والے سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ ❶

یہی مارگولیتھ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے نام ونسب کے بارے میں بھی شک وشبہ ظاہر کرتے ہیں اور ایک جگہ تو اسے ایک تاریخی معما قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ آپ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے چچا کے لڑکے تھے۔

رینان کی رائے بھی آنحضرت ﷺ کے متعلق تعصب وعناد پر مبنی ہے، یہ ایک موقع پر آپ کو دھوکہ، فریب اور مکر وغیرہ کا حامل قرار دیتے ہیں اور دوسرے موقع پر آپ کی سچائی اور مصالحت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کی اسی تضاد بیانی کی وجہ سے ایک بڑے محقق بیکافیہ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ شخص واقعات ومسائل کو توڑ مروڑ کر ان کی ہیئت اور صورت ہی کو الٹ پلٹ دیتا ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے اس کے اندر خاص کد وعداوت بس گئی تھی۔''

دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ فرانسیسی استشراق اور مستشرقین کو بگاڑنے میں اس کی اسی قسم کے رویوں کا دخل ہے۔ ❷ گستاف دبون نے بھی رینان کے خطبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تردید کی ہے اور اس کے تناقض کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کے عجز و درماندگی کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف اس کے قریب ہی جو کچھ لکھتا ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، کبھی وہ عرب مؤرخین پر ایک الزام عائد کرتا ہے اور کبھی اس کی تردید کرتا ہے، مثلاً وہ عرب مؤرخین پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ تصنیف وتالیف، نقد وبحث اور تجزیہ وتحلیل میں عاجز وقاصر ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ وہ کتب سیر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی دقت وصحت کا اعتراف بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے۔

رباط یونیورسٹی کے استاد فلسفہ ڈاکٹر حکمت ہاشم نے رینان کے آراء کی مختلف پہلوؤں سے

---

❶ اسلام اور یورپ ص ۹۲۔ ❷ اسلام اور عربی ثقافت ص ۱۶۶۔

جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے۔

کولونیل باڈلے نے محمد ﷺ کی لائف پر کتاب الرسول تصنیف کی ہے، دوسرے مشرقی موضوعات پر بھی اس کی کتابیں ہیں، سیرت پر اپنی کتاب کا یہ نام اس نے اس لیے رکھا ہے کہ اذان میں آپ ﷺ کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے کسی کو دھوکہ نہ ہو کہ وہ بھی اسلام پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے، جس طرح مسلمان رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کو یکساں سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ اذان اور دوسرے شعائر مراسم ہی ایک دین سے دوسرے دین کے اختلاف کا باعث ہیں، البتہ وہ رسول اللہ ﷺ کی فضیلت وعظمت کا معترف ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے ان منکرین کی تردید میں نیک ہستی بھی ہے۔ جو آنحضرت ﷺ کے ناقد ہیں۔

عقاد نے اس کتاب کی فکری گمراہی، بے راہ روی اور تضاد بیانی وغیرہ کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ اس کی چوتھی فصل میں وحی کے متعلق نہایت گمراہ کن اور اس قدر متضاد باتیں لکھی گئی ہی جن کی ابتداء کا پتہ نہیں، اس میں آپ ﷺ کے عقیدہ کے متعلق یہ شک واعتراض عائد کیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ ﷺ کی بیوی اور خود آپ ﷺ بھی بت پرست تھے، اور اللہ کے ساتھ اس کے شرکا کی پرستش کرتے تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نے نسطوری راہب اور دوسرے لوگوں کا اثر قبول کیا تھا، اور آپ پر ایک اعصابی کیفیت طاری ہوتی تھی جو آپ کے افکار پر اثر انداز ہوتی تھی مگر اس کے بعد وہ اس کی تردید بھی کرتا ہے کہ یہ مرگی اور اعصابی بیماری نہ تھی۔

وحی کے معاملہ میں اس نے اس تناقض وتردید کا اظہار کیا ہے کہ وہ مرگی یا ملیریا کا نتیجہ ہو یا روحانی سفر کا فیض ہو، وحی کی کیفیت سے لے کر سورہ علق کی ابتدائی آیات کے نزول تک جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی قسم کا تردد وتذبذب پایا جاتا ہے، آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یا امی اور ناخواندہ تھے اس کی بحث میں بھی تردد اشتباہ اور تعارض پایا جاتا ہے۔

## دوسری قسم

اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن مستشرقین ہوں یا نرم پسند اور معتدل مستشرقین دونوں گروہوں کی

اکثر تحقیقات شکوک وشبہات اور کذب وافترا پر مشتمل ہوتی ہیں، باقی جو تحقیقات معقولیت وانصاف پسندی پر مبنی ہوتی ہیں، ان میں بھی کجی، بے راہ روی اور تعارض نمایاں ہوتا ہے۔

مستشرقین نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ مستحکم اختلاف اور قوی اعتراضات کا باعث بنے ہوئے ہیں، مختلف پہلوؤں سے مثبت اور علمی اسلوب ونہج پر جن مسائل کی باقاعدہ تحقیق وتنقیح ہو چکی ہے، انھیں بھی غرض پسند مستشرق اپنی کجی اور گمراہی سے ڈھا دینا چاہتے ہیں۔

ان کی ایک جماعت ضعیف بنیادوں پر کسی گڈمڈ رائے یا مطعون قول پر متفق ہو جاتی ہے اور اسے صحیح باور کر کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اس کی نشر واشاعت کرتی ہے، لیکن اصلی عربی ماخذ پر مبنی دوسری تحقیق، اس کو دلیل وبرہان سے غلط ثابت کر دیتی ہے۔

دراصل اختلاف رائے اور چیز ہے اور تحقیقی کجی، گمراہی اور بے راہ روی اور چیز ہے، اختلاف کی صورت میں اس کا امکان ہوتا ہے کہ بحث وتحقیق کرنے والا کسی مرجح رائے یا یقینی نتیجہ تک پہنچ جائے اور شک وتردید کے بندھن سے آزاد ہو کر خود اپنے تئیں صحیح فکر اور متوقع نتیجہ کی تلاش وتفتیش کرے لیکن تحقیقی گمراہی اور بے راہ روی میں نہ کوئی دلیل وسند ہوتی ہے، اور نہ اس سے فہم سلیم کا پتہ چلتا ہے جو کسی طالب حقیقت انسان کے اندر ہوتی ہے، تعارض کی اصل وبنیاد ہو تو اس میں تطبیق کی گنجائش ہوتی ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ بعض محدثین کسی وجہ سے ایک روایت کو ضعیف قرار دیتے ہوں اور دوسرے اسے صحیح مانتے ہوں کیونکہ ان کے نزدیک دلائل سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں گروہوں کے نزدیک نقد کے کچھ اصول اور قاعدے ہیں، ایسی صورت میں ظاہری تعارض کے رفع ہو جانے کا امکان ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسراء ومعراج روحانی ہوئی تھی، مگر دوسرے محققین کا استنباط یہ ہے کہ معراج روحانی کے ساتھ جسمانی بھی تھی ثبوت میں دونوں نصوص ودلائل پیش کرتے ہیں ایسے موقع پر غالب گمان یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تعارض رفع ہو جائیں۔

رہی تحقیقی بے راہ روی اور تضاد بیانی تو اس میں علمی ذمہ داری اور دیانت دارانہ بحث وتحقیق نہیں ہوتی اس لیے جدال وخصومت کی نوبت آ جاتی ہے، جس کا نتیجہ کینہ وکدورت کی شکل میں ظاہر

ہوتا ہے، اس میں نہ کوئی ممتاز حجت ودلیل ہوتی ہے جو دوسری حجت ودلیل پر غالب آجائے اور نہ روشن فکری موقف ہوتا ہے، جو دوسرے دقیق اور مبہم موقف کو واضح کردے، بلکہ پراگندہ رائے اور متضاد ومختلف اقوال ہوتے ہیں جو کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے۔

یہاں پہنچ کر بحث وتحقیق کرنے والے کے ذہن میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، کہ آخر دلیل کیا ہے؟ اس رائے کی علمی قدر وقیمت کیا ہے، اور اختلاف ونزاع کے موقع پر تطبیق کی کیا صورت ہوگی اور اس کے قریب وبعید، مقصود وغیر مقصود مدلولات کیا ہیں؟ مگر مستشرقین کے تعارض، تضاد اور بے راہ روی کے دائرہ میں یہ سب باتیں نہیں ہوتیں۔

یہاں ہم نے ایک پہلو کی وضاحت کی ہے، اس سے اختلاف رائے اور تحقیقی بے راہ روی تضاد بیانی نیز معروضی وعلمی مناقشہ اور جدال وتعصب پر مبنی مناقشہ کے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لیے اب مستشرقین کے باہمی تضاد اور بے راہ روی کی بعض صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔

## اسلامی تاریخ کے بارے میں بے راہ روی

ایک مستشرق بکر اسلامی تاریخ اور اس کے مؤلفین کی نسبت لکھتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے بارے میں عربوں کی کتابیں جھوٹ کا انبار اور غلطیوں سے پر ہیں، تاریخ کے مسائل اور واقعات کے زمانے کی ترتیب میں وہ خاص طور پر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں دوسرے مستشرق جین نے بھی یہ کہہ کر اس کی تائید کی ہے کہ تاریخ میں مہارت وکمال کا ایشیائی قوموں میں فقدان ہے کیونکہ وہ نقد وفلسفہ کے اصول وقوانین سے ناواقف ہیں۔

تعصب، عداوت اور کینہ سے بھرے ہوئے ان جانبدارانہ اقوال کے مقابلہ میں سید میلو اور براؤن کہتے ہیں کہ عربوں سے عمدہ اور بہتر تاریخ آج تک غیر عربوں نے نہیں لکھی۔ للیو نے بھی تاریخ نگاری عربوں کی دقت نظر اور باریک بینی کی شہادت دی ہے وہ لکھتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کے مختلف اصول اور طریقے وضع کیے ان کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ وہ سال بہ سال انھیں کا ذکر کرتے ہیں، دوسرے بقدر استطاعت سیاق کے اعتبار سے حوادث واقعات کی روایت کی جانب

اعتناء کرتے ہیں۔ ❶

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے عوامل، آپ کی نفسیات، بعثت سے قبل کے میلانات اور علالت و وفات کے اسباب کے بارے میں بھی اسی قسم کی بے سروپا باتیں کہی گئی ہیں، جنھیں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ ❷ ہم دو ہی باتوں کا ذکر پر اکتفا کریں گے۔

## بعثت سے قبل کے میلانات

ڈوذی کا بیان ہے کہ محمد (ﷺ) کا مزاج سوداوی تھا۔ آپ برابر خاموش رہتے تھے، تنہا طویل سیر وسیاحت سے آپ کو رغبت تھی، مکہ کی وحشت ناک گھاٹیوں کے اندر غور وفکر میں غرق رہتے تھے، ❸ پادری لامانس نے تمام حقائق کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، وہ اس کی تردید میں لکھتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے خلوت گزیں اور معتکف ہونے کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔ ❹

## رسول اللہ ﷺ کی بیماری اور وفات کے اسباب

لامانس نے اپنی اسلام دشمنی کے جذبات کو تسکین دینے کے لیے جو کچھ لکھا ہے اسے معقولیت، حقیقت اور تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، وہ کہتا ہے ''محمد کی شہوانیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، ان کا جسم مرغوب، اور لذیذ غذاؤں کی وجہ سے موٹا ہوگیا تھا، اعضا بے حس وحرکت ہوگئے تھے، اور سکتہ کی بیماری کی وجہ سے آپ خوفناک اور ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔

اس کے بالکل ہی برخلاف دوسرا مستشرق بیجیہ سفلہ لکھتا ہے کہ بعض دفعہ محمد (ﷺ) کے جسم پر بھوک کی وجہ سے شدید ضعف کے اثرات نمایاں رہتے تھے، لگاتار دو روز تک ہذیانی بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی۔

تیسرے مستشرق کلیمان ہیار نے ان دونوں کی تردید کی ہے، ان کا بیان ہے کہ محمد ﷺ کے پھیپھڑے میں سوزش اور جلن کے عوارض ظاہر ہوئے، اس بنا پر آپ ﷺ کے قویٰ نہایت تیزی

---

❶ اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۴۳۔ ❷ یورپ اور اسلام ص ۸۸ تا ۹۳۔

❸ اندلس کے مسلمان ۱ تا ۱۸۔ ❹ ملاحظہ ہو اس کی کتاب کیا محمد ﷺ سچے تھے۔ ص ۱۔

سے کمزور ہو گئے۔ ❶ پادری بارود کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو ایک یہودی عورت نے زہر کھلا دیا تھا اس کی وجہ سے آپ کی وفات ہو گئی۔ ❷

ڈاکٹر عبدالحلیم ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں اور جو کچھ گزرا ہے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد کیا ہم مستشرقین کے آراء پر اعتماد کر سکتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کے بے شمار اختلافات میں سے نہایت تھوڑے اختلافات ہی بیان کیے ہیں، ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایک مستشرق ہی دوسرے مستشرق کی بنیاد ڈھا دیتا اور اس کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔

## سیرت نبوی ﷺ سے متعلق بعض مسائل میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

لفظ محمد اور محمدیت کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں، بوڈلے کہتا ہے۔ ❸ لفظ محمد (Nammet) اصنام کے معنی میں مستعمل ہے اور اسی سے کلمہ (Mahomeric) مشتق ہے اور کلمہ (Mumery) مصدر کے طور پر مجون کے لیے اور بتوں کی پرستش کے لیے محمدیت (Mametry) آتا ہے، جون سلدن نے اس بیان پر نقد و تعقب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس تعریف و تشریح کے نتیجہ میں محمد اور محمدیت مبغوض اور ناپسندیدہ نام ہو گئے ہیں جب کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ترک یعنی مسلمانوں کے دین میں بتوں کی پرستش حرام ہے، بوڈلے نے محمدیت کی جو تعریف کی ہے اس کی تردید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ اور ان کے اتباع نے اپنے قائد کا مکمل احترام و توقیر کرنے کے باوجود کبھی محمدی یا محمدیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے بلکہ اس کو اختیار کرنے والوں کی تعبیر ہمیشہ لفظ مسلم سے کی جاتی ہے جس کے معنی اپنے آپ کو مشیت الٰہی کے حوالہ کرنے والے کے ہیں، پھر وہ آپ کے زہد کا تذکرہ کرتا ہے اور آپ کے دوسرے بشری اوصاف و کمالات نیز آپ کی قائدانہ پیغمبر خصوصیات کو گناتا ہے اور آخر میں آپ کی زندگی میں ہونے والی آپ کی کامیابی کو بیان کر کے کہتا ہے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ بیانات آپ کی شان سے کس قدر بعید ہیں۔

---

❶ ملاحظہ ہو جو مصنف کی کتاب تاریخ العرب ج ا ص ۱۸۱۔

❷ علامات محمد ماہی و ما فیمتہا ص ۱۷۱۔ ❸ ایضاً ص ۱۷۔

# منٹگمری واٹ کی کتاب
# محمد ﷺ ایٹ مکہ پر ایک نظر

از: سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن

ڈبلیو منٹگمری نے محمد ﷺ ایٹ مکہ، محمد ﷺ ایٹ مدینہ، محمد ﷺ دی اسٹیٹس مین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کر لی ہے، ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآنِ پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس دسمبر ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی، تو وہ بھی اس میں مدعو تھے، اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے، ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی، لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان کی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں، ان کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ ان ہی مستشرقین میں ہیں جو انتہائی زہریلی باتیں اپنے طاقتور اور ماہرانہ انداز میں کہہ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمد ایٹ مکہ کا وہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، نئے ایڈیشن سامنے نہ رہنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ہیں۔ لیکن پہلے ایڈیشن میں سب سے پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑی، اس میں زیادہ تر اہرنیس، رچرڈ بل، بوہل، کیتانی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام گولڈ زہیر، جسفری، کیمنس، نکلسن، نولدیکی، سیل اینڈ رہری، توری اور لہاوسن اور دسط وغیرہ کے نام ملے۔ بخاری کا ذکر ضرور ہے، لیکن اس سے مدد فرانسیسی ترجمہ سے لی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کو رچرڈ بل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے، زورقی کی کتاب اخبار مکہ کا سہارا جرمن اسکالر دستن منلڈ سے

لیا گیا ہے۔ ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہ ﷺ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور واقدی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے۔ مگر یورپی مصنفوں کی کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فضلاء نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے کہ اس میں حوالے معاصر ماخذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند اور وقیع بنایا جائے، ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے، پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے تحقیقی تحریر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان ہی کا سہارا لیا ہے، جن سے ان کی نیت کے کھوٹ کو مدد پہنچ سکتی ہے، اور پھر عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت بڑی حد تک گر جاتی ہے۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، کتاب المغازی از واقدی اور طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری کے حوالے مصنف نے ضرور دیے ہیں، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے، ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے مصنف بظاہر بے خبر معلوم ہوتے ہیں، ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی سمجھے جاتے ہیں، مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فن سیرت نگاری سے مختلف ہے۔ ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے ہیں، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے، تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے، محمد بن اسحاق ہی کی کتاب کو زیادہ منقح اور اضافہ کر کے ابن ہشام نے اپنی سیرت مرتب کی۔ لیکن ان پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ہیں، لیکن امام بخاری کے استاد ابن مدینی اور نسائی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں، ابو حاتم بھی کہتے ہیں، کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی

ہیں، کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلمہ عام ہو چکی ہے۔ محدثین کہتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اس لیے وہ اس کو کذاب کہتے ہیں۔ استاذی المحترم مولانا سیّد سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مؤرخین میں نہیں ہو سکتا۔ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رنالڈس کا حوالہ دیں ...... امام شافعی رحمہ اللہ نے اگرچہ اس سے روایت کی ہے مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے۔'' (مقالات سیّد سلیمان، جلد۲، ص ۱۱۸)

پھر واقدی کس طرح معتبر ہو سکتا ہے؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، جو روایتیں واقدی سے لی گئی ہیں، وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی ہیں کہ یہ ابن سعد میں درج ہیں۔

طبری کی تاریخ مستند ضرور ہے، لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے راویوں کے ذریعہ بیان کرتا ہے، جن میں بہت سے ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے۔

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلی رحمہ اللہ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو۔

(سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص: ۹۷)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید و تحقیق سے کام لینے اور کدو کاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ (ص: ۱۰۱)

مولانا شبلی رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس

کی وضاحت مختصر طریقہ پر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآنِ مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآنِ مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقرار اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے۔ سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلۂ علت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مولانا شبلی رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انھوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے، ڈبلیو، منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے۔

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں ...... کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے۔ اس زمانے کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔ خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ہیں۔

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہ ﷺ پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارسٹر، اردنگ،

اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی لیسی جانسٹن، مینیر یہ، اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں جنھوں نے آپ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے، اور ہونی بھی چاہیے۔ لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے۔ منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے قلم اٹھایا اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے کہ محمد کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی نقطہ نظر سے کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس لیے انھوں نے مؤرخ بن کر اس کتاب میں اس زمانے کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے، جو پہلے نہیں اٹھائے گئے۔ مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کیا ان کے پیشرو یورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں۔ اردنگ، میور اور مارگولیتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملے گا، جو مصنف نے اپنے ابتدائی باب میں لکھا ہے، انھوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چبا رہے ہیں، یا کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں، یا اسی کتاب میں کس حد تک وہ مؤرخ ہیں، کس حد تک عیسائیت کے خالص مبلغ اور حامی ہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اپنی کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر پہلے پہنچ گئے تھے، اسی کے مطابق اپنی تحقیق اور محنت کا صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر لیا، ان کا کیا مقصد ہے وہ آئندہ سطروں میں ظاہر ہوگا۔

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے، اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قرآن ریگستانی فضا میں نہیں بلکہ اعلیٰ تمول کی صورت میں نازل ہوا۔ (ص:۳)

لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ عرب کے باشندے بھوک سے عاجز ہو کر فتوحات کے لیے چل پڑے۔ (ص:۳)

یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کی مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مدد یا رکاوٹ پہنچی۔ اس کی وضاحت کے بغیر عہد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذکر چھیڑتے ہیں جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہوگیا ہے، مکہ کی سیاست کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں قریش کی دھڑا بندی، حلف الفضول، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی، ایرانی اور حبشہ کی حکومتوں کی للچائی نظر، اس پر ابرہہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی، جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی۔ (ص:۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقل مندانہ اور صبر آزما سیاست دانی اور حلم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حلم چمکتا نظر آتا ہے۔ (ص:۱۱) ان کی رائے ہے، کہ ان کی قبائلی کشمکش معمولی درجہ کی تھی جو مشترکہ مفاد ہی کی خاطر تھی۔ (ص:۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اس کا موازنہ ایتھنز کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایتھنس میں اخلاقی اصولوں اور ایمان داری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن مکہ کے لوگ اس کے لیے فکر مند رہتے کہ علمی مہارت سے ایک اچھا راہنما کیسے ابھر سکتا ہے۔ (ص:۱۰)

مکہ کی خارجہ پالیسی پر بھی بحث ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی بچھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بازنطینی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دلچسپی رہتی، یہ دلچسپی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی۔ بازنطینی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے۔ حبشہ بازنطینی حکومت کا دوست تھا۔ اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ہوتا تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے، تو ابرہہ نے مکہ پر حملہ کردیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے کہ ابرہہ کی نظر میں مکہ کی بڑھتی ہوئی نفع بخش تجارت کھٹکی، پھر اس کو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اہمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اس کی للچائی نظر پڑی۔ پھر اس تجزیہ سے

بھی محفوظ کیا ہے کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی کشاکش میں غیر جانبداری ہی کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب بازنطینی اور ایرانی طاقتیں برسرپیکار ہوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانبداری کی اہمیت بڑھ جاتی۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقم طراز ہیں کہ مفید معلومات کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ہی سے لکھی جارہی ہیں۔ جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں بھی ہوں گی، تو اس کی عام مرقع آرائی (Soin.) ہی نظر آتی ہے۔ (ص:۱۶) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ہوسکتا ہے، مولانا شبلی رحمہ اللہ نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ (سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص:۵۸)

مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے کہ ان کی کتاب میں عرب کے ایام جاہلیت کے تاریک اور داغدار پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندہی آسانی سے کردیں گے۔ لیکن ان کے قلم کی چابکدستی اسی میں نظر آتی ہے کہ یہ تارک اور داغدار پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفصیلات میں دب کر رہ گئے ہیں۔ اب تک مسلمانوں کے سامنے ایام جاہلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت ردّ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا، غزوات مذہبی لڑائیاں نہ تھیں بلکہ تجارتی برتری کی خاطر لڑی گئیں۔ وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں، مسلمان مؤرخین تو یہ بتاتے ہیں کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے تک عیش ونعمت کے سامان بہت کم تھے، اس زمانے میں گھروں میں جائے ضرور نہ تھے، چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا۔ بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرب کنکھجورا، گوہ اور گرگٹ اور

جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے۔ بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہیں تھی، قمار بازی شراب خواری اور زنا کاری کا رواج عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا۔ (سیرت النبی، جلد اوّل، ص: ۱۱۸۔ ۱۲۸)

مولانا شبلی رحمہ اللہ نے مستند حوالوں سے لکھا ہے کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے۔ ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا۔ اخنس بن شریق جو بنوزہرہ کا حلیف اور روسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا۔ نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے۔ (سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص: ۲۱۷۔ معارف مطبوعہ، مصر: ۵۵)

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک آفتابِ عالم تاب کی ضرورت تھی جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پوری ہوئی، لیکن ہمارے فاضل مصنف موجودہ دور کی سیاسی، اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مؤرخین جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ وہ سراسر غلط ہے عربوں میں قبائلی یک جہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے تو ان کا اعلیٰ ترین یونٹ بن جاتا۔ (ص: ۱۷)

ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بنا پر تھا، ان کی توجہ اقتصادیت تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ (ص: ۱۸) اور لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج، کمزوروں کے حامی، اور طاقت وروں کے خلاف سرکش ہوتے۔ (ص: ۲۰) ان میں فیاضی، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن، اور عزت زیادہ محبوب تھی جس کے لیے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح وغلط کی پروا نہیں کرتے تھے۔ (ص: ۲۱-۳۰)

یہ عرب (Arisloeracy اور Egalitarianism) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی۔

لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، وہی ان کا قائد بن جاتا۔ (ص:۲۳) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں، اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا، تو اس میں اور بڑائی پیدا ہوگئی۔ (ص:۲۳) یہ زور بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت وجلالت میں گویا ربانی پیامات والہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا۔ لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں۔

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ نولدیکی ولہاوسن، لیمنس اور بارٹین وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے، گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جستہ جستہ ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے۔ (ص:۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی۔ (ص:۲۳) اور محمد ﷺ کے زمانہ کے ایام جاہلیت میں مذہب کا اثر زیادہ نہ تھا۔ (ص:۲۳) وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے۔ (ص:۲۳) مگر اپنی تحریر کا رخ بدل کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے۔ بلکہ یزدان کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے، بدویوں (Nomsd) کو توران پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے۔ (ص:۲۳) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ عرب مکہ کے اردگرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکہ کے مقدس حلقہ کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی ساتھ لے گئے تھے، مگر وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ اس کا تعلق مذہب کے بجائے توہم پرستی سے تھا، وہ لات ومنات کا سرسری طور پر ذکر کر گئے ہیں لیکن اس زمانہ میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، صحیح بخاری (باب مکہ) میں ہے کہ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو بت تھے، ان میں سے اہم بتوں مثلاً لات، عزیٰ، منات، یغوث، یعقوق، نسر، ود، صواع اور ہبل کا ذکر تو قرآنِ پاک میں ہے۔ اس زمانہ کی

بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس چیز پر زور دیتے ہیں کہ ان کا اصل مذہب قبائلی طرز کی انسان دوستی (Humanatanionism) تھا۔ یعنی افراد تو فنا ہوتے رہیں گے، لیکن ان کا قبیلہ باقی رہے گا، اور اس کو رہنا چاہیے اور اس کی بقا کے لیے اس میں شریفانہ اوصاف باقی رہنا چاہیے، جو شریف النسل خون ہی سے ممکن ہے۔ (ص: ۲۵)

فاضل مؤلف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب خدا کے قائل رہے، طرز استدلال ہے کہ قرآن کی مشروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ہیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں، ان کا یہ یقین بہت کچھ مبہم اور گنجلک ہے۔ (ص: ۳۶) پھر معلوم نہیں کس حوالہ سے یہ لکھ گئے ہیں کہ قرآن میں سقر، القارعہ اور الحطمہ وغیرہ جیسے الفاظ بظاہر اس زمانے میں سمجھے نہیں گئے۔ لفظ بظاہر بتا رہا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر خود ان کو یقین نہیں، پھر لکھتے ہیں کہ سورۂ قریش سے یہ گمان (Suggesi) ہوتا ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ہی کی پرستش کر رہے تھے۔ پھر یکا یک یہ کہہ جاتے ہیں کہ خدا کے لیے عربی لفظ اللہ ال الٰہ کا مخفف ہے جس کے لیے یونانی لفظ (Hotheos) کی طرح دیوتا (God) کے ہیں۔ لیکن عام طور سے اس سے خدا ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ محمد ﷺ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب (Pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ہی کو لیتے۔ اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا ال لات کہلاتا۔ مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ہوا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے، تو پھر اس کے گنجلک ہونے کے مواقع عظیم ہو جاتے ہیں، اس لیے اغلب یہ ہے۔ کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے، لیکن ان کا یہ خیال بھی رہا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں، جس کی بنیاد پر وہ اس کو ردّ کر دیں۔ ان سطروں سے ظاہر ہے کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا تخیل گنجلک سا تھا۔ لیکن ہمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے تو لکھ جاتے ہیں کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رہا ہوگا۔ ان سے تال میل کس کس طرح رہا۔ اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ مکہ میں عیسائی تھے، ان میں تاجر اور غلام بھی تھے، لیکن ان

کے اثرات اہم نہ تھے۔ (ص:۲۷) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب وغریب خیالات بھی تھے، جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے جو جعلی عیسون عقائد (Gospel) سے حاصل کر کے عرب میں رائج کر دیے گئے تھے۔ قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے تصور پر تنقید، یقیناً ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے جو یہ خیال رکھتے تھے۔ پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاں تک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے، یہ ان کو مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوئے، بلکہ مختلف قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے، مصنف کا یہ بھی احتمال ہے کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا گو یہ بہت قلیل رہا ہوگا۔ وہاں ایسے جھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے جن پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا۔ ایسے فرقے صابئین کے تھے۔ اس زمانے میں لفظ حنیف کا کچھ استعمال ہوا تو اس کی بھی ایسی ہی ممکن تعبیر ہے۔ لیکن ان تمام احتمالات کا اشہب دوڑانے کے بعد مصنف یکا یک یہ لکھ جاتے ہیں:

> ''میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے۔ مثلاً عثمان بن الحویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے مکہ کا تنہا فرماں روا ہو جائے۔'' (ص:۲۸)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں کہ حنفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہبی ماحول تھا، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے، جو ایک خلا محسوس کر رہے تھے اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہش مند تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے یہودی وعیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا۔ اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انھوں نے تقدیر یا دہر کے پرانے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا۔ عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک جاگزیں تھا کہ وہ اپنے

تو جہی مراسم کو بھی خدا کے احکام ہی سے منسوب کر دیتے تھے۔ مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ مکہ سے ابرہہ کی مراجعت کی پرانی تعبیر قرآن سے پہلے کی ہوسکتی ہے، اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام تھے۔ غالباً قرآن سے پہلے کا تھا، اور یہودیت اور عیسائیت کے تخیل نبوت سے لیا گیا ہے۔ یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ محمد سے پہلے مسیلمہ نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا اس سے ظاہر ہے کہ نبوت کا خیال وہاں جڑ پکڑ چکا تھا۔ (ص:٣٩)

معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ یہ تو اسلام کی ہر معمولی تاریخ سے معلوم ہوسکے گا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن آپ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کی آواز اُبھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی اور وہ وحشی بن حرب کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی خامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کی سیرت کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں۔ کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی تفصیلات متنازعہ فیہ ہیں، لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ہوا میں محمد ﷺ کے پاس قرآن آنے سے پہلے تھیں اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپ کے مشن کے ماحول کا جز ہوگیا۔ (ص:٢٩) اپنے قلم کی چابکدستی ظاہر کی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے۔ لیکن اس میں ان کے یقنیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بیجا معلومات کو زیادہ دخل ہے، وہ بظاہر "غالباً اندازہ کیا جاتا ہے، ہوگا، رہا ہوگا، شاید اور خیال ہے۔ احتمال ہے" وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کا سمجھنا آسان نہیں، وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے پہلے عرب کے لوگ کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے۔ ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل وحدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا۔ لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں۔

قرآنِ مجید میں وہی سب کچھ ہے جو توارۃ اور انجیل میں ہے۔ انجیل میں بھی وہی سب کچھ تھا، جو توریت میں تھا، قرآنِ مجید میں ہے۔

''پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا، خود ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں راہنمائی اور روشنی تھی، اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا۔ اس کی تصدیق کرنے والی تھی۔ خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں پھر اے نبی ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں جو اس کے آگے موجود ہے، اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ ونگہبان ہے۔'' (المائدہ: ۱۵ رکوع)

پھر بہت صاف صاف قرآنِ مجید ہی میں ہے:

''جو کچھ قرآن میں بیان کیا جارہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں ان ہی کی تصدیق ہے۔'' (سورہ الرعد، رکوع:۱۱)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآنِ مجید میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ۝﴾

''اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں کہ اجی یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ

بھی سمیٹیں، جنھیں بر بنائے جہالت گمراہ کررہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر پر لے رہے ہیں۔'' (النحل، رکوع:۳)

قرآنِ مجید میں یہ بھی ہے کہ

''دوسری طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمھارے ربّ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتری ہے، اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔'' (النحل، رکوع:۴)

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے۔

اصلی یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا جو تصور تھا وہ ضرور اسلام میں آیا۔ اصل توریت اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں۔ اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو جو تمھارے یہاں بھی وہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (آلِ عمران: ٦٣)

''کہہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں۔''

مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے:

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ توریت اور انجیل میں ہے، مثلاً یہود

کہتے ہیں، کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں، اور نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم تینوں ایک ہیں، اسے تین مت کہو ایک کہو، اصل انجیل میں حضرت عیسیٰ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود ونصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر احبار ورہبان کو بھی اپنا ربّ بنا رکھا تھا۔ قرآنِ مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ بِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (توبہ: ۳۰-۳۲)

''یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ بے حقیقت باتیں ہیں، جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دیکھی، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جس اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین ﷺ کے ذریعہ سے اپنے آخری صحیفہ آسمانی میں یاد دلا دیا، اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا نہیں یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی یا ان سے

حاصل کی ہوئی باتوں کو قرآنِ مجید میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی، اس کو رد کر کے اس کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے، جس کو چھیڑ کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے، چاہے اس پر جتنی بحث کی جائے، مسلمان عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ عربی لفظ ہے اور عربی کے الٰہ سے مشتق ہے۔ اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الاہیا یا عبرانی کے الوہ سے مشتق ہے۔ اور یہ تسلیم کہ قرآن سے پہلے جاہلی شعراء کے یہاں یہ لفظ ملے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کلدانی، سریانی، عبرانی بولنے والوں اور جاہلی شاعروں کے یہاں اور قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے۔ اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام جاہلیت میں توحید تھی، تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے کہ اس زمانے میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی۔ (ص:۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی۔ (ص:۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں، اسی طرح وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی۔ (ص:۲۸) وغیرہ وغیرہ۔ ایام جاہلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے اور کچھ تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے، لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ مقصد رہا کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الٰہ) ہیں۔ اس کے کچھ شریک بھی ہیں، اس میں اور جنوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں وغیرہ۔ اسی لیے ایم اے میور کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ اس زمانے میں بت پرستی اور بنواسمٰعیل کے بیہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آ کر ٹکراتی تھی۔ (دیباچہ Xcv11)

قرآنِ مجید نے ایسے تمام باطل عقائد اور توہمات کی تردید کی، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت، وحدانیت، مشیت، وسعت، قدرت، رحمت، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی جو موجودہ توریت اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی جس کو قرآنِ مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کر کے نکھار دیا۔ واضح رہے کہ جس زمانے میں وحی الٰہی آئی اس نے خدا پرستی میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی، پرانی ہی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی۔ اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعہ کے ذریعہ جس رنگ میں چاہیں پیش کریں، مگر

حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی۔

خود قرآنِ مجید میں ہے:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ﴾ (حم السجدہ: ۴۳)

''اے نبی تم کو جو کچھ کہا جارہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزر ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو، بے شک تمھارا رب بڑا اور درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔''

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ تمام سچے مذاہب درحقیقت ایک ہی ہیں، ایک ہی پیغام ہے جو آدم سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک سنایا جاتا رہا، میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون ''رسول وحدت'' میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآنِ مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں۔ دین اور شریعت جس کو منسلک اور منہاج بھی کہتے ہیں، دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاہب حق کا اتفاق ہے۔ مثلاً خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاء علیہم السلام کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا وسزا، یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، اس کو لے کر اوّل سے آخر تک تمام انبیاء علیہم السلام آئے، اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں، نہ قوم وملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی، اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے، یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں، اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہوگیا ہے، دوسری چیز یعنی شرعہ منہاج اور منسلک وہ جزئیات احکام ہیں جو ہر قوم ومذہب کی زمانی ومکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً عبادت الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہی عبادت کی سمتیں الگ الگ ہیں۔ اعمال فاسد کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں۔ اب قرآن کے نقطہ نظر سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی

صداقت ہے۔ ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے، البتہ متفقہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہتے ہیں، دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں، اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اُسی وقت بھیجا گیا ہے جب پہلا صحیفہ کھو گیا ہے، یا ذہنی تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہوگئی ہے۔ حضرت ابراہیم کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ پر تورات نازل ہوئی اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، جو عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور جب اس میں انسانی اختراعات کا دخل ہوگیا تو قرآن اترا۔

باب:۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد کو مکہ میں اہمیت حاصل تھی کہ نہیں۔ ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے وہی اس باب میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے متعلق کچھ نہ کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے اپنے خاص سلسلۂ معلومات سے پھر کام لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ اباً عن جد معزز اور ممتاز چلا آتا تھا لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا۔ اس زمانہ میں حرم کے متولی علیل خزاعی تھے۔ قصی نے علیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی۔ اس تعلق سے علیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی

جائے۔ اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا۔ قصی نے ایک دارالمشورہ قائم کیا جس کا نام دارالندوہ رکھا۔ قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے۔ قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے۔ مثلاً سقایہ اور رفادہ جو خدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا۔ تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایامِ حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے۔ مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے۔ قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ہی کو ملا۔ علامہ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کی آس پاس بسایا، اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں۔ قصی کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھلے بیٹے عبد مناف نے حاصل کی اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاندان ہوا۔ قصی کے دوسرے بیٹے آنحضرت ﷺ کے پردادا اور ہاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کے لیے سقایہ اور رفادہ کی خدمت سپرد ہوئی۔ انھوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا۔ حجاج کو سیر چشمی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے۔ تجارت کو نہایت ترقی دی۔ روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا۔ جس سے قریش کے قافلہ تجارت کی عزت بڑھی۔ عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کر کے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔ ایک دفعہ قحط پڑا تو ہاشم نے شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اسی لیے وہ ہاشم کے نام سے مشہور ہو گئے۔

(سیرۃ النبی، جلد اول، ص: ۱۶۵۔۱۶۶)

مگر ہمارے مصنف نے ان کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی، تجارت سے بڑے منافع حاصل ہو رہے تھے، اس لیے یہ کام ہاشم کے حوالے

کر دیا گیا تھا۔ (ص:۳۰)

وہ رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے چاہِ زمزم کی کھدائی کر کے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کی ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت ہے اور خانہ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے، لیکن اس اعتراف کے باوجود یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے مگر کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ہو سکا کہ حجاج کو پانی فراہم کرنے کا حق ان ہی کو تھا، پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں کہ ان کی لڑکیوں کی شادی مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ہوئی، یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ جب کہ مکہ پر ابرہہ کا حملہ ہوا تو وہی صلح وصفائی کے لیے بھیجے گئے۔ اس کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے۔ کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے پھر لکھتے ہیں کہ ان کے ملنے کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن جب ابرہہ کی مراجعت ہوئی تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی ہوگئی۔ پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ ابرہہ سے ملنے کے بعد عبدالمطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہوگئی۔ لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکے کہ ابرہہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کا حال برا ہو رہا تھا۔ اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماہر ہیں۔

مصنف نے عبدالمطلب کی اہمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے پیش رو سوانح نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چاہِ زمزم کی کھدائی عبدالمطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی اور دوسرے کنوئیں چھوڑ دیئے گئے اور سب اس کی طرف مائل ہوئے۔ عبدالمطلب اس سے تمام زائرین کو پانی مہیا کرتے اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ہوگئے۔ ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی، ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا اور وہ مکہ کے سردار بن گئے۔ ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک رہی۔ میور نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیہ کے قبیلہ کو عبدالمطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ہوا تو اس کے لڑکے حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبدالمطلب کو چیلنج دیا، لیکن ایک

قریشی نے ثالث بن کر عبدالمطلب کی برتری کا فیصلہ دیا، جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا۔ اسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں رشک وحسد پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ عبدالمطلب کے اقتدار اور طاقت میں اس وقت بھی اضافہ ہوا، جب انھوں نے مکہ کے بنوخزاعہ سے باہمی اعتماد کا معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا، اور جب ابرہہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب ہی کو اور سرداروں کے ساتھ ابرہہ کے پاس بھیجا۔ ابرہہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے دوسو اونٹ پکڑ کر ضبط کر لیے تھے۔ عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے تو اس نے ان کی بڑی عزت کی۔ اس لیے ان کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا کہ وہ کعبہ کے معدوم کرنے میں مدد دیں۔ عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی، بات آگے نہیں بڑھی۔ عبدالمطلب مکہ واپس آئے اپنے لوگوں کو تو پہاڑیوں کی طرف چلے جانے کو کہا، لیکن کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر دعا کی کہ اے اللہ اپنے گھر کو بچا لے اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر۔ اس کے بعد ابرہہ کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ہوئی تو سمندر میں غرقاب ہوگئی، اور ابرہہ بھی سنانی پہنچتے ہی مر گیا۔

(دی لائف آف محمد، دیباچہ CXV11)

میور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اہم ترین، معزز ترین اور متمول ترین سرداروں میں تھے، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ہونے کی روایت مشکوک ہے۔ کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے، پھر وہ یہ کہتے ہیں، کہ عبدالمطلب ابرہہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں ملے، بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور ابرہہ سے جا کر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مؤرخ کے شایانِ شان نہیں، بہرحال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے، اس کا اندازہ لگانے کے بجائے یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ یورپی اہل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے لکھ کر ناظرین کو متاثر کریں، ڈی لیسی جانسٹن نے اپنا زور قلم یہ لکھ کر دکھایا ہے کہ زمزم کی کھدائی کے بعد عبدالمطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ

بڑھ گیا تھا۔ اور جو فضیلت قصی کو حاصل تھی، وہ ان کو حاصل ہوگئی، اوران کی شہرت بڑی بلندی پر اس وقت پہنچی جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا۔ لیکن وبا سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اترا۔ (ص:۳۹،۴۹)

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج:۱ص:۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلی رحمہ اللہ نے یہ لکھی ہے، کہ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھر برباد کردیئے تھے، قتل وسفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا اور خاندان کے سرکردہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ ان ہاشم زہرہ اور یتیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ آنحضرت ﷺ اس معاہدہ میں شریک تھے، اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں حاضر ہوں۔ (سیرۃ النبی، ج:۱ص:۱۸۳)

اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کردیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے لکھتے ہیں:

> ''کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبدالمطلب کے سپرد کردی گئی، یہ فجار اور حلف الفضول کا زمانہ تھا، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ تھا، اس میں نمایاں حصہ عبداللہ بن جدعان نے لیا، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا، وہ فجار کی جنگ کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا۔'' (ص۴۲)

اوپر کی سطروں میں تو یہ لکھ گئے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باہمی معاہدہ تھا، لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمد پندرہ اور بیس کی عمر کے درمیان تھے، اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا، وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بھی کی، اس معاہدہ کا

مقصد نسبتاً مضبوط تر اور متمول تر قبیلوں کی بدعنوانیوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقصد سے بہت قریب تھا۔" (ص:۳۳)

مولانا شبلی رحمہ اللہ کے بیان سے تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ اختراع کیا، کہ یہ معاہدہ مضبوط اور متمول قبیلوں کے خلاف کمزور قبیلوں کی طرف سے تھا، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے۔

زبیر بن عبدالمطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، وہ ابو طالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے، وہ لکھتے ہیں کہ ابوطالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ (ص:۳۲) لیکن مولانا شبلی رحمہ اللہ کی تحقیق ہے کہ عبدالمطلب کی مسند ریاست پر حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

(سیرۃ النبی ۸، ج:۱، ص:۱۷۶۔۱۷۷)

ابوطالب برابر تجارت کرتے رہے، لیکن مصنف کا بیان ہے کہ ان کی غربت کی وجہ سے محمد ان کے لڑکے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے، یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوگئی تھی کہ ابوطالب میں نمایاں خوبیاں نہ تھیں، پھر عبدالمطلب کی وفات سے پہلے اس قبیلہ کا زوال بھی شروع ہوگیا۔ (ص:۳۲)

رسول اللہ ﷺ کے والد بزرگوار کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاید محمد کی پیدائش سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ (ص:۳۲) اور محمد کی پیدائش شاید ان کے والد کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ص:۳۳) مصنف نے اس تحریر میں "شاید" لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، کیونکہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہوگئی تھی، میور نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات محمد کی پیدائش سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ (باب اوّل، ص:۴) مارگولیتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ یقینی ہے کہ مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہوگئی۔ (ص:۴۵)

رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر گھٹانے

کی کوشش کی، پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے کہ محمد ﷺ کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک زمانے میں آگے آگے تھا، لیکن محمد کے مشن کے آغاز سے پہلے یہ زوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے۔ (ص:۳۳) مصنف کا سخن تکیہ شاید اور غالبًا ہے، اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ شاید اور غالبًا جیسے الفاظ سچی مؤرخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے۔

مصنف نے رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۰ء لکھی ہے، اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے۔ میور نے یہی تاریخ لکھی ہے۔ مارگولیتھ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، اردنگ نے ۵۶۱ء کی تاریخ لکھی ہے۔ (ص:۳۴) مولانا شبلی نے ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول بہ روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء لکھی ہے۔ اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے۔ (سیرت النبی، ص:۱۷۱)

رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج ہیں، ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے، جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں، جو دینی انداز کے ہیں، مگر ایک سیکولر مؤرخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر محمد کی آئندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا، اور نہ ان کی کوئی سند ہے، اس کے بعد اپنی تحریر کا رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ان کے لیے سچے ہیں، اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیباچہ ہے۔ اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لے کر لکھتے ہیں، کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے، اور مثال میں ابن اسحٰق کی کتاب سے وہ سارے قصے چار صفحے میں نقل کر دیے گئے ہیں، جو آپ کے ایامِ رضاعت سے سفر شام تک بیان کیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

''حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں، تو ان کو اتنا دودھ ہونے

لگا کہ آپ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر دودھ پینے لگا، اور وہ جب مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں، تو ان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا، اور اسی طرح برابر دیتی رہی، اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی، اور جس چراگاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی وہ بہت شاداب رہنے لگی، پھر اس میں آپ کے شق صدر کی تفصیل بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپ جب پیٹ میں تھے، تو ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس نے بصرہ کے محل کو منور کر دیا، پھر اس میں حضرت ابوطالب کے ساتھ آپ کے سفر شام کا ذکر ہے جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے آپ کی نبوت کی بشارت دی اور بہت سی نصیحتیں کیں۔"

ابن اسحاق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کی رضاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلی نے بالکل ردّ کر دیا ہے۔ اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ہے، انھوں نے شق صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ سر سیّد احمد خاں نے اپنے خطبات احمدیہ میں اس کی پر زور تردید کی۔ اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں، وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت وانجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں۔ اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے۔ اور اس خیال خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں کو ناقابل خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن وتشنیع کی ہے، حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔ کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات واحادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کو یوں ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے لیے کافی

ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں۔ ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے، یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں، صحت سے بہت دور ہیں۔ بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ اور بیہودہ افسانے خیال کرتے ہیں جو محض جہلا کو خوش کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ پس عیسائی مؤرخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ، ص: ۶۶۴، ۶۶۵)

سرسیّد نے یہ بات آج سے ۱۲۲ برس پہلے لکھی تھی، مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگمری واٹ بھی شامل ہیں، دوسروں کی کب سنتے ہیں، وہ تو اپنی سی کہنا جانتے ہیں، اسی طرح بحیرا کی ملاقات کی روایت کو مولانا شبلی رحمہ اللہ نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

سرولیم میور، ڈریپر اور مارگیولس وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے، اسی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ بحیرا کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا، حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات کی روایت ہی بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ اس کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں۔ راوی اوّل واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

(سیرۃ النبی، ج:۱، ص:۸۰)

منٹگمری واٹ نے ابن اسحٰق کی ان روایتوں کو یکجا کر کے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے، تو ان کی یہ تحقیق سعی نامشکور ہے، اور ان کو نقل کر کے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے، تو مسلمان محققین کب ان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جو ان کی تضحیک سے وہ متاثر ہو جائیں گے، یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے مستند اور صحیح سمجھتے ہیں کہ یہ ابن اسحٰق کی روایتیں ہیں، تو پھر ابن اسحٰق کی اگر ہر روایت اور ہر رائے صحیح ہے تو ابن ہشام اور واقدی رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآنِ مجید کے کلام الٰہی ہونے کے بھی قائل اور دعویٰ دار ہیں، پھر منٹگمری واٹ کو رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآنِ مجید کے الہامی

کلام ہونے کا قائل اسی طرح ہونا چاہیے۔ جس طرح ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی ہیں، یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ ان کی جو رائے مصنف کی مطلب برآری کے لیے ہو تو وہ زوروں سے اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس کی تھی جب کہ آپؐ پچیس برس کے تھے۔ مصنف نے یہ لکھ کر نیش زنی کی ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر بتانے میں شاید مبالغہ کیا گیا ہے۔ شاید یہ لکھ کر اپنے ظنیات کا ثبوت تو ضرور دے دیا ہے اور اس طرح وہ اپنی ذمہ داری سے بھی ماہرانہ طور پر برأت کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ عمر بتانے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، تو اس کی کوئی سند نہیں پیش کرتے۔ بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہ کے آٹھ اولاد ہوئی، اور اگر ہر سال ہوتی رہی تو آخری اولاد ان کے ۴۸ ویں سن میں ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن بات نہیں، لیکن اس پر کافی رائے زنی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کو اعجاز پر محمول کیا گیا ہو، لیکن ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں پھر ہمارے مصنف کو رائے زنی کر کے چھیڑ خانی کی کیا ضرورت تھی۔ اسی طرح محض قیاس کر کے یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اتنی دولت مند نہیں رہی ہوں گی، جتنی کہ کہا جاتا ہے اور پھر ان کے قیاسات پر مبنی ان کے استدلال کا یہ رنگ ہے کہ خیال ہے کہ محمد کے پاس بھی کافی سرمایہ ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ تجارت میں معتدلانہ انداز میں حصہ لیتے رہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے کہ وہ شام پھر نہیں گئے، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ شام نہیں گئے یا یہ ممکن ہے کہ اپنی تجارت کی نگرانی دوسروں کے ذمہ کر دی ہوگی۔ اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ تاجروں کے اندرونی حلقہ اور اس سودمند کاروبار سے بدر کر دیے گئے۔ لیکن یہ بھی سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ بالکل بدر کر دیے گئے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی لڑکی زینب رضی اللہ عنہا کی شادی عبد شمس کے قبیلہ کے ایک رکن سے کی، جو خدیجہ کے بھتیجے تھے ان کی دو لڑکیاں ابولہب کے لڑکوں سے منسوب تھیں، یہ اس لیے کہ ابولہب کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ شاید وہ بنو ہاشم کے مستقبل کا آدمی ہو، اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد کو بھی قبیلہ کے ہونہار نوجوانوں میں تصور کیا جانے لگا تھا۔ ان قیاسات اور ظنیات کے مجموعوں سے مصنف کے تحقیقی رنگ کا اندازہ کیا

جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی اس کے متعلق بھی مصنف نے عجیب وغریب بحث چھیڑ دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وحی سے متعلق مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے وہ بخاری شریف کی اس حدیث سے ظاہر ہوگا کہ عبداللہ بن یوسف، مالک، ہشام بن عروہ کی ام المومنین سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے، اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور جب میں اسے یاد کر لیتا ہوں جو اس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دور ہو جاتی ہے۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے پاس آتا ہے، اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اسے میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا پھر جب وحی موقوف ہو جاتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا۔ (کتاب الوحی، باب)

اسی کے بعد اس پہلی وحی کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اس پوری حدیث کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

> ''یحییٰ بن بکیر، لیث عقیل ابن شہاب، عروہ بن زبیر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سب سے پہلے وحی جو رسول اللہ ﷺ پر اترنا شروع ہوئی وہ اچھے خواب تھے، جو بحالت خواب آپ دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ پھر تنہائی سے آپ کو محبت ہونے لگی۔ اور غار حرا میں تنہا رہنے لگے، اور قبل اس کے کہ گھر والوں کے ہاں آنے کا شوق ہو، وہاں تحنث کیا کرتے، تحنث سے مراد کئی رات عبادت کرنی ہے اور اس کے لیے توشہ لیتے یہاں تک کہ جب وہ غار حرا میں تھے، حق آیا۔ چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور کہا پڑھ، آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتہ نے پکڑا اور مجھے زور سے دبایا، یہاں تک کہ مجھے تکلیف

محسوس ہوئی۔ پھر مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا پڑھ میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھ:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ رسول اللہ ﷺ نے اس کو دہرایا۔ اس حال میں کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ چنانچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد کے پاس آئے اور دوبار فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو تو لوگوں نے کمبل اوڑھا دیا۔ یہاں تک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سارا واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں، محتاجوں کے لیے کماتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس گئیں جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ایامِ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے، اور عبرانی کتاب لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، جس قدر اللہ چاہتا۔ وہ نابینا اور بوڑھے ہو گئے تھے، ان سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا اے میرے چچا زاد بھائی اپنے بھتیجے کی بات سنو، آپ سے ورقہ نے کہا اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، تو جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تھا، بیان کر دیا۔ ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہی وہ ناموس ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت تک زندہ رہتا، جب تمہاری قوم تمہیں نکال دے گی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے، ورقہ نے فرمایا ہاں جو چیز تو لے کر آیا ہے اس طرح کی چیز جو بھی لے کر آیا اس سے دشمنی کی گئی، اگر میں تیرا زمانہ پاؤں تو میں تیری پوری مدد کروں گا۔ پھر زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی کا آنا کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا۔"

ابن شہاب نے کہا مجھ سے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ جابر بن عبداللہ انصاری وحی کے رکنے کی حدیث بیان کر رہے تھے، تو اس حدیث میں بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ بیان فرما رہے تھے کہ ایک بار میں جا رہا تھا، تو آسمان سے ایک آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، آسمان وزمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ پر رعب طاری ہوگیا اور واپس لوٹ کر میں نے کہا مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَٱلرُّجْزَ فَٱهْجُرْ ۝﴾ (المدثر: ۱ تا ۵)

''اے (محمد ﷺ!) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو، اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو۔''

پھر وحی کا سلسلہ گرم ہوگیا، اور لگاتار آنے لگی۔ (بخاری شریف باب اوّل)

بخاری شریف کے اس باب میں یہ حدیث یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ کتاب التعبیر میں بھی یہی حدیث نقل کی ہے۔ جس کے آخر میں کچھ فرق واضافہ ہے، اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''پھر زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا، اور وحی کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے منقطع ہوگیا۔ (امام زہری فرماتے ہیں) جیسا کہ حدیثوں سے ہم کو معلوم ہوا ہے، وحی کا سلسلہ رک جانے سے رسول اللہ ﷺ اس قدر غمگین اور رنجیدہ ہوئے کہ کئی مرتبہ آپ صبح کو اس ارادہ سے پہاڑوں پر گئے کہ اپنے آپ کو ان کی چوٹی سے گرا دیں، جب آپ کسی چوٹی پر پہنچتے تاکہ اپنے آپ کو نیچے گرائیں تو حضرت جبریل ظاہر ہوتے اور فرماتے اے محمد بلاشبہ آپ خدا کے برحق رسول ہیں، یہ سن کر آپ کا قلق و اضطراب ختم ہو جاتا اور دل مطمئن ہو جاتا اور آپ واپس تشریف لاتے۔''

(بخاری، کتاب التعبیر، جلد دوم، ص: ۱۰۳۳ مطبوعہ کرزن پریس دہلی)

اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس لیے سمجھ میں نہ آئے کہ یہ گنجلک ہے۔ منٹگمری واٹ نے اس حدیث کا سہارا لے کر بڑی گنجلک بحث چھیڑ دی ہے۔ مگر یہ حدیث بخاری شریف سے نہیں

لی، بلکہ طبری سے لی ہے۔ یہ اس لیے کہ طبری میں ان کی مطلب برآری اور چھیڑ چھاڑ کے لیے کچھ باتیں مل گئی ہیں، طبری نے ابن زہری ہی کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے، مگر اس کے لکھنے میں بخاری شریف کی حدیث سے جو اختلاف پیدا ہوگیا ہے، وہ پڑھنے کے بعد ہی ظاہر ہوگا۔ مصنف نے اس کا جو انگریزی ترجمہ دیا ہے اس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ مصنف نے اپنی بحث کی خاطر اس کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں لکھا ہے:

ا: نعمان بن راشد زہری سے روایت کرتے ہیں۔ وہ عروہ سے اور عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وحی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رویائے صادقہ سے شروع ہوئی، جو صبح صادق کے مانند ہوا کرتے تھے۔

ب: اس کے بعد آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی۔ آپ غار حرا میں چلے جاتے اور وہاں تحنث میں کئی راتوں تک مشغول ہوجاتے، قبل اس کے کہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے، وہ ان کے پاس آتے اور سامان لے کر اسی طرح واپس ہوجاتے۔ یہاں تک کہ خلاف امید آپ کے پاس حق آیا اور کہا کہ اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں۔

ج: انھوں نے یعنی محمد نے فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا لوں، جب ایسا سوچ رہا تھا تو وہ میرے سامنے نمودار ہوا، اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں جبرئیل ہوں، اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔

د: تب اُس نے کہا پڑھ، میں نے کہا کہ میں پڑھ نہیں سکتا ہوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تب اُس نے مجھے پکڑا اور تین بار بڑے زور سے دبوچا، یہاں تک کہ میں بے جان ہوگیا۔ تب اُس نے کہا کہ پڑھ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ .....﴾ اور میں نے پڑھا۔

س: پھر میں خدیجہ کے پاس آیا، اور کہا مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ پھر اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا، خوش خبری ہو، خدا کی قسم اللہ آپ کو پریشانی میں نہ ڈالے گا، آپ رشتہ داروں کے لیے بھلائی کرتے ہیں، آپ سچ بولتے ہیں، آپ امانت کو واپس کرتے ہیں، آپ تکان برداشت کرتے ہیں، آپ مہمان نواز ہیں اور حق کے حامیوں کی مدد کرتے ہیں۔

ص: پھر وہ مجھے ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا کہ اپنے بھائی کے لڑکے کی سنیے، انھوں نے پوچھا تو میں نے اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا کہ یہ وہی ناموس ہے، جو موسیٰ بن عمران پر نازل ہوا، کاش میں جوان ہوتا، اور اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کا قبیلہ آپ کو نکالے گا، میں نے کہا کہ کیا وہ مجھے نکال دے گا؟ انھوں نے کہا جب کوئی آدمی ایسا پیام لایا، جیسا آپ لائے ہیں، تو وہ اپنے دشمنوں سے ستائے بغیر نہیں رہا، اگر آپ کا وہ دن میرے سامنے آیا، تو میں آپ کی مدد پورے طور پر پورے زور سے کروں گا۔

ع: اقرأ کے بعد قرآن کا جو پہلا حصہ میرے اوپر نازل ہوا۔ وہ یہ تھا:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝﴾

(القلم: ۱ تا ۵)

”ن، قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں، اس کی قسم، یا کہ (اے محمد) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو، اور تمھارے لیے بے انتہا اجر ہے اور اخلاق تمھارے بہت (عالی) ہیں، سوعنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ (کافر) بھی دیکھ لیں گے۔“

غ: زہری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آنا کچھ عرصہ کے لیے بند ہو گیا۔ آپ بہت غمگین تھے، آپ پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر چڑھنے لگے تاکہ وہاں سے گرالیں لیکن جب وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے، اور کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس سے آپ کی بے چینی دور ہو جاتی اور اپنے آپ میں ہو جاتے۔

ف: رسول اللہ ﷺ اس کے بارے میں بیان کرتے اور کہا کہ میں ایک روز ٹہل رہا تھا کہ میں نے اس فرشتہ کو دیکھا، جو میرے پاس حرا میں آتا تھا وہ ایک کرسی پر تھا، جو آسمان اور زمین کے بیچ میں تھی، میں خوف زدہ ہوا، اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور کہا مجھ کو ڈھانک دو۔

ق: ہم نے آپ کو ڈھانک دیا، یعنی آپ کے اوپر اثر ڈال دیا، خدا نے اس پر یہ آیت اُتاری:

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○﴾

(المدثر: ۱ تا ٤)

''اے اوڑھ کر لیٹنے والے اٹھ، خبردار کر، اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔''

ک: الزہری کا بیان ہے، آپ پر جو آیتیں پہلے اتریں وہ ہیں:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○﴾

(العلق: ۱ تا ٥)

منٹگمری واٹ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں، الزہری نے جو ابن شہاب کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے وحی کے رک جانے کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں ٹہل رہا تھا، یہاں تک لکھنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ اس روایت میں وادی کے بدلے ہوئے نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ مجھے ڈھانکو اور اوڑھا دیا گیا یہاں پر مصنف نے پوری روایت نقل نہیں کی، پوری روایت یہ ہے:

میں چہل قدمی کر رہا تھا، میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے اپنا سر اٹھایا، تو وہی فرشتہ تھا، جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، جو زمین اور آسمان کے درمیان تھی، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، میں اس سے ڈرا، میں گھر آیا اور کہا مجھے ڈھانکو، مجھے ڈھانکو، تو لوگوں نے مجھے چادر اوڑھائی، پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○﴾

(المدثر: ۱ تا ٤)

''اے (محمد ﷺ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔''

آپ فرماتے ہیں کہ پھر وحی مسلسل آنے لگی۔

اتنا کچھ حذف کرنے کے بعد مصنف کا بیان ہے کہ جابر کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورہ المدثر پہلی وحی ہے۔ (ص: ۴۰، ۴۱)

اب سوال یہ ہے کہ مصنف نے بخاری شریف کی روایت کے بجائے طبری کا سہارا کیوں لیا۔ بخاری شریف کی جلد میں طبری کی منقولہ حدیثوں سے زیادہ معتبر اور مستند ہیں۔ بخاری شریف اور طبری دونوں کی روایتوں سے ظاہر ہے کہ پہلے اقرأ والی آیتیں نازل ہوئیں۔ پھر کچھ دنوں وحی آنا رک گئی۔ پھر جب آئی تو پہلے المدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔

اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے خواب کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ محمد کی نبوت کا آغاز رویائے صادقہ سے ہوا، اور یہ بتاتے ہیں کہ خواب اور رویائے صادقہ میں فرق ہے، اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ اس سورہ میں رویائے صادقہ کا مطلق ذکر نہیں بلکہ وحی کا نقشہ آیا ہے۔ اس سورہ کی جن آیتوں کا انگریزی ترجمہ ہے ان کو ذیل میں نقل کر کے ہم اپنے ناظرین کے لیے اردو ترجمہ بھی دے رہے ہیں، جو مولانا مودودی کا کیا ہوا ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوٰى ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ۝ فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهِ مَا أَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ۝ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَأٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝﴾ (النجم: ۱ تا ۱۸)

"قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے، وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب ہے، وہ سامنے آ کھڑا ہوا، جب کہ وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا، اور اوپر معلق ہو گیا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا

اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچائی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا اس نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا۔ اب کیا تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہٰی کے پاس اس کو اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت الماوٰی ہے، اس وقت سدرۃ المنتہٰی پر چھا رہا تھا، جو کچھ چھا رہا تھا، نگاہ چندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے ربّ کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

منٹگمری نے جو انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے، اس میں ﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ کا کس قدر تعجب انگیز ترجمہ دیا ہے:

It is nothing but a suggestion suggested.

لیکن جارج سیل نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

Neither both he speak of his own will. It is no other than a revelation which has been revealed on to him.

دونوں ترجموں میں کتنا فرق ہے۔ منٹگمری کے ترجمے میں اور باتیں حذف کر دی گئی ہیں، ترجمے کی آخری سطریں یہ ہیں:

He saw him too at a second decent by the sidra tree at the boundary, near which is the garden of abode. When the sidra tree was strangely enveloped the eye turned not aside, nor passed its limits verily he saw one of the greatest signs of his Lord.

ہمارے ناظرین کے سامنے اوپر قرآنِ مجید کی آیتیں ہیں، وہ دیکھ لیں کہ اوپر کا انگریزی ترجمہ کہاں تک صحیح ہے۔ جارج سیل کا ترجمہ یہ ہے:

"One mighty in power enusd with understanding taught it him and he appeared in the highest parts of the horison. Afterward he approached the prophet, untill he was at a distance of two length of get nearer and he revealed unto his servant that which he revealed. The highet of Mohsammad did not falsaly represent that which he saw. Will ye therfore dispute with him concerning that

which he saw? He also sae him another time by the late tree beyoud which there in no passing near it is the garde of eternal abode. When the late tree covered that which it coverd his eyesight turned not aside. neither did it wander, and he really beheld some of the greatest sign of the Lord. "

منٹگمری نے بیچ کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے جس میں یہ ہے کہ اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی، وہ وحی کے لفظ کو اس لیے نظر انداز کرنا چاہتے تھے کہ پھر یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کلام پاک وحی کے ذریعہ نازل ہوا اس کے بعد True Vision, Vision اور dream کی بحث نہیں، چل سکتی تھی، وہ اپنی بحث میں جو کچھ کہتے ان کو کہنے کا حق تھا مگر قرآن کی آیتوں کا سہارا لے کر اپنے دعویٰ کو مستحکم کرنے کی فکر میں انھوں نے فریب اور تدلیس سے کام لیا اور ایک ایسا ترجمہ پیش کیا، جس میں ''وحی'' کا ترجمہ ہی نہیں آنے پایا ہے۔ اگر انھوں نے نیک نیتی سے ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے تو ترجمہ کی نوعیت زیر بحث آ جاتی ہے۔ جارج سیل نے کلام پاک کا ترجمہ کرتے وقت اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یورپ کے زیادہ تر ترجمے قابل اعتبار نہیں ہیں۔

منٹگمری واٹ نے قرآنِ مجید کا ایک غلط ترجمہ پیش کر کے یہ بحث بھی چھیڑ دی ہے کہ پیغمبر اسلام نے اس وقت اللہ کو یا جبرئیل کو دیکھا، وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے مفسرین یہی کہتے ہیں کہ اس وقت جبرئیل نمودار ہوتے تھے۔ جارج سیل نے بھی اپنے ترجمہ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے، لیکن منٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ یہ خیال کرنے کے وجوہ ہیں، خود محمد ﷺ نے شروع میں یہی خیال کیا کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ جبرئیل کا ذکر مدنی سورتوں سے پہلے نہیں آیا ہے۔ الی عبدہ کے معنی تو اللہ کا بندہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ترکیب بھدی Akward سی ہو جاتی ہے۔ جب تک فعل کے فاعل میں خدا سمجھا جائے، پھر حدیث میں جو ذکر ہے کہ حق آیا، اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، تو یہ حق سے خدا ہی مراد ہے، منٹگمری واٹ یہ لکھنے کو تو لکھ گئے۔ لیکن انھوں نے جو عبارت نقل کی ہے، اس کا پورا جملہ یہ ہے کہ حق آیا اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اگر حق

سے مراد خدا ہے، تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ حق آیا اور کہا اے محمد! آپ ہمارے رسول ہیں اور پھر جابر کی تفسیر کا سہارا لے کر آگے جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس قدر گنجلک ہو گیا ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے سورہ النجم کی ایک آیت کے معنی بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی o لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾ کے معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنے ربّ کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ مگر ان کا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ بھی لیے جا سکتے ہیں کہ محمد نے جو کچھ دیکھا، وہ خدا کے جمال اور عظمت کی نشانی تھی ان کے مذکورہ بالا ترجمہ میں اس آیت ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی﴾ کا ترجمہ نہیں ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت شاید بعد میں بڑھا دی گئی، شاید لکھنے میں بڑے ماہر ہیں یہاں بھی اس مہارت سے فائدہ اٹھایا ہے یہ لکھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اس بات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا، اس کو ان کے دل نے اشاری صورت Symbolic میں دیکھا، مصنف نے معلوم نہیں یہ کہاں سے معلوم کر لیا کہ محمد ﷺ کا یہ خیال تھا کہ انھوں نے شروع میں خدا کو دیکھا۔ اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تو نہ تھا لیکن ایسا خیال کرنے میں انھوں نے غلطی بھی نہیں کی اس لیے ان کا خیال ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیے، ان کے دل نے اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی، جو انھوں نے دیکھا، ان کو اصرار ہے کہ محمد ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ خدا ہی کو دیکھا تھا، اگرچہ حضرت عائشہ کی اس روایت کا بھی حوالہ دیتے ہیں کہ محمد ﷺ نے خدا کو نہیں دیکھا تھا، اس روایت کے بعد مصنف کا یہ ثابت کرنا کہ محمد نے خدا کو دیکھا کہاں تک صحیح ہے، بات یہ ہے کہ مصنف شروع سے آخر تک اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پرفریب انداز میں دکھانا چاہتے ہیں کہ کلام پاک، کلام الٰہی نہیں ہے، نہ یہ الہامی ہے، نہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوتی رہی، اس لیے سورہ النجم کی مذکورہ بالا آیتوں میں وحی کا لفظ جو دو بار آیا ہے، اس کو نظر انداز کر کے مصنف نے ایسے ترجمہ کو ترجیح دی ہے جس میں وحی کا ترجمہ کرنے سے انحراف کیا گیا، اس لیے Vision deram true vision اور آگے چل کر Dione iruption وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجلک بحث کر کے اپنے ناظرین کے

ذہن کو گنجلک بنانے کی کوشش کی، مؤرخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو یہ تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمد ﷺ کے پیروؤں کا خیال ہے کہ قرآنِ مجید کلامِ الٰہی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمد ﷺ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے، بات یہاں پر ختم ہوجاتی، پھر ان کو اسلام کا مؤرخانہ ناقدانہ اور عاقلانہ مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کا پشتارہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ گزشتہ ۱۲ سو سال سے عیسائی مصنفین نے اسلام اور اس کے پیغمبر کے خلاف کتابوں پر کتابیں لکھ کر انبار لگا دیا ہے، مگر ان کے منشا کے مطابق مسلمان ان تحریروں سے متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام سے منحرف تو نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ دنیا میں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اور کیا عجب کہ کسی زمانہ میں عیسائیوں سے زیادہ ان کی تعداد بڑھ جائے۔ اور اگر یہ کتابیں عیسائیوں کے لیے لکھی گئی ہیں، تو ان کے لیے ایسی کتابیں لکھی جائیں یا نہیں، وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر اسلام کے منکر اور مخالف بہرحال رہیں گے۔

غارِ حرا اور تحنث کی بحث آتی ہے، تو مصنف ایک بار اپنے قیاسات بروئے کار لاتے ہیں۔ ایک صفحہ کی بحث میں Might be, must have been, hypthetically, probably, Evidently, may have, apparrently, persumably, seem to have been. جیسے الفاظ کے سہارے اپنی مؤرخانہ تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔ پوری کتاب میں ایسے الفاظ کی بھرمار ہے، اور جتنی بار ان کا استعمال ہوا ہے، ان کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے، تو معلوم نہیں کتنے اوراق سیاہ کرنے پڑیں۔ وہ اسی قیاس آرائیوں کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ محمد غارِ حرا میں مکہ کی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہوں، یا یہودیوں اور عیسائیوں کے راہبوں سے متاثر ہو کر تنہائی کی تلاش میں گئے ہوں، یا وہاں عبادت کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کرتے ہوں، پھر لکھتے ہیں کہ روایاتی طور پر اس طرف ذہن کو منتقل کر لیا جاتا ہے کہ اس عزلت نشینی میں Vision ظاہر ہوا، لیکن محمد کی پکار کی تاریخیں غیر متعین ہیں۔ کبھی یہ خلاف امید ظاہر ہوتی، کبھی خدیجہ اس موقع پر ان سے زیادہ دور نہ ہوتیں۔ اب اس تحریر سے اندازہ ہوگا کہ مصنف نے غارِ حرا کے تحنث کی اہمیت کس طرح کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے بعد ''آپ خدا کے رسول ہیں'' کے عنوان پر ڈیڑھ صفحہ کی بحث ہے جس میں حسب

معمول Perhaps کا استعمال تین بار اور Probable کا دوبار اور پھر Must Have, it would be natural to suppose, mitht be take, persumably وغیرہ کے الفاظ اور فقروں کا سہارا پکڑ لیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ

''یہ اغلب ہے'۔ الفاظ ''آپ خدا کے رسول ہیں'' ظاہری نہ تھے۔ ممکن ہے کہ یہ خیالی بھی نہ رہے ہوں، بلکہ ذہنی رہے ہوں، یعنی یہ الفاظ انھوں نے کانوں سے نہیں سنے اور نہ یہ خیال کیا کہ وہ سن رہے ہیں، بلکہ یہ الفاظ ابلاغ کا ذریعہ تھے جو اُن کے پاس الفاظ کے بغیر پہنچے، الفاظ کی شکل رویا کے بعد دے دی گئی ہو۔'' (ص:۴۶)

یہ قیاس صرف اس لیے ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعہ سے نازل نہیں ہوا، قرآن کے الفاظ کو Exterior locution اور نہ imaginative locution بلکہ Intellectual locution یا محض deram یا vision یا Diving irruption، cerative irruption یا Intuition of cerative imagination وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لے کر ناظرین کو گمراہ کیا گیا ہے نئے نئے الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعہ سے مصنف چاہے جس قسم کی بحث کریں، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اس قسم کی بحث چھیڑی گئی تھی، قرآنِ مجید میں ہے:

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کرلیا ہے، کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو خود ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آتی، اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا، اسی طرح تو ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا، ان میں کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور تیرا ربّ ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔''

(یعتذرون، یونس:۳،۱۰،۸)

یہی بات تکرار کے ساتھ کہی گئی، سورہ ہود میں ہے:

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے، کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو، اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں سچے ہو، اب اگر وہ (تمھارے معبود) تمھاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، پھر کیا تم اس امر حق کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہو؟'' (وما من دابۃ، ۱۲۔ ہود: ۱۱ رکوع ۱، ۸،۱)

خود قرآنِ مجید میں ہے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی گئی، تو اس پر بھی اسی قسم کا اعتراض ہوا۔

''ہم اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو بھی کتاب دے چکے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمھیں دی گئی ہے، اگر تیرے ربّ کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان بھی اس کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا، یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا ربّ انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے، بس اے نبی تم اور تمھارے وہ ساتھی جو (کفر، بغاوت سے ایمان واطاعت کی طرف) پلٹ آتے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو''

(ہود: ۱۱، رکوع ۹، ۱۴، ۹)

مصنف نے وحی کی قسم کی بحث چھیڑ کر یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے کہ دنیا میں کسی ایسی کتاب کا وجود نہیں جو وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے، اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے، اس کو وحی کہتے ہیں، قرآنِ پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے، وحی کی اور قسمیں بھی ہیں، جیسا کہ سورہ شوریٰ ۵ میں ہے کہ کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی

سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے، اس کو وحی کر دیتا ہے۔ (سیرۃ النبی، جلد چہارم، ص:۶۳)

یہ مسلمانوں کا کھلا ہوا عقیدہ ہے، جس میں ''شاید اغلب ہے، خیال ہے، ایسا ہو رہا ہوگا'' وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اور منٹگمری واٹ جیسے مصنف کو حق نہیں ہے، کہ مسلمانوں کو مجبور کریں، کہ وہ ایسے عقیدہ کے قائل نہ ہوں، وہ ایک عیسائی یا عیسائیت کے ایک مبلغ ہونے کی حیثیت سے اسلام یا اور دوسرے مذاہب کے خلاف جتنا بھی چاہیں زہر اگلیں، ان کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اپنی تحریر کو مؤرخانہ یا معروضی کہہ کر گمراہ نہ کریں، ورنہ ان کی طرف سے کھلی ہوئی دعوت ہوگی، کہ مسلمان ان ہی دلائل اور ان ہی الفاظ کے ساتھ عیسائیت کو بھی اسی طرح داغدار کریں، جس طرح وہ اسلام کو کرنا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نہیں سمجھے جاتے ہیں، تو پھر وہ قرآن کی برتری کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، اسی لیے اپنی پرفریب تحریروں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ خود رسول کے ہیں، مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ توریت، زبور اور انجیل سب وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئیں۔ اس کی تصدیق قرآنِ مجید سے بھی ہوئی ہے۔ قرآن میں ہے:

''ہم نے اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کا ذریعہ ہدایت بنایا تھا۔

ہم ہی نے داؤد کو زبور دی تھی۔

ہم نے اس کو یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی جس میں راہنمائی اور روشنی تھی۔''

(المائدۃ:۵)

پھر ایک عمومی بات اس طرح کی گئی ہے کہ

''اے نبی تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے، تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔'' (الانبیاء:۲۱)

مستشرقین آج قرآنِ مجید کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی کہا گیا، قرآنِ مجید میں ہے:

''رسولوں کو ہم نے اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجا کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دیں، مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انھوں نے میری آیات کو اور ان تنبیہات کو جو انھیں کی گئیں، مذاق بنالیا ہے، اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے ربّ کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے، اور وہ ان سے منہ پھیرے اور اس پر بڑے انجام کو بھول جائے، جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے، (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیئے ہیں، جو انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کردی ہے، تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔'' (سبحان الذی:۱۵)

# مستشرقین اور مطالعۂ سیرت

ڈاکٹر نثار احمد

مستشرقین کی زیر نظر فہرست دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اوّل میں اکثر و بیشتر وہ مستشرقین شامل ہیں جنھوں نے سیرت رسول پر مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یا جو مطالعہ سیرت کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں، اور جن کا مکمل حوالہ بھی مل گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جن کی سیرت پر اگرچہ مستقل تصنیف نہیں ہے، لیکن ان کے مضامین، مقالات اور کتابوں میں سیرت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور جن کا پورا حوالہ بھی دستیاب نہیں ہوا، دونوں حصوں میں ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے، زمانی تقدم و تاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

اس فہرست کی تیاری میں اگرچہ ان تمام کتابوں سے مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ وقتاً فوقتاً تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے، تاہم بطور خاص تین کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے، یعنی (۱) نجیب۔ المستشرقون، (۲) الترکلی، خیر الدین۔ الاعلام، (۳) حمادے۔ محمد دی پروفٹ، اے سلیکٹیڈ ببلیوگرافی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وقت اور وسائل کی کم یابی کے سبب یہ ممکن نہ تھا کہ مستشرقین کے ناموں کے تلفظ اور ہجے، وطن ملک اور زبان کی رعایت سے تحقیق کر کے لکھے جاتے، اس سلسلہ میں عام انگریزی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے، تاہم یہ توقع ہے کہ تحقیق مزید کے ضمن میں یہ سرسری فہرست ان شاء اللہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگی، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لیے مدد و معاون ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ

۱۔ آدم Adams, Iraac — Mohammad and Mohammedanism (Chicago, 1900)

| | | |
|---|---|---|
| ۲۔ | ایڈیسن Addison, Lencelat | The life and death of Muhammad, the anthor of the Turkish religion. (London, 1619) |
| ۳۔ | ایڈلر Addler, Felix. H | Mohammed (Philadelphia 1901) |
| ۴۔ | اہرن Ahren, Karl | Mohammad al religious stifter (Lepzig 1935) |
| ۵۔ | ایٹن Aiton, John | The land of the messiah, Manomet, and the pope (london 1854) |
| ۶۔ | آرنلڈ Arnold, J.M | The Preaching of Islam. (London 1896) |
| ۷۔ | آرنلڈ Arnold, J.M | Islam, its History, Charaoter and relation to chirstaianity, (London 1874) |
| ۸۔ | ارونگ Irving, Washington | Life of Mohamat (Newyork 1911) |
| ۹۔ | اوکلے Ockley, Simon | History of the saracens. (London 1847) |
| ۱۰۔ | اوکس گان Oksegon, L,de | Confutacion del Alooany secta mohomctana (Granado 1555) |
| ۱۱۔ | اتیج مین Eigeman, Jakob | Mohammade profet der Arabieren (Amesterdom 1898) |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۲۔ | اوسنر Isner, G.B | Des effets de tareligion de Mohamed (peris. 1810) |
| ۱۳۔ | اوسم Osbam, R.D | Islam under the arabs (somdon 1876) |
| ۱۴۔ | اوزرن Osztern, S | Vizlat Muhamad Kuranjanak ethikajabiz (budapest 1902) |
| ۱۵۔ | اسٹیب Sutbb, H | An account of the Rise and progress of Mahometanis. (London, 1911) |
| ۱۶۔ | اقام Upham, Edward | History of the ottomon Empire. Preended by the life of Muhammad (Hurst 1826- 35) |
| ۱۷۔ | ارتبنوت Artutboot, F.F | (۱) تاریخ العرب وآدم (لندن ۱۸۹۰ء) (۲) ترجمہ رفت مصغانی حیاۃ محمد مصطفیٰ (لندن ۱۸۹۳ء) معاوتہ دیاستک |
| ۱۸۔ | اسپرنگر Spranger, A | Life of Mohammad (allahabad 1851) Das Lesa und die lehrodes Mohammad (1861-1851) |
| ۱۹۔ | اسمتھ Smith, Bosworich | Muhammad and Muhammadism London. 1874 (Reprint Lahore) |
| ۲۰۔ | بخیلات Bachulat, Theodore | Mahomet at les Arabes (Rome. 1878) |

۲۱۔ بیکن Bacon A.S
Mohammad and Island comporision with orthodox christanity. (Newyork, x 1911)

۲۲۔ بیکن ڈارف Beckendorf, H.C
Mohammad and de seinen. (lipzig 1907)

۲۳۔ بارٹن Barton, theodor
Talks on Mohamed and his followers (London 1932)

۲۴۔ بائیل Bayle, Plaorra
The dictionary historical and critical of Mr.Fetor Bayle (Ed) (London 1734-1735)

۲۵۔ بیڈویل Bedwell, W
Mohammedin imposturac. (London 1615)

۲۶۔ برن فیلڈ Bernfeid, Simon
Muhammad, His Biography and the begining of the Religion of Islam (warsaw 1914)

۲۷۔ اینی بیسنت Besant, Annie
The life and teaching of Muhammad (Adyar 1932)

۲۸۔ بلاخر Blachore, Regis
Le Problems de Mahomet (paris 1952)

۲۹۔ بلام Blom, P
Muhammad of Karanen (Hamar 1904)

۳۰۔ بلائٹ Blytt, Eva
Muhamed Islam store Profet. Kristiannica 1911

| | | |
|---|---|---|
| ۳۱۔ | Bowen, George بوین | Life of Mohammed (Bolbay 1851) |
| ۳۲۔ | Brandes C.E.G برانڈے | Muhammed Shourspiel the akter (Obanbava 1895) |
| ۳۳۔ | Bodley, R.V.C بوڈلے | The Messenger the life of Mohammad (London 1946) |
| ۳۴۔ | بولین ولیرز Bovlann Villiers H.C | (i) Histore des Arabes, Aved, la vie de Mahomet (Amesterdom 1731) (ii) Vie de mahomet (1730) |
| ۳۵۔ | Breguigny, H.D بری گنی | Veber Muhammed (frankfurt 1791) |
| ۳۶۔ | Briem, O.E بریم | Gudha, Muhammad, Jesus (London 1998) |
| ۳۷۔ | بروکلمان Broekelmann, C | History of the Islame People (Newyork 1947) English Tr |
| ۳۸۔ | Brooks, Archibaid بروکس | Islam: A Short study |
| ۳۹۔ | Brown, D.A براؤن | The way of the Prophet An Introduction to Islam (London 1962) |
| ۴۰۔ | Borwn, G.L براؤن | The Era of Mahomet (London 1856) |
| ۴۱۔ | Buckle, Henry بکل | The begger of the soldier Gautams or Mahomet (London 1903) |

| | | |
|---|---|---|
| ۴۲۔ | Buhl, P.P.W بوہل | Des Leban Muhammaeds (Leipzig 1930) |
| ۴۳۔ | Burrows, Miller براوز | Founders of Great Religion being personal sketches of famus leaders (Newyork 1931) |
| ۴۴۔ | Bush George بش | The life fo Mohammad: founder of the religion of Islam and the Empire of the sarecens (Newyork 1830) |
| ۴۵۔ | Basset Rene باسے | قصیدۃ البردۃ۔ بوصیری مع سیرت مصنف، نقد وشرح ۱۸۹۴ء |
| ۴۶۔ | Burton برٹن | Pilgrimage to Mecca and Medina (1856) |
| ۴۷۔ | Ponet, Rudi پونی | Mohammad and der Roran (Stutizart 1951) |
| ۴۸۔ | Peyne, P.S.R پائن | The Holy sword of the story of Islam from Muhammad to the present (London 1961) |
| ۴۹۔ | Pedio, San Paswal پیڈیو | Contra los partalistan Mohometmes (Rome 1905-06) |
| ۵۰۔ | Prucksch, Otto پروخش | Uber die Bluctraehe beides vornlamisschen Arubern and Mahomeds (leipzig 1899) |

| | | |
|---|---|---|
| ۵۱۔ | ٹیلر Taylor W.C | History of Mohametanism and its sects (London 1834) |
| ۵۲۔ | ٹنسڈال Tinsdall, W.St | Sauces of the Quicn (London 1905) |
| ۵۳۔ | ٹاؤن مینڈ Townsend. Mcd.W | Muhammad the great Arabian (Houston 1912) |
| ۵۴۔ | ٹوائن بی Toynbee, A.J | A study of History (London 1954-51) |
| ۵۵۔ | ٹریپے Tramce, E.Von | Mohammed (leipzig 1907) |
| ۵۶۔ | ٹروٹر Troter, H.J | Studies in Biography (London 1865) |
| ۵۷۔ | ٹرپن Turpin F.R | Historie de la vie de Mohommet legi slative de Arabia (Paris 1776-79) |
| ۵۸۔ | جبرئیلی Gabrieli, Prancesseo | Muhammad and the coquests of Islam (Newyork 1968) |
| ۵۹۔ | جیگنیر Jagnier,J | Vie de Mahomet (Amesterdam 1748) |
| ۶۰۔ | جینوے Ganevay, A | Mohammed (Paris 1838) |
| ۶۱۔ | جیورگن Georgen E.P | Mohammed and cheracerbild (Berlib 1878) |
| ۶۲۔ | جیفرے Jaffery, Arthur | Islam Mohammed and his religion (Newyork 1958) |

| | | |
|---|---|---|
| ۶۳۔ | جانسٹن Johnston, P. Lacy de | Mohammad and his power (Newyork 1901) |
| ۶۴۔ | جونگ Jong, P.de | سیرت ابن ہشام مع متن وترجمہ لاطینی، لیڈن ۱۸۸۱ء بمعاونزردی |
| ۶۵۔ | چیورغیو Cheorghio, C.V | Lavie de Mohamet (Paris 1962) |
| ۶۶۔ | چگاوٹ Chagavat, Michel. S | Mahomet les khaalifes. (Paris 1912) |
| ۶۷۔ | درمنگھم Dermehghom, E. | La Vie de Mahomet (Paris 1929) |
| ۶۸۔ | دوکات Ducati, Bruno | meometn (1931) |
| ۶۹۔ | ڈالے Dale, Godetrey | Msishaya Muhammad (London 1909) |
| ۷۰۔ | ڈبلے Dibble, R.P | Mohammad (Newyork 1926) |
| ۷۱۔ | ڈیون پورٹ Davenport, John | Apology for Mohammed and the Quran (London 1869) Reprint Lahore 1975. |
| ۷۲۔ | ڈوریر Du Ryer, Andre | The Alcorin of Mahomet (London 1648) |
| ۷۳۔ | ڈریکاٹ Draycoit, G.M | Mahomet, Founder of Islam (London 1694) |
| ۷۴۔ | ڈوکاسے Ducisse Raymond | Mahomet Daus son lemps va 1908) Geneva |
| ۷۵۔ | ڈیورجرس Desergers, N | Vie de Mohammed (Paris 1837) |

| | | |
|---|---|---|
| ۷۶۔ | Dozy R.P.A ڈوزی | Spanish Islam (1883) Het Islami sime (krusemen 1863) |
| ۷۷۔ | Raleigh, Sir W ریلے | The life and death of Mahomet (London 1637) |
| ۷۸۔ | Ram Poldi رام پوڈی | vite di Maometto (milano 1922) |
| ۷۹۔ | Recxender, H. ریکینڈر | Mohemed and die seninen (Leipzig 1907) |
| ۸۰۔ | Reeland, A. ریلینڈ | Reflections on Mohammadinism and the conduct of Mohamed (London 1712) |
| ۸۱۔ | Rehm, H.S ریم | Mohamed and die welt des Islami Leipzig 1765) |
| ۸۲۔ | Reinaud, J.T رینو | Notice Sur Mahomet (Paris 1860) |
| ۸۳۔ | Reland, H. ریلانڈ | Per religion Mohamedica Ibra due (utruht 1704) |
| ۸۴۔ | Renan, Brnest رینان | Mahomet et ler Origines de L Islamism (Paris 1880) |
| ۸۵۔ | Rink, F.Th رنک | Islam et son pophet (Lausaune 1870) |
| ۸۶۔ | Rivlin, Josef. J ریولین | Hayyey Muhammad (Mizz) 1932 |
| ۸۷۔ | Rodinson, M روڈنسن | (i) Li Islam Mahomet et les origion de L Islam (Paris 1957)<br>(ii) Mahomet (Paris 1951) |

۸۸- روبک Roebuck, J.A — Life of Mahomet (London 1833)

۸۹- رومرو Romro, Jacub — Mahomed (Newyork 1907)

۹۰- زکریا Zakariss, Houns — Voice le Vraj Mohamed et la faux corin (Paris 1960)

۹۱- سیکو Sacco, A — Le Gadenz religiose de Maomettq (Romc 1922)

۹۲- سیل Sale, George — The Koran of Al-coran of Mohammad (London 1734)

۹۳- سوارے Sawary Claud E — Moral dc Mahomet (Paris 1784)

۹۴- سیل Sall, Edward — The Life of Muhamed (London 1913)

۹۵- سوان Svan Borg.A — One Successn Davideros Hyme ne Unitatus sis Muhammed. Up salis 1886.

۹۶- شونڈرز Saunders, J.J — A History of Medieval Islam (London 1985)

۹۷- شروڈر Schroeder, M.G — Muhammed testios venitatis Gontrasapsun (leipzig 1718)

۹۸- طورانیڈے Tor- Andrae — Muhammed The man and his faith (Tr) London 1956

۹۹- فیورٹ Favrot, Alexis — Mahomet: Lascience chezles araos (Paris 1866)

| | | |
|---|---|---|
| ۱۰۰۔ | فارسٹر Forster, Charles | Moahometanism Unyeiled (london 1829) |
| ۱۰۱۔ | فرائڈ Fried, Dezeg | Mohammad a regebbi Zeridosag Megitelaseben (budapest 1934) |
| ۱۰۲۔ | فوربنگ Foreting, J.C | Mohamed, munzer and bockold (Hamover 1788) |
| ۱۰۳۔ | کیتانی Cretani, Leone | (i) Anneliqell and Islam (epoli, 1905-26)<br>(ii) Maometto profeta Dmrsa bia (Ikalina 1910) |
| ۱۰۴۔ | کارلائل Carlyle, Thomas | The Hero as Prophet Mahomet (Newyork 1902) |
| ۱۰۵۔ | کاستری Castries, Heuridelnc | Comte dp. L' Islam- Impressions at stoudes (Paris 1912) |
| ۱۰۶۔ | کلیمن Clemons, J.F.C | Leban Muhamed's des Stifters der Muhammadanism religion (Himbers 1814) |
| ۱۰۷۔ | کلاڈیس Claudius, H.H | Muhameds religion aus dem Koran (Atons 1908) |
| ۱۰۸۔ | کورینالڈی Corinaidi, Dino | Msometto egli Ebri (milens 1925) |
| ۱۰۹۔ | کریمی Karimi R.W | Anaodots of Hazrat Mohamad (London 1939) |

۱۱۰۔ کاسٹ مین Kastman, Carl — Muhammed, Hous lefnad berotted (stockholm 1908)

۱۱۱۔ کوئیل Koelle, S.W — Mohamed and Mohamedenism (London 1889)

۱۱۲۔ کروپن Kroppen, P. — Mohamed der prophet (Hamberg 1851)

۱۱۳۔ کاسن ڈی پرسیورل Caussin de perceval A.P — Essai sur l Histoire des Arabes (1847)

۱۱۴۔ الکندی عبدالمسیح بن اسحاق Al-Kindi — Risalah- Ed. Tien (London 1880) The Apology of Al-Kindi (London 1887) By Muir.

۱۱۵۔ گارساں دی تاسی Garcin de Tussy — Le Doetrine et Les Deviors de la Religion Muslmane. (Paris 1826)

۱۱۶۔ گاڈفرے ڈی ممبائن Gaudefroy de Mombynes — Mzhomet (Paris 1957)

۱۱۷۔ گب Gibb. H.A.R — Mohamdanism Historical survey (London 1953)

۱۱۸۔ گبن Gibbon, Edward — Life of Mahomet (Newyork 1879)

۱۱۹۔ گولڈزیہر Goldrihe, Ignac — Mohamed and Islam (TF) yale (1817)

۱۲۰۔ گلمین Gilman, Arthur — The Sarecens (London 1887)

| | | |
|---|---|---|
| ۱۲۱۔ | گولڈ Gold. I.L | Mahomet et son dehure (Paris 1897) |
| ۱۲۲۔ | گرین Green, Samuel | The life of Mahomet, founder of the religion of Islam and the Empire of the saracens (London 1840) |
| ۱۲۳۔ | گریم Gremme, Hubert | Mohammad, Des leban Nachden quellen (minister 1892-95) |
| ۱۲۴۔ | لنگز Lings, Martin | Muhammad (London 1983) |
| ۱۲۵۔ | لیمیر یی Lemairesse. E.D.G | Vide de Mahomet Dl epres la tradion (Paris 1897-98) |
| ۱۲۶۔ | لامارٹن Lamartine, A.M | (i) Mahomet in les Orand Bommssde Ortent (Paris 1889)<br>(ii) Histore de La Tarquie. (Paris 1854) |
| ۱۲۷۔ | لیٹنر Leitner. G.W | Muhammadenism (working 1889) Reprint Lahore. 1893 |
| ۱۲۸۔ | لیروگ Leruougue. R | Vie de Mahomet (Paris 1939) |
| ۱۲۹۔ | لیوی Levy, Sioon | Moise, Jesus at Mahomet on less Trios Grends (Paris 1887) |
| ۱۳۰۔ | لیوچی فی Lsw. Che. Fi | The Arabian Prophet: A life of Mohammad from chinese and Arabic sources (Shanghai 1921) |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۳۱۔ | لیونارڈ Leonard, Arthur. G | Islam, Her moral and spiritual value, (London 1927) |
| ۱۳۲۔ | لین پول Lane-pool, Staniley | The Speechs and Teble talk of the Prophet Mohammad (London 1882) |
| ۱۳۳۔ | لامنس Lammens. P.H | اخلاص محمدؐ (۱۹۱۱ء) فاطمہ و بنات محمدؐ (۱۹۱۲ء) مہد الاسلام (روم ۱۹۱۴ء) |
| ۱۳۴۔ | میڈن Madan, A.C | Muhammet, ands heyake Panoje na hebarizs waslinin ne maturuki (London 1888. Eng Tr. London) |
| ۱۳۵۔ | مگنامی megneom, L. | (i) Allah il prefetc perma (Ester 1922)<br>(ii) Mohamet no imposter (London 1920) |
| ۱۳۶۔ | مینفریدی Menfredi, Vit | La Vite di Maometto, (Milens 1898) |
| ۱۳۷۔ | مارگولیتھ Margoliuth, D.S | Mohammad and the rise of Islam (Newyork 1905) |
| ۱۳۸۔ | مراکی Maraoci, Loiws | Muhammeti Vita reumpla gest synopsls (Rous 1691) |
| ۱۳۹۔ | مارٹن Martin, M.J | Historia-del falsey perver so Profata Mahoma (madrid 1781) |

۱۴۰۔ مینازیس Menezes, J.L — The life and the religion of Mohammed the porphet of arabia (London 1921)

۱۴۱۔ مسارا Messara, Pina — Maosttosil paradisns (1946)

۱۴۲۔ مل Mills, chsrles — An History of Muhammadonism London 1817)

۱۴۳۔ مل مین Mileman, H.R — Memories of the life of Mahomet London 1727)

۱۴۴۔ مونٹیرو Monters Yvidal, J — Mahomd, su vida (Madrid 1727)

۱۴۵۔ موسس Moses, the Lew giver — False Divinities: on Moses, christ and Mahomet and other riligious Deoaptivee (London 1870)

۱۴۶۔ مور Moore, G.F — History of Religion Judism christiainty, Mohamodenism (Newyork 1929)

۱۴۷۔ میور Moir, sir William — The life of Mahomet from - gsngi source (London 77)

۱۴۸۔ موزے Mozray, D.S — Spriritual heroes & study of the world's prophets (Newyork 1955)

۱۴۹۔ ناتھن Nathone, C.A — Vite di Moometto (rome 1846)

۱۵۰۔ نکلسن Nicloson, R.A — A Literraty history of the arabs (Newyork 1907)

۱۵۱۔ نولدیکے Noldeke, Thesior — Das Hcben Muhammed's boah are qiellen popular darqistett (Hcmover 1863)

۱۵۲۔ نارتھ Northe, C.R — An out line of Islam (London 1934)

۱۵۳۔ واٹ Watt. W.M — (i) Muhammad at Mecca (1959)
(ii) Muhammad at Medina (1956)
(iii) Muhammad prophet and statesman. (London 1981)

۱۵۴۔ ویل Well, Gustav — Mohammad de prophet Seinlebsn sn and scine Lehre (Stuttsert 1843)

۱۵۵۔ ویلجیس Wellejus, H. — Fre missionen blanat Muhammet edaners (Denmark 1909)

۱۵۶۔ والسٹن Wollaston, Sir A.N — Some hours with Muhammad being a pupuler account of the prophet of Arabia and of his more immediate followers together with a short synopsis of the religion he founded (London)

۱۵۷۔ ویاز Wueas, Frianchich — Muhamed and sein work (stuitturt 1953)

| | | |
|---|---|---|
| ۱۵۸۔ | وسٹنفیلڈ Wustanfeld | (تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرۃ ابن ہشام مع تعلیقات) اراضی مدینہ منورہ۔ تاریخ اشراف مکہ وغیرہ |
| ۱۵۹۔ | ویٹیر Vatteir, Plerre | L' Illstore Mahometane (Paris 1657) |
| ۱۶۰۔ | ویلارڈ Vieflard, Rede | (i) Mohammad, Messenger d Allah (Philip 1657) (ii) Mohammad (A Bengali Account of the life of Muhammad) calcutta. 155 |
| ۱۶۱۔ | والش Wellich, J.U | Religio Turcioo, Mahometisirta (sucearum 1659) |
| ۱۶۲۔ | ہوس Heas, Hans | D & s Bild Muhammeds in waneli der Zeiten (Barlin 1915) |
| ۱۶۳۔ | بٹسالا Buda Netale, Peter | Mohamed elet sstav a past 1878 |
| ۱۶۴۔ | ہیڈلے Headley Roulad, G | The there great Prophets of the world (Waking 1923) |
| ۱۶۵۔ | ہگنز Higins, Godfray | An Apology for the life and character of the celebrated prophet of Arabia called Mohammed the illustrious. (London 1829) |

۱۶۶۔ ہلارڈ Hillre Frederick H History of Mehomed the great importure. (Falkirk 1821)

۱۶۷۔ ہوویل Howell, W.R.B.V Mohammed B (Eatavia 1939)

۱۶۸۔ ہولباش Holbach, Powl, H Moisa, Jesus, Mahomet (valencia 1903)

۱۶۹۔ ہولما Holme Harri Mahomet, Prophetedes Arabes (Paris 1946)

۱۷۰۔ ہالینڈ Holland, Erith The story of Mohammed (London 1914)

۱۷۱۔ ہرگرونج Hurgronge O.S Worksin selected (ed) (London 1957)

۱۷۲۔ اتین مارک Etionne mare quarteimer

۱۷۳۔ اڈمنڈ کاسل Edummund Castell

۱۷۴۔ اڈولف وارمنڈ Adolf Wahrmound

۱۷۵۔ البرتوس شولفتز Albertus Scehultens

۱۷۶۔ الفرڈ اکتاف بل Alfred Petave bel

۱۷۷۔ امیلو لافوئنتے الکنترا Emilo Lafouentey Alcontara

۱۷۸۔ اربی نیوس Erpenues

۱۷۹۔ ایڈلر Adler . C

۱۸۰۔ اسٹینلے ڈین Stanley Deen

۱۸۱۔ الفسٹن Elphistano

۱۸۲۔ امبریکو آف مینز Embico Pf mainz

۱۸۳۔ اسمتھ Smith. W.C

| | |
|---|---|
| Otto Ricbard | ۱۸۴۔ اوٹو |
| Allaxander Rose | ۱۸۵۔ الیگزینڈرروس |
| Alles, T.W | ۱۸۶۔ الیس |
| Alcocke, Nathan | ۱۸۷۔ اکلوک |
| Amos Pseud | ۱۸۸۔ اموس |
| Ugedi Santalla | ۱۸۹۔ اجودی سانتالا |
| Edward J. Jurji | ۱۹۰۔ ایڈورڈ جے جرجی |
| Ehriharth, Jacob | ۱۹۱۔ احرث |
| Ahlwardt, Wilheln | ۱۹۲۔ الورث |
| Imberdis Victor | ۱۹۳۔ امبرڈس |
| Sperher, Jakob | ۱۹۴۔ اشپرہر |
| Spien Bernard | ۱۹۵۔ اسپائن |
| Spird Jean | ۱۹۶۔ اسپائرد |
| Adelard of Bath | ۱۹۷۔ اڈیلرآف باث |
| Brown, E.G | ۱۹۸۔ براؤن |
| Bersine, N | ۱۹۹۔ بیریزین |
| Barthold, V.V | ۲۰۰۔ بارتھولڈ |
| Burahardt, L | ۲۰۱۔ برخارث |
| Beauveis Vincent De | ۲۰۲۔ بی وائز |
| Badger, G.P | ۲۰۳۔ بجر |
| Barrou, J.J | ۲۰۴۔ بارو |
| Bartol | ۲۰۵۔ بارٹول |

| | |
|---|---|
| ۲۰۶۔ باڈیر | Baudier, Michel |
| ۲۰۷۔ بازن | Barin, Louis |
| ۲۰۸۔ بینسن | benson, A.C |
| ۲۰۹۔ بتھمان | Bethman, W.C |
| ۲۱۰۔ بیون | bevan A.A |
| ۲۱۱۔ بھلیانڈر | Bihliende, Theodor |
| ۲۱۲۔ بلم | Blum, Ernest, Alfred |
| ۲۱۳۔ بوساشیو | Baccacio, Govanir |
| ۲۱۴۔ بولیتھو | Bolitho, William |
| ۲۱۵۔ بیکر | Becker, G.H |
| ۲۱۶۔ بریفالٹ | Briffanli, R.S |
| ۲۱۷۔ بنگ | Byng E.J |
| ۲۱۸۔ بارکر | Barker, E |
| ۲۱۹۔ برنارڈ لوئیس | Lewis, E |
| ۲۲۰۔ بیل | Bell, R. |
| ۲۲۱۔ پوکاک | Pocock, E. |
| ۲۲۲۔ پوسٹل۔قواعد اللغۃ العربیۃ ۱۵۳۸ء | Postel, G |
| ۲۲۳۔ پیرون۔ ترجمہ الطیب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد ۱۸۶۰ء | Perron, A |
| ۲۲۴۔ پکتھال (ترجمۃ القرآن، الثقافۃ الاسلامیہ) | Pickthold, M.W |
| ۲۲۵۔ پامر | Palmar, E.H |

| | |
|---|---|
| ۲۲۶۔ پالگریو | Arabia-1876- (Palgrave) |
| ۲۲۷۔ پرائس | History of Mohammden Dynesties (Major price London 1812) |
| ۲۲۸۔ پیٹر | Peter the Venerable |
| ۲۲۹۔ تھوفین | Theophanes, Saint |
| ۲۳۰۔ تھامس برٹران | Thomas Bertran |
| ۲۳۱۔ تھامر | Thomr son J.W |
| ۲۳۲۔ تھامسن | Thom, son William |
| ۲۳۳۔ ٹیٹس | Titus M.T |
| ۲۳۴۔ ٹوری | Tory, Pauoford H |
| ۲۳۵۔ ٹریٹن | Tritton, A.S |
| ۲۳۶۔ ٹرولش | Trottsch, Charlotle. F.X |
| ۲۳۷۔ تشودی | Tochudi, R |
| ۲۳۸۔ تھیوڈور فیلم جان | Theodore Wilholum Jean juynoboll |
| ۲۳۹۔ جرترو دمارگریٹ۔انگریز مستشرقہ | Gertrude margret lowthian bell |
| ۲۴۰۔ جوتلف برک | Gotlhelf Berg strasser |
| ۲۴۱۔ جارج جیکب | Jacob, Goerge |
| ۲۴۲۔ جویدی | Ignaelo Guidi |
| ۲۴۳۔ جلازد | Ejnard Glaser |
| ۲۴۴۔ جان ارتو کی | Jean Arthoski |
| ۲۴۵۔ جبرئیل فیران | Gebriel Ferrand |
| ۲۴۶۔ جبرئیل لیوان | Gabriel Levang |

| | |
|---|---|
| ۲۴۷۔ جربردی اورلیاک | Jerbert de oraltec |
| ۲۴۸۔ جیر | Boer, B.J |
| ۲۴۹۔ جرازبری | Jarazbhry, A.Q.A |
| ۲۵۰۔ جیکل | Jackel, R |
| ۲۵۱۔ جیمز ڈی روڈا | Jimel De Roda. R |
| ۲۵۲۔ جان | John V |
| ۲۵۳۔ جونز | Jones David |
| ۲۵۴۔ جونگ | Jong, P. De |
| ۲۵۵۔ جانسن | Johnson, E,N |
| ۲۵۶۔ جان کینٹینو | John Contiouen |
| ۲۵۷۔ جونز | Sir William Jones |
| ۲۵۸۔ جان آف دمشق | John of Damacus |
| ۲۵۹۔ جانسٹن | John Ston |
| ۲۶۰۔ جان لڈگیٹ | John Lodgate |
| ۲۶۱۔ جین بررڈ | Gane Beraed |
| ۲۶۲۔ چازکو | Chadz Ko, A.B |
| ۲۶۳۔ ھٹی | Hitti, P.K |
| ۲۶۴۔ درنبرگ | Derenbourg. H |
| ۲۶۵۔ دینی | Etienne Dinet |
| ۲۶۶۔ دی ساسی | Antoine Isac Silveste de seoy |
| ۲۶۷۔ دورن | Barnherdt Dorn |
| ۲۶۸۔ دانتے | Dante |

| | |
|---|---|
| ۲۶۹۔ دی خویہ | Dee je, M.J.De |
| ۲۷۰۔ ڈیکوئیل | Decoil |
| ۲۷۱۔ ڈلبرگ | Delberg. F.V |
| ۲۷۲۔ ڈالاپورٹ | Dalaporte, P.H |
| ۲۷۳۔ ڈائس | Dias Eduerdo |
| ۲۷۴۔ ڈیل | Diebl, Charles |
| ۲۷۵۔ ڈابس | Dobs, Narcus |
| ۲۷۶۔ ڈی لنگر | Delinger, J.J |
| ۲۷۷۔ ڈوگارک | Dugarric, f |
| ۲۷۸۔ ڈن | Dunn |
| ۲۷۹۔ ڈیلاویڈالیوی | Della Vidam G. Levi |
| ۲۸۰۔ ڈیفریمرے | Charles Franoois Defrenery |
| ۲۸۱۔ رینکے | Ranke, Loopoid, Von |
| ۲۸۲۔ راتی جی | Rattigen, W.H |
| ۲۸۳۔ ریناخ | Reinedh, Bsimon |
| ۲۸۴۔ رسک | Reisk, J.K |
| ۲۸۵۔ ریوش | Reusoh, R |
| ۲۸۶۔ رائمنڈ | Reymond, J |
| ۲۸۷۔ رٹر | Ritter, K |
| ۲۸۸۔ رویر | Ruper, C.L |
| ۲۸۹۔ راجر بیکن | Roger Becon |
| ۲۹۰۔ راڈویل | Redvell, J.M |

| | |
|---|---|
| Reckendorf | ۲۹۱۔ ریکنڈوف |
| Rogenthol, B.I.J | ۲۹۲۔ روزنتھال |
| Rosenthi, I | ۲۹۳۔ روزنتھال |
| Sabastien Rosenvalle | ۲۹۴۔ روزنیوال |
| Victor Romonviobe Rosen | ۲۹۵۔ روزن |
| Laseon Rasmosson | ۲۹۶۔ رازموسن |
| Zam Brini, F | ۲۹۷۔ زمبرینی |
| Zwemer, S.M | ۲۹۸۔ زویمر |
| Saohar. E | ۲۹۹۔ زخاؤ |
| Zattersteen, K.V | ۳۰۰۔ زیٹرسٹین |
| Sasmiento, Mantin | ۳۰۱۔ ساسمنٹو |
| Sarsano, M.Y.S | ۳۰۲۔ سرسانو |
| Servien, Andoe | ۳۰۳۔ سرویر |
| Sine, W. | ۳۰۴۔ سائن |
| Simon, Gotterfried | ۳۰۵۔ سائمن |
| Solero, Silvio | ۳۰۶۔ سلیرو |
| Saurdel, D | ۳۰۷۔ سارڈل |
| Sauth y, R | ۳۰۸۔ سودے |
| Sykes, Sir Percy | ۳۰۹۔ سائیکس |
| Syburg, F | ۳۱۰۔ سائیرگ |
| Severy | ۳۱۱۔ سیورے |
| Bertholony St. Hailaire | ۳۱۲۔ سینٹ ہلیر |

| | |
|---|---|
| ۳۱۳۔ سان پیڈرو پیسکال | Sen Pedro Pescual |
| ۳۱۴۔ سدیو جان جاک | Sadillot, J.J |
| ۳۱۵۔ سلیم نوفل | Alim |
| ۳۱۶۔ شن | Sohuon, F.J |
| ۳۱۷۔ شول | Soholl, Adolf |
| ۳۱۸۔ شروڈر | Sahroeder, E |
| ۳۱۹۔ شودن | Victor A |
| ۳۲۰۔ شولتز | Shultens |
| ۳۲۱۔ شاخت | Schacht, J |
| ۳۲۲۔ شولتز | Schultens, J.J |
| ۳۲۳۔ شوفاجیہ | Jean Sauvaget |
| ۳۲۴۔ شیخاس | Francis Joseph Steingase |
| ۳۲۵۔ طنطاوی، الشیخ محمد عیاد | |
| ۳۲۶۔ غریفینی | Eugeino Griffini |
| ۳۲۷۔ فلکے | Falke, Robert |
| ۳۲۸۔ فنگر | Fingar, Charles |
| ۳۲۹۔ فنلے | Finlay, G |
| ۳۳۰۔ فشر | Fisher, A.M |
| ۳۳۱۔ فلیگل | Flugel, C.L |
| ۳۳۲۔ فوٹین | Foutans Marivo, E |
| ۳۳۳۔ فوسٹر | Foster, H.F |
| ۳۳۴۔ فری مین | Freeman, E.A |

| | |
|---|---|
| Fuck, J | ٣٣٥۔ فک |
| Alfrad Von Kremer | ٣٣٦۔ فان کریمر |
| Fleischer, R. L | ٣٣٧۔ فلایشر |
| August Ferdinmd Mohcan | ٣٣٨۔ فرڈینڈ |
| Gottbold wail | ٣٣٩۔ فیل |
| Constantinus African | ٣٤٠۔ قسطنطین الافریقی |
| Cantu, Cesare | ٣٤١۔ کانتو |
| Carra de Voo, B | ٣٤٢۔ کارا |
| Cash, W.W | ٣٤٣۔ کیش |
| Cawe, Sydney | ٣٤٤۔ کیو |
| Clarke, Janes, F | ٣٤٥۔ کلارک |
| Clenardu, W | ٣٤٦۔ کلینارڈس |
| Cragg, keneth | ٣٤٧۔ کریگ |
| Curio, C.A | ٣٤٨۔ کیوریو |
| Kaibel, F.V | ٣٤٩۔ کیبل |
| Kallerhaels, E | ٣٥٠۔ کلرہال |
| Klein, F.A. P | ٣٥١۔ کلین |
| Krehl, C.L.E | ٣٥٢۔ کرے ہل |
| Carlyl, H.H. Macartney | ٣٥٣۔ کارلائل |
| William Curreton | ٣٥٤۔ کیورٹین |
| J.C.L Kosegarten | ٣٥٥۔ کوزے گارٹن |
| Cond,e | ٣٥٦۔ کوندے |

| | |
|---|---|
| ۳۵۷۔کوڈیرا | Franciscns Codera Zerdin |
| ۳۵۸۔کروگر | Kruger |
| ۳۵۹۔کلودکاہن | Cohen, N |
| ۳۶۰۔کولن جارج | Colin, C.S |
| ۳۶۱۔کاظم مرزا بک | |
| ۳۶۲۔کرمسکی | Kraynsky, A.E |
| ۳۶۳۔کراتشوئسکی | Kratch Kiosky, J.J |
| ۳۶۴۔کلورلے | Calverley, E.E |
| ۳۶۵۔کلستینو | Clestino Schisperelli |
| ۳۶۶۔گیر | Gear, Joseph |
| ۳۶۷۔گارڈے | Gardet, L |
| ۳۶۸۔گولڈسیکر | Goldsack, William |
| ۳۶۹۔گڈرچ | Goodrich, C.A |
| ۳۷۰۔گیبرٹس | Gribertus |
| ۳۷۱۔گیدی | Guidi, M |
| ۳۷۲۔گیام | Gui Uenme, Alfred |
| ۳۷۳۔گوئٹے | Goethe |
| ۳۷۴۔گرینیام | Grunebaum, C.E.V |
| ۳۷۵۔لسڈن | Lausden Johen |
| ۳۷۶۔لابیوم | La Beaume, J |
| ۳۷۷۔لفیٹے | Laffitte, Pieare |
| ۳۷۸۔لنٹ | Lnnt, Theodor |

| | |
|---|---|
| ۳۷۹۔ لاتھ | Lyth, Honricus |
| ۳۸۰۔ لیبان | Lebon. Dr.G |
| ۳۸۱۔ لیفی پروفنسال | Levi Provencil, E |
| ۳۸۲۔ لارنس | Lowronoo,t E |
| ۳۸۳۔ لین | Bdward William Lane |
| ۳۸۴۔ لینڈ برگ | Carlo Landborg |
| ۳۸۵۔ لیس | Uilllam Nassan Lees |
| ۳۸۶۔ میکڈونلڈ | Maodonald, D.E |
| ۳۸۷۔ ماس | Maas'b Honrt |
| ۳۸۸۔ مازاس | Acas, Laxander |
| ۳۸۹۔ مورلے | Illiam Hook Mrley |
| ۳۹۰۔ مینسنگ | J. Petrus M Mansing |
| ۳۹۱۔ مل مین | Milman |
| ۳۹۲۔ مورس | Maurice. F.D |
| ۳۹۳۔ میلبوگنار | Melb Gunnar |
| ۳۹۴۔ نرکاڈیر | Nercadier |
| ۳۹۵۔ مارکیل | Markel B.b.c |
| ۳۹۶۔ میار | Mayer, Bdward |
| ۳۹۷۔ میر | Mayer. J.J |
| ۳۹۸۔ میرس | Mayerns, P |
| ۳۹۹۔ میمیر | Meymier, E |
| ۴۰۰۔ میرد | Miorow, C.c |

| | |
|---|---|
| ۴۰۱۔ میور | Mair Jobn |
| ۴۰۲۔ موزرے | Moozery, F.da |
| ۴۰۳۔ مویر | Moyor, E.s |
| ۴۰۴۔ منرو | Monro, D.c |
| ۴۰۵۔ مینارڈ | Meynard, Barbiar de |
| ۴۰۶۔ مونٹے | Montot, Ed |
| ۴۰۷۔ میشو | Michacx Bellire, E |
| ۴۰۸۔ ملر | Augurt Muller |
| ۴۰۹۔ متفخ | Eugen Mittwoch |
| ۴۱۰۔ مرکس ملر | Marcos Josoph Maller |
| ۴۱۱۔ ناتھر | Nather, E.s |
| ۴۱۲۔ نونسپال | Nanobsl, I |
| ۴۱۳۔ نیل | Neale, W.h |
| ۴۱۴۔ نیلسن | Neilson. J.b |
| ۴۱۵۔ نی مین | Niemana, A.k |
| ۴۱۶۔ نللینو | Nallino Carin Alionao |
| ۴۱۷۔ نبیہ عبود | Abbot, N |
| ۴۱۸۔ نسطاس بازنطینی | Niectes of Byzntine |
| ۴۱۹۔ والٹیر | Voltaer, F.m |
| ۴۲۰۔ وارف | Wayriffe, V |
| ۴۲۱۔ ایہازن | Wellhausen |
| ۴۲۲۔ ویلز | Wells, H.g |

| | |
|---|---|
| Welzhofer, H | ۴۲۳۔ ویلز وفر |
| Wensinok, A. j | ۴۲۴۔ وینسنک |
| William Monier | ۴۲۵۔ ولیم |
| Woods Mathew | ۴۲۶۔ وڈس |
| White Joseph Blansd | ۴۲۷۔ وہائٹ |
| Wyborno, Josoph | ۴۲۸۔ ویبرن |
| Marcais, W | ۴۲۹۔ ولیم مارسہ |
| Wright, w | ۴۳۰۔ ولیم رائٹ |
| Frantz Wozpcks | ۴۳۱۔ وپکے |
| Johan. G. Wotestoin | ۴۳۲۔ ویٹسٹین |
| Hottinger, J.h | ۴۳۳۔ ہاتنجر |
| Hallan | ۴۳۴۔ ہالان |
| Hackspan | ۴۳۵۔ ہیکس پین |
| Hall, M.p | ۴۳۶۔ ہال |
| Hartman, M | ۴۳۷۔ ہارٹ مین |
| Hommer, P.j | ۴۳۸۔ ہیمر |
| Hauri, Joh | ۴۳۹۔ ہوری |
| Haurt, C.l | ۴۴۰۔ ہارٹ |
| Havet. Eroest | ۴۴۱۔ ہیوٹ |
| Hackins, A.F.H | ۴۴۲۔ ہاکنس |
| Herbolot d | ۴۴۳۔ ہربیلوٹ |
| Hell, Josoph | ۴۴۴۔ ہیل |

| | |
|---|---|
| ۴۴۵۔ ہربل | Herbal of de Molainville |
| ۴۴۶۔ ہالفن | Halphea. L |
| ۴۴۷۔ ہرمیلن | Herualin, D |
| ۴۴۸۔ ہجین | Higden Ranulf |
| ۴۴۹۔ ہنڈاس | Hondae, O,v |
| ۴۵۰۔ ہبنر | Hubner, F |
| ۴۵۱۔ ہیوز | Haghes, J.p |
| ۴۵۲۔ ہیوز | Hughes, William |
| ۴۵۳۔ ہاروے | New Comb Harvoy |
| ۴۵۴۔ ہمفرے | Prideautt Humphrey |
| ۴۵۵۔ یوپی نیوس | Eupenuie Thomc B |
| ۴۵۶۔ یولوجیس قرطبی | Eulogius Cordovan |
| ۴۵۷۔ یوجین یونگ | Eugene Young |

# مستشرقین اور مطالعہ سیرت

ڈاکٹر نثار احمد صدیقی

## تمہید

ہمارے یہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور ومتعارف ہو چکا ہے، اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علما کی کمی نہیں ہے، جو مستشرقین کی علمی مساعی ان کے تحقیقی کاموں اور ان کے مالہ وما علیہ سے واقف نہ ہوں، تاہم اسلامی علوم کے حوالہ سے بالعموم اور مطالعہ سیرت کے حوالہ سے بالخصوص مستشرقین کے کام کی نوعیت ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت وکمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ کے سامنے خاص طور پر پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

## تعارف

واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارے میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہو چکی ہے ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب وظلم اپنی انتہا پر تھا، اور ان کی تحریروں میں بے باکی وگستاخی فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی، جس سے بعضوں کو خود شرم آئی، لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی، مختلف عوامل کے نتیجہ میں شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے اور انکشاف حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہو گئے، یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق اور مستشرقین، مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے، نتیجہ یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کیے گئے تھے، ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو تو ان پر نظر ثانی بہر حال کی جانی چاہیے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے

نظریات واقعتہً تبدیل کر لیے ہیں، اور بعض حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے ہیں۔

آغاز کار

دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے اور پرائے سب پر کھلتی جا رہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات، دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں، علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل، فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جا رہی ہے، انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، مثلاً (۱) العقیقی، نجیب المستشرقون، دارالمعارف، مصر ۶۴۔۶۵ء (ج، تا ۳)۔ (۲) احمد ابراہیم خلیل، المستشرقون وللبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ ۶۴ء (۳) زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر ۶۵ء (۴) الہرادی حسین، المستشرقون، دارالسلام، المجلس الاعلیٰ للشئون السلامیہ ۶۵ء۔ (۵) البہی، محمد والمستشرقون فی مقمم من الاسلام، الازہر، طبع جدید۔ (۶) الدسوقی، حمد الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۷۲ء (۷) شبلی، عبدالجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ۷۷ء (۸) مبرمہ دکتورہ عفاف المستشرقون و مشکلات الحضارۃ، دارالنہضۃ العربیہ قاہرہ ۸۰ء، ان میں سے اول الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے، جو سرنامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (تقریباً ۱۲۰۰ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئزرلینڈ، سویڈن، روس امریکہ وغیرہ کے تمام قابل ذکر مستشرقین اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا

آغاز سرسید احمد خاں م ۱۸۹۸ء اور ان کے رفقاء سے ہوا، اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعہ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسید احمد خاں نے ہی کھولا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ سرسیّد کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا اور راسخ العقیدہ علماء کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سرسید نے جذبہ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف دی لائف آف محمد ﷺ (حیات محمد ﷺ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور ذرائع کی کمی کے باوجود اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید ومحاکمہ کر کے مناظرانہ رنگ سے پاک تاریخی حقائق واسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب ''الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ لکھی اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین یورپ فی الواقع سیرت رسول ﷺ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے، اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت سے مآخذ زیور طبع سے آراستہ ہوکر مسلمانوں تک پہنچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابل اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرت رسول ﷺ کا اعتبار اٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔

## ابتدائی جائزہ

سرسید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسے بعد میں مزید توسیع وترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا، اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھیں گئیں، لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلی (م ۱۹۱۴ء) کو حاصل ہوئی، وہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی، علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انھوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانہ تنقید نہیں بنایا بلکہ انھوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسول ﷺ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کے جواب میں علمی وتحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی

زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنچا سکتے تو سیرۃ النبی ﷺ، مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہرحال مطبوعہ سیرۃ النبی ﷺ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے یورپین تصنیفات کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات ان کے اسباب و محرکات ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں نتیجہ طلب ہونے کے باوجود نہایت دقیع ہیں۔

علاوہ ازیں، علامہ شبلیؒ چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبی ﷺ کو دراصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیار تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقب تو گویا انتہائے مقصود تھا، اور ان کی زندگی کی آخری خواہش تھی، غالباً اسی لیے انھوں نے سیرۃ النبی ﷺ کے مجوزہ خاکہ میں پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا، جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا، تاہم آنے والوں کے لیے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلیؒ مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بہ حد غایت ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرت رسول ﷺ کے مطالعہ و تحقیق کا کوئی بڑا اور منظم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا، انفرادی و اجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات و مضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہرحال ہو رہی ہے، مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب حیات محمد کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا۔ جو اگرچہ عربی زبان میں ہے، لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے، ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ جامدین عن المسلمین کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا، بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لیے بھی کتاب لکھی ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں المستشرقون والحضارۃ الاسلامیہ کے تحت مستشرقین کی معاندانہ

سرگرمیوں اور ان کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرت ﷺ کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے اور جرأت وقوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔

**نوعیت مسئلہ**

یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریک استشراق کا قرار واقعی جواب اردو زبان وادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے مولانا شبلیؒ نے منظم و موثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب سرگرمی نہ ہونے کے برابر ہے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب ولہجہ کے فرق کے ساتھ تاحال جاری وساری ہیں اور ان کے عزائم ومقاصد میں بھی سرمو فرق نہیں آیا ہے، لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام واہتمام صفر ہے، مولانا شبلی وغیرہ نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور ان کے معیار کی جو نشان دہی کی تھی اور ان کی تصانیف کو جس طرح کذب وافترا کا دفتر قرار دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم اسلامیہ میں بالعموم اور سیرت رسول ﷺ کے باب میں بالخصوص واقفیت تامہ حاصل کرکے، ان کی غلطیوں، بددیانتی اور تلبیس وتحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا، اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوسکا، بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا، نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کرسکیں اور ان کوششوں کو متحد ومنظم کرسکیں جو انفرادی واجتماعی اور نجی وسرکاری، مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں، ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز ہے، مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لیے اسی تیاری کی ضرورت ہے، جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی

(مثلاً علم و تحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس و تفحص کے آداب فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب و ثقافت کا گہرا مطالعہ ضروری علوم و فنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ متعین مقاصد اور انتھک محنت و ریاضت وغیرہ)۔

مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود ان مسلمان محققین و علماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم و تحقیق کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال و مناظر سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انھی کے ہم آواز ہو جاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلہ اوّل میں مسئلہ مستشرقین کی نوعیت و حقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق و مستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب و محرکات عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام و مشاہیر کی عام صورت کیا ہے، زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے۔

## استشراق، مستشرق

استشراق اور صاحبان استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق، اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود چونکہ اسلام پیغمبر ﷺ اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کے حوالہ سے بہرحال معاندانہ رہی ہیں اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ و فکر کی نمو ہوگئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں، شاید یہی وجہ ہے کہ:

(ا) استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں، بلکہ انگریزی زبان و ادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی

کے اواخر میں شروع ہوا، چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورۂ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں مشرق یا مشرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، پھر اسی سے اورینٹل ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے، مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں، جب کہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز وادا، اقدار، علوم وآداب اور فنون وثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ، نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا، مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مشرق) اس سے مراد وہ شخص ہو گا جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق ماہر مشرقیات ہو۔

(ب) عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق تو موجود ہے، لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی ومفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے، جس کا مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص ولوازم یعنی اتخاذ وطلب، وجدان وحسبان اور تحول وتکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبان استشراق کے احوال وشخصیات سے اور ان کی تحقیقات وتخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم اکتسابی ہے، جسے انھوں نے بڑی محنت وریاضت سے طلب وجستجو کر کے حاصل کیا، اس کی خاطر سفر وحضر، تھکن وتوطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین وظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے، مختصر یہ کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا ہو اردو لغت وادب میں بھی کم وبیش یہی

مفہوم ہے یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو۔

زبان ولغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت وماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جاسکتی ہے تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جب کہ استشراق السنہ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم وآداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض وعناد، اس کا جز لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض وعناد، پہلے پہل تو مشنری جذبائیت کا آئینہ دار رہا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت، علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک ایک مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کرلی اور اسی رویہ سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں، قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں، اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے چیلنج بن سکیں، عربی زبان کے لیے کہا گیا کہ قرآنی عربی، عہد جدید کی ضروریات وحالات سے مطابقت پیدا نہیں کرسکتی، اس لیے مقامی باتیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کردینا چاہیے، پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت وکردار کے بارے میں ان نکات کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ لے سکیں، اور ان کے لائے مشن کو ناقابل التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب وثقافت کی تعمیر ترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تاکہ اسلامی ثقافت مجموعہ خرافات ٹھہرے وغیرہ وغیرہ، ان تمام معاملات کا ہدف بہرحال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمت عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان وپیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے

رویہ پر خود انھوں نے نظر ثانی کی اور بدنیتی کے باوجود مخالفت ومخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب وظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا اسی لیے ان کے ہاں علم تجربہ، انداز استدلال مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے فکر وفن اور تحقیق وتالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لیے اس اجمال کی کچھ تفصیل، آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبہ وفکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ وتحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ وسلوک کیا رہا۔

## تحریک استشراق کا آغاز:

تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام کے خلاف بالخصوص، بغض وعداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفور جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر وتصنیف اور وقائع واشعار کے قالب میں ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایہ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد ہی کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانی اسلام کے حوالہ سے ان کی مخالفت ومخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق وواقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے۔ اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب، ان کے دلی جذبات کے علاوہ، یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لیے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انھیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم وکشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ

میں بار بار دہرائے گئے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں، صلیبی محاربات کا سلسلہ دشمنی وعداوت کا ایسا نشان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہوگئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی وفکری محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لیے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم ومعلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی ناکارہ وخام سہی! ان کے لیے بہرحال مفید مطلب تھیں جس کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جاسکتی تھی، اور سیرت ختم الرسل کو افراط وتفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جاسکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبر اسلام کے بارے میں مغرب کے پاس معلومات، انتہائی مبہم اور ناقص تھی اور اس خمار کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت ﷺ کے واقعات سیرت کو پیکر خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد وافتراع اور کذب وافترا سے عبارت تھا۔ اس عہد میں آنحضرت ﷺ کے لیے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے گئے، مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپ ﷺ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو، اور بہروپیا کہا گیا اور عداوت میں اس حد تک گر گئے کہ آپ ﷺ کے لیے لفظ محمد ﷺ استعمال کرنے کے بجائے (Naeod) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں ''شہزادہ ظلمات'' پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتش عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضور ﷺ کے لیے Baphoet, Maphoet اور Bafum کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپ ﷺ کی سیرت وسوانح کے بارے میں مہمل کہانیاں دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں، ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکز پرستش

محمد ﷺ کا بت تھا، پھر ایک سے زائد تین بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ تو دراصل خود پیرو دین عیسوی تھے، لیکن پوپ منتخب نہ ہوسکے تو انتقاماً روی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام ایجاد کیا، وحی وتنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمد ﷺ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا، ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا، جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء ومستشرقین، صدیوں کیسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت وسوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں، لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت اور دشمن کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمد ﷺ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضور ﷺ کی ذات اقدس پر جنسی وشہوانی الزامات کی بھرمار کردی، اس نے حضور ﷺ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کے حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرونِ وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا متبع کرتے ہوئے تصویر رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد کیے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم وبیش یکساں تھے، اسی لیے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسل ﷺ کو افراط وتفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال وقیاس کے

سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرت ﷺ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتی رہی کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب وسائل اور تدبیر وحکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کرلیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نیا ترکش اور نئے تیر استعمال کیے جائیں اور گرم جنگ نہ سہی سرد جنگ میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم وتحقیق کی معنوی اسلحہ لڑی جائے، شاید اسی لیے رائمنڈلل (Raymindiall) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک پرامن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں؟

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق ومغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارے میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں بیہودہ الزمات واتہامات اور تشکیک وتذبذب کے بیج بوکر خرافات کا ایسا جنگل اگایا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کردیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم وفن کے دائروں میں جوترقیاں کررہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوچکی تھیں، اور یوں ان کے آباء واجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا، علاوہ ازیں علوم وفنون اور آداب ومعارف کے اسلامی مراکز سے اخذ واستفادہ کے لیے اور اندلس وصقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع عرفان وحقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم وفنون سے واقفیت بالکل

ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آ گیا جب کہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا، سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلا وفضلا لیں گے جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے اور درس وتدریس کی مسندوں پر فائز ہوکر داد تحقیق دیں گے تاکہ ادھر ان کے ان دیکھے جذبات نفرت وعداوت بھی تسکین پائیں اور ادھر علم وتحقیق کے حوالہ سے ان کا رعب ودبدبہ قائم ہو جائے، چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل کو (G. Postel) کو سامنے لائیں جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا بادا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت ولسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں۔ پوسٹل ہی کے لیے ۱۵۳۹ء میں کلیہ فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا، گیام پوسٹل کے کام کو لغت ولسانیات کے ہی مکرر حوالہ سے اس کے لائق وفائق شاگرد جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا، بہرحال کم وبیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا، جس کا سہرا بڑی حد تک ڈیوک آف تسکانی (Tuscane) کے سر ہے۔

اوپر کی تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں یعنی:

(ا) یہ کہ سولہویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا سرآغاز قرار دے سکتے ہیں، یہی وہ دور ہے جب کہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط ومنظم نقشہ مرتب کیا۔

(ب) اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری وساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا۔

## تحریک کا ارتقاء:

تحریک استشراق کے حوالہ سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقاء، اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا، جہاں تک سترہویں صدی

عیسوی کا تعلق ہے، بقول مولانا شبلی، یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، اور یورپ کی جدوجہد، سعی وکوشش اور حریت وآزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے، جس کے پنجہ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام اترتا چلا گیا، یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارے میں معلومات جمع کی جانے لگیں، عربی زبان کی ماہیت وخاصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ ارپی نیں (Erpenius, 1584.1626) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی، پھر اس کے اتباع میں اس کے شاگرد جیکب جولیس (Jacob Golius, 1595.1667) نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، اور پھر ۱۶۳۸ میں ایڈورڈ پوکاک (E. Pococke, 1604. 1691) پہلا انگریز مستشرق تھا، جسے آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا صدر نشین بنایا گیا، مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میرنسکی (E. Meurnski) نے بھی ۱۶۸۰ء میں انجام دیا، اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب وتمدن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ادارہ ڈی ہربیلوٹ (D' Herbelot) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا، اس ادارے نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شائع ہوئی تھیں، ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو پر از معلومات تھی، اسی ادارہ کے تحت آنحضرت ﷺ پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام وسیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع، معلومات سابقہ کے مسالے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنہ وسطی کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انھوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا، اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں، البتہ جو مستشرقین، مطالعہ سیرت رسول ﷺ کے حوالے سے سامنے آئے، ان میں مندرجہ

ذیل قابل ذکر ہیں:

(۱) ولیم بیڈول (W. Bedwell) انگریز مستشرق تھا، جس کا زمانہ ۱۵۶۱ تا ۱۶۳۲ ہے، اس کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں، ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے، اور ۱۶۱۰ سے پہلے شائع ہوئی، اور دوسرے سیرت رسول ﷺ پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ میں شائع ہوئی، سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی محمد کاذب رکھا گیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

(۲) وایٹر (Vattier. P) فرانسیسی مستشرق تھا، اس کا زمانہ ۱۶۱۳ تا ۱۶۶۴ ہے، اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

(۳) ہانجر (Hotiinger. J. R) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق (۱۶۲۰ تا ۱۶۶۷) اس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸) قابل ذکر ہے۔

(۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق بہ زمانہ (۱۶۳۱ تا ۱۶۷۶) اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ میں شائع ہوئی) کا نام ہے۔ (An Account of The Rise And Progress of Mohametanism) کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں تو اسے سیرت رسول ﷺ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسول ﷺ کے بارے میں اوّلین اعتذار ہے۔ اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مسیحی مصنّفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا، جب کہ ان مصنّفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے، جو انھوں نے اخلاق و کردار نبوی ﷺ کی کھینچی تھی، اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ اس آسمان کے نیچے سوائے محمد ﷺ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اُسے نگاہ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا

گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔ (ص ۲۱۱)

دوسرے مستشرقین میں سے جین بررڈ (Gene Brard) کا زمانہ اگرچہ ۱۵۳۵ تا ۱۵۹۷ تھا، لیکن اس کا موقف تقریباً سترہویں صدی میں عام ہوا، وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا، جین بررڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضور ﷺ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لیے کہ محمد ﷺ (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے، جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس لیے اس کے نقطہ نظر کے مطابق قرآن عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا۔

۱۶۵۳ میں الیکزنڈر روس نے (Alexanoer Ross) نے اپنی کتاب (Pondebli) شائع کی، وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالہ سے سامنے آئی، لیکن اس کے ایک حصہ میں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے حالانکہ اس کی پہلی کتاب حیات محمد ﷺ کا مختصر جائزہ قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی، لینلوٹ ایڈیسن (Lancelot Addison) نے ۱۶۷۸ میں سیرت پر ایک کتاب شائع کی اگلے سال یہی کتاب نئے عنوان (حیات وممات محمد ﷺ) کے نام سے سامنے آئی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرت ﷺ کے خلاف اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب قرآن کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا، ایک اور مستشرق ہمفرے پرائی ڈیکس (Prideaux Humphrey) نے حضور ﷺ کی سوانح لکھی، لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا، اور دوسروں کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعی کاذب، مکار، فریبی قرار دیا۔ اس پر تماشہ یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی تک دوسروں کے لیے "معیاری کتب حوالہ" بنی رہی، ایک ہی سال (۱۶۹۷) میں دو اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ میں ہوگیا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے

بڑے علماء استعمال کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق، منازل ارتقا طے کرتی رہی، البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رخت سفر، کم وبیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہوگئی، اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ رنگ وآہنگ اور آواز وانداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل ونگاہ میں گنجائش پیدا کرکے اثبات ومعروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف ومدح اسلام وپیغمبر اسلام ﷺ میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کیے ہوئے نظریات بہر حال گرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انھی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متشددانہ ومتعصبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت وانصاف پسندی کا رجحان بھی جاری وساری ہوگیا، اور اس رجحان نو کا ساز غالباً، اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان (H. Relant) نے ۱۷۰۴ء میں (De Religinoe Mohama Dica) لکھ کر چھیڑا، اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل مآخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں'' اور برملا کہا کہ تاریخی انصاف کے ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے، پھر اس نے ''نوازی'' میں پیری بائل اور بولین، ولیرز وغیرہ بھی شامل ہوگئے۔

مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی صرف بانظر شفقت دیکھا اور افہام وتفہیم کی جانب پیش قدمی کی۔

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی وانفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں، خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا بقول مولانا شبلیؒ یہ وہ زمانہ ہے، جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے اورنٹیلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ شرقیہ کے مدارس کھولے مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاء تک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا، اور آخر کار ان

مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔ السنہ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک اور ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارے میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں۔

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالہ سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا، چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پالیا، اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصور اور مخصوص سلوک اور رویہ نے بھی جنم لیا، اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں۔

(۱) سائمن اوکلے (Ockiey.s) انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۷۸ تا ۱۷۳۰ تھا، اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر ۱۷۰۸ تا ۱۷۱۸ شائع ہوئی، یہ تین جلدوں میں تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مستشرقین کے نتائج تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا۔

(۲) ایڈورڈ پوکاک، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۳۸ تا ۱۷۲۷ تھا، اس کا ہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گزر چکا ہے۔

(۳) جارج سیل انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۹۷ تا ۱۷۳۶ تھا، اس نے ۱۷۳۴ میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا اور بعض مستشرقین کے کلمات خیر کے ردعمل میں آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا۔

(۴) جین گیجنیر (Gagnier. J) انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۰ تا ۱۷۴۰ تک کا تھا، اس نے دو کتابیں شائع کیں، ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ولیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ولیر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو ۱۷۴۸ میں ایمسٹرڈم سے نمودار ہوئی۔

(۵) رسک (Reiskeoj. J) جرمن مستشرق، جس کا زمانہ ۱۷۱۶ سے ۱۷۷۴ تک تھا، وہ جرمنی کا

کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا، اور یونانی زبان وادب پر سند مانا جاتا تھا۔

(۶) ایڈورڈ گبن، انگریز مورخ، زمانہ (۱۷۳۷ تا ۱۷۹۴) اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لیے خاصی شہرت کا حامل، اس نے ۱۷۵۰ میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں نہایت دل آزار رائے کا اظہار کیا اور رواداری کے دعوی کیا باوجود، آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (نعوذ باللہ)

(۷) والٹیر (Voltaire, Fr) فرانسیسی مصنف زمانہ ۱۶۹۴ تا ۱۷۷۸ء اس نے پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا، یہ ڈرامہ اگر تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا، تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین، شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے، یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ میں منظر عام پر آیا، اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی، جنھوں نے اسلام اور آنحضرت ﷺ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا، اس نے ڈرامہ کو پوپ پانز دہم کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۲ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا چنانچہ ڈیڈی روٹ (Diderot) اس فحش نگاری پر بھی اتر آیا کہ ''محمد ﷺ دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی ومعقولیت کے دشمن تھے۔ (نعوذ باللہ)

## تحریک استشراق کا عروج

انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اوّل تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط وانحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ

معیشت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف ''مغرب'' کو زمانہ بیداری کے بعد سے سیاسی عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی، ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالادستی حاصل ہوتی چلی جارہی تھی، اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ اوزار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو اقوام مغرب کے لیے بہرحال خوش آیند تھی، اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا، چنانچہ زیر نظر دور (۱۸۰۰ تا ۱۹۲۵) تحریک استشراق کو عروج و کمال سے عبارت ہے، اس عہد میں تحریک استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا، مستشرقین کی انداز و اطوار اگرچہ بدل گئی تاہم کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے ان کے خلاف اپنی اسلاف پر بازی لے گئی، چنانچہ:

(ا) کمیت کا انداز تو اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی۔ اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے، جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے، مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بیلجیم، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلام کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا، اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا، اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا، جو آج بھی باعث حیرت ہے، قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافات قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں،

ان کی محنت وریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں، بلکہ یہ ان کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں، مسلمانوں تک پھر سے پہنچیں اور مشہور ومتعارف ہوئیں۔

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسب سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف وتالیف میں حصہ لیا، ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف حقیقت میں، انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے، مثلاً گاڈ فرے ہگنز، کاسن وی پر سیوال، ویل، رینان، گوئٹے، شول، کارلائل اور درمنگھم وغیرہ۔

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا، اس کی بظاہر وجہ ایک تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل واستدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے۔ مشرقی ممالک کے مشاہدات واسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کردی، اور بیان و واقعہ کا تضاد سامنے آگیا، دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، نیز ہمت پسندی، سائنسی ایجادات واختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئے، ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں، نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودت کے جذبات غالب آگئے تھے، بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انھیں نقطہ نظر بدلنے پر مجبور کردیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بہرحال اصل درجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعہ عملاً یہ پیش آیا کہ:

(الف) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہوگئیں اور الزامات واتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہوگیا، نیز۔

(ب) صورت حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیے، جنھوں نے جرأت سے کام لے کر اپنے پیشرو مصنّفین کی تغلیط کی، اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(ج) اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس، ۱۸۲۲ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، ۱۸۲۳ اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۳ وغیرہ، ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیے جن سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی، لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں رسائل وجرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لیے متذکرہ بالا مجلّات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل وجرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا، چنانچہ ہندوستان (The Muslim World) کا اجرا پیرس سے ۱۸۹۵ء میں (Revae. De. Islam) کا اجرا روس سے ۱۹۱۳ میں (Nir Islam) کا اجراء وغیرہ، رسائل وجرائد اور مجلّات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں، لیکن بہ باطن مدعا، اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا، رہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوام یورپ کی بالادستی کا، اور استعماری تسلط کا، بہر حال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۳ میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنایا گیا، عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کے لیے بڑا مفید طلب تھا، مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء وفضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قرار دادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریک استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے بہر حال ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا۔

بہر حال یہ تفصیل، اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اوّل

تک کا زمانہ تحریک استشراق کا دور عروج وکمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں بہت منظم طریقہ سے، ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں، اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی اور معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ بدل ڈالا، تاہم یہ جائزہ ہم آئندہ صفحات میں عہد جدید کے تحت لیں گے۔

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جان جاک سیدیلو (Seillot, J.J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (۱۷۷۷ تا ۱۸۳۲) تھا، متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے۔

(۲) دیور جے (Deavergers, A.K) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۰۵ تا ۱۸۶۷) اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں، تاریخ ابو الفداء سے سیرۃ النبی ﷺ خلاصہ متن وترجمہ کے ساتھ، ۱۸۳۷ میں شائع کیا، بلاد عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت، عہد مغلیہ تک مطبوعہ ۱۸۴۷۔

(۳) ڈاکٹر پیرون (Parron, A) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۰۵ تا ۱۸۷۶) مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام وبعد مطبوعہ ۱۸۵۰ء نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی، از جلال الدین ابی سلیمان داؤد مطبوعہ ۱۸۶۰ء۔

(۴) گارسن دی تاسی (Lassy Garcin De) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء صاحب تصانیف دین اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات وفرائض وغیرہ۔

(۵) جوزف وہائٹ (White J) انگریز مستشرق زمانہ (۱۷۴۶ تا ۱۸۱۴ء اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات ومحاضرات اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر خطبات۔

(۶) سلیم رائٹ (Wright, K) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹)

(۷) ایڈورڈ ہنری پامر (Palner, E.h) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ

آکسفورڈ ۱۸۸۰ء زمانہ (۱۸۴۰ تا ۱۸۸۳ء)

(۸) ڈی جونگ (Jong, Ae) ہالینڈ کا مستشرق زمانہ ۱۸۳۶ء تا ۱۸۹۰ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جو جے (Goeje, N. j.db) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا، متن اور لاطینی میں ترجمہ لیڈن سے ۱۸۸۱ء میں شائع کرایا۔

(۹) ڈی جو جے۔ ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء ۱۹۰۹ء) کثیر التصانیف، وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن وترجمہ کی اشاعت کی۔

(۱۰) فلائشر (Floibciner H.L) جرمن مستشرق تھا، زمانہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابی الفداء کو متن وترجمہ کے ساتھ تعلیقات وحواشی سے آراستہ کر کے لیپزنگ سے ۱۸۳۱ء میں شائع کرایا، ایک اور کتاب تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپزگ سے اسی سنہ میں چھپی۔

(۱۱) وستن فیلڈ (Field, F Wusten) جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات وحواشی (تین جلدیں) اراضی مدینہ منورہ اور تاریخ اشراف مکہ وغیرہ کتابیں اس کی یادگار ہیں۔

(۱۲) بیریزین (Beresine) مشہور روسی مستشرق (۱۸۱۸ء ۱۸۹۶ء) گویا روسی مستشرقین کے زمرہ اساتذہ میں شامل متعدد تصانیف، مصادر اسلامی تہذیب وتمدن اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم وادب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں۔

(۱۳) بلانکو (White Jobeph Blanco) مشہور مستشرق برطانوی مذہبی مصنف (۱۷۷۵ء ۱۸۴۱ء) مستند پادری، خاص کام کا میدان، اندلس کی تاریخ تھا۔

(۱۴) ایڈورڈ سخاؤ مشہور ومعروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ خود بڑا اسکالر اور زبان داں تھا، بقول مولانا شبلیؒ، پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات

مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تالیف نہیں شائع ہوئی۔

(۱۵) سلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، سرخیل مستشرقین روس میں سے ایک تھا، زمانہ (۱۸۲۸ء-۱۹۰۲ء) توطن لبنان کام فرانسیسی میں کیا سیرۃ نبویؐ اور اسلام تعلیمات پر تصانیف۔

(۱۶) فان کریمر (Voncremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی تعلیم بھی وہیں پائی ترقی کر کے وزارت کے درجہ تک پہنچا اور وفات تک، وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا، ان میں سے واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ نشوان کا قصیدہ الحمیر یہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں کثرت سے کتابیں لکھیں، جو جرمن زبان میں ہیں۔

(۱۷) سرولیم میور، مشہور انگریز مستشرق، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔

(۱۸) مینارڈ (Maynord, B.D) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۲۷ء-۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کر دیا جغرافیائی، تاریخی، ادبی لغت مرتب کی، مسعودی کی مروج الذہب کا متن وترجمہ شائع کیا۔

(۱۹) رینی باسے (Basset, Rene) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۵۵ء-۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں کا مصنف مثلاً الشعر مغربی قبل اسلام مطبوعہ ۱۸۸۰ء بوصیری کا قصیدہ بردہ، نقد شرح مع ترجمہ مصنف وغیرہ وغیرہ۔

(۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon, D.g) فرانسیسی مستشرق مشہور عالم طبیب اور تمدن وسفارت مشرق کا جاننے والا مورخ تھا، ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا متعدد ضخیم کتابیں لکھیں، تمدن مصر تمدن عرب اور اندلس میں عربی پر کام قابل ذکر ہے، اس کا شماران مغربی مستشرقین میں ہوتا ہے، جو انصاف پسند تھے، اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے۔

(۲۱) گولڈ زہیر، ہنگری کا مشہور ومعروف مستشرق (۱۸۵۰ء ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف شخص تھا، قرآن، تفسیر حدیث، سیرت پر بے شمار دراسات شائع کیے، گولڈ زہیر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولدیکی کے نقد حدیث سے آگے بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا، انکار حدیث کے بعد گولڈ زہیر نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا۔

(۲۲) ولہازن، جرمن مستشرق (۱۸۴۴ء ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد مدینہ میں دین اسلام کے مطالعات، عہد نبوی میں دستور مدینہ، مکاتب نبویؐ اور وفود، منقول از ابن سعد مع متن وترجمہ، وہ پروٹسٹنٹ تھیولوجین اور بائبل پر عبور رکھتا تھا۔

(۲۳) واشنگٹن اردنگ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق (۱۷۸۳ء ۱۸۵۹ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، خصوصا سیرت محمد ﷺ اور خلفاء پر دو جلدیں جو ۵۰۔ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئیں، اس کی کتاب حیاۃ محمد ﷺ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا۔

(۲۴) یوجین یونج (Eugen. Younge) فرانسیسی مستشرق متعدد کتابوں کا مصنف، ایک ضخیم رسالہ نور اسلام خاص کرن، دوسرا مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا، سیرۃ نبوی ﷺ بزبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ، انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرون وسطیٰ کا مسیحی دماغ بھی بدلتا چلا گیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اگرچہ ان کے عزائم، اور مقاصد میں فرق نہیں آیا، تاہم دین اسلام اور سیرت رسول ﷺ کے بارے میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک یکساں نہیں رہا، اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی، خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہوگی، بہر حال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

عہد جدید

پچھلا دور جو بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اختتام کو پہنچا، جیسا کہ ظاہر ہوا، تحریک استشراق کا

نقطہ کمال ثابت ہوا، اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں سے فروغ پایا، اب وہ دور جسے ہم عہد جدید سے تعبیر کر سکتے ہیں، بیسویں صدی کے ربع اوّل سے شروع ہوا اور تا حال جاری و ساری ہے۔

عہد جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا اور سیاسی و عسکری اور معاشی و سماجی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر و زبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی و مغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات۔ نو آبادیاتی علاقوں کی بیداری، ظلم و استحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت و آزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست و ریخت، ایجادات و اختراعات کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب و تمدن کے تنوع نے حالات و مسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا، ادھر استشراق کے حوالہ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ تحریک استشراق پچھلے دور میں جس نقطہ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوال کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی، اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریک استشراق رو بہ زوال ہو گئی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کر لیا گیا تھا، اسے بہر طور باقی رکھا جائے، دوسری طرف اسلام پیغمبر اسلام اور عالم اسلام کے اعمال و احوال میں زیادہ انہماک، توجہ اور امعان نظر، برتا جانے لگا، جزوقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علماء نے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، اور دوسرے اسلامی و مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں، یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہیں تھا۔ مگر ان کے اشتغال و انہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے، اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے۔

مطالعہ سیرت کے حوالہ سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت، جسے ویل گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری ساری رہا اور الفانسو آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آ جاتے ہیں، اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب اور اشاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا، بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملہ میں اپنی محنت دریافت سے ایک طرح کی

اجارہ داری حاصل کر لی، اور دوسری طرف، اسلامی ومشرقی مصادر پر نقد وجرح کے کام بھی وسیع پیمانہ پر انجام دیا جانے لگا یہ غالباً تحریک استشراق کے مقاصد سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مصادر وماخذ کا اعتبار اسی طریقہ سے اٹھ سکتا تھا۔ اور مشرقی اذہان وقلوب میں تشکک وتذبذب کے بیج بوئے جا سکتے تھے، اس ضمن میں قرآن سنت اور دوسرے مصادر سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور مآل کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ بس پکے مفاد پرست سیاسی رہنما تھے، اور مذہبی خلوص وسچائی ان میں بہت کم تھی۔

اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے، ان میں سے چند قابل ذکر ہیں۔

بعض مستشرقین نے سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ طبی اور معالجاتی (Patholerienl) نقطہ نظر سے کیا کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہو کر آنحضرت ﷺ کو محض ایک معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے اہمیت دی، اور کچھ نے ان سب سے مرکب ومرتب نظریہ قائم کیا، یہ تمام نقطہ ہائے نظر دراصل مخصوص ذہنی وفکری پس منظر کی پیداوار تھے، طبی اور معالجات نقطہ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ وقف قائم کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ (خاکم بدہن) نفسیاتی ودماغی امراض کا شکار تھے۔ انھیں مرگی کے دورے پڑتے تھے، اور ہنری لائنس کی دریافت یہ ہے کہ یہ دورے حد درجہ شہوت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، اس سے پہلے اس نقطہ نظر کی ترجمانی مشہور برطانوی مستشرق سپرنگر کر چکا تھا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ خدانخواستہ آنحضرت ﷺ کا نظام اعصاب چونکہ مختلف تھا۔ اور آپ ﷺ نعوذ باللہ ہذیان واضطراب اعصابی کے مریض تھے، اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اوران کی سیرت میں اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے، طبی اور معالجاتی نقطہ نظر کو مزید تقویت، مطالعہ سیرت میں علم النفس کے اصول کی اطلاق سے تھی اس کے تحت اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوشش کی گئی اور اس معاملہ میں فرانز بہل (Frants Buhl) اور طور اینڈ رے (Tor And Rar) نے سبقت دکھائی، اور حق ترجمانی ادا کیا۔

زیر بحث دور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں اشترا کی نقطہ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے، مارکس اور انجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے اپنا حلقہ اثر پیدا کیا

اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت وفروغ اور پیغمبر اسلام ﷺ کی کامیابیاں دراصل سیاسی سماجی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں، چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ گرائم (Hubort Grime) کا نام معاشی نظریہ کے ارتقاء کی علامت بناء اسلام اور پیغمبر اسلام پر اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا، کہ اسلام کو ایک مذہبی ودینی نظام کی بہ نسبت ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہیے، اور آنحضرت ﷺ کو پیغمبر کے بجائے صرف ایک سیاسی سماجی اور معاشی مصلح سمجھنا چاہیے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگولیتھ نے اور گہرا کیا، اور اس نے اپنے مطالعہ سیرت میں آنحضرت ﷺ کو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا، اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ مکہ میں اپنی دکان سے لے کر مدینہ میں ایک مملکت کی تعمیر تک تیئیس (۲۳) سال کا عرصہ لگایا، پھر دریدہ دہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو نعوذ باللہ ڈاکوؤں کا سردار اور مدینہ کا ظالم اور مستبد لکھنے میں بھی تکلف نہیں کیا، اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی نے اپنے دیو پیکر کام کا ماحصل یہ قرار دیا کہ آنحضرت ﷺ بس ایک چالاک سیاست داں تھے، اور انھوں نے معاشی وسیاسی مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ (خاکم بدہن) محمد ﷺ پکے مفاد پرست تھے، اور اپنی سیاست بازی میں انھوں نے اپنی ترہبیت کو پس پشت ڈال دیا تھا، مطالعہ سیرت میں انتہا پسندی، خلاف حقیقت بھی تھی اور خود گروہ مستشرقین میں سے بھی بعض نے اسے پسند نہیں کیا، تاہم مستشرقین نے بین بین رویہ اختیار کیا، مثلاً عہد جدید کا مشہور مورخ ٹائن بی اپنی عظیم الشان تصنیف مطالعہ تاریخ میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے، اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارے میں بھی عمومی طور پر معقول رویہ کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب سیرت رسول ﷺ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ کی حیات طیبہ کو دو (۲) مراحل میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے، جب کہ آنحضور ﷺ کا قیام مکہ میں رہا، اس دوران میں بقول ٹائن بی آپ کلیتہً مذہبی مشنری سرگرمیوں میں منہمک رہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں مدینہ پہنچ کر انھوں نے بقول ٹائن بی، مذہبی مقاصد سے الگ ہوکر سیاسی سرگرمیوں کو جاری کیا، وہ بہرحال اس

خیال کی پرزور تردید کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک بہروپیا تھے، ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہوا ہے کہ اس کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام ایک مثالی پیغمبر تھے۔ بلاشبہ حضور ﷺ کی زندگی، آپ کی حیات طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے، اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث وسیر کے ذخیرے میں بہرحال ایک حصہ ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی قسم کا نقطہ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے۔ مطالعہ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں تحریر کیں۔ واٹ کی تصنیفات کو بہرحال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی، واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس (۵۰) سال میں ''علمیت'' نے جو ترقی کی ہے اس کا مظاہرہ اس کی تصانیف میں نظر آتا ہے، اور اس کی تصانیف اسلامی مآخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح وتنقید سے زیادہ مختلف نہیں ہے، کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو مکہ اور مدینہ میں مختلف سمجھتا ہے۔

بہرحال عہد جدید کا یہ عمومی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہد جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے انداز تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہوگئے ہیں، اور بہت سے معاملات میں انھوں نے بالکلیہ رجوع کرلیا ہے، تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریک استشراق کا اصل محرک جذبہ اب بھی کارفرما حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ عہد جدید کا ایک مصنف فرانسیسکو جریئلی اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ''پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری ہے۔'' علاوہ ازیں اس صورت حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ، ڈبلیو، سعید کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے، کہ استشراق اور اس کی تحریک کا اہتمام وانضباط، بنیادی طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا اور اورینٹلزم ۲۰۳، ۲۰۱ اور استشراق کو جہان مشرق پر اس وقت مسلط کیا گیا، جب کہ مشرق، مغرب کے مقابلہ میں مغلوب ومنفعل تھا، اور پھر ''قوت وضعف'' کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج پیدا کر دیے۔ ایضاً ۲۰۴ استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رُخ ہیں ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو

(Latent) اور دوسرا ظاہری، خارجی رخ (Manifest) پہلا داخلی رخ تو ہمیشہ سے ایک ہے جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا جب کہ دوسرا ظاہری پہلو متغیر ہوتا رہا۔ یعنی مشرقی معاشرہ وتہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارے میں خیالات وافکار بدلتے رہے، مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کے حوالہ سے آتی رہی، لیکن داخلی جذبہ استشراق ہمیشہ سے آج تک یکساں محکم ومستحکم رہا، اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا نہیں ہوا، (ایضاً ص ۳۰۶) بہرحال خلاصہ یہ کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ اور سلوک ودستور کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ موثر علمی روایت ہے۔ (ایضاً ص ۳۰۲)

عہد حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے، کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین کا تعارف پیش کر دیا جائے۔

(۱) مونٹے (Montet, Ed) (۱۸۵۶ تا ۱۹۲۷) اس کی علمی یادگاروں میں اسلام حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ء) الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) اور فرانسیسی میں ترجمہ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں۔

(۲) گاڈ فرے ڈی ممبائن (Goude Frey De Mombynes, H) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۲ء۔۱۹۵۴ء) پیرس میں مشرقی علوم والسنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف مثلاً اسلام میں نظم (۳۱ء) مکہ ومدینہ (۱۹۱۸ء) عالم اسلامی ﷺ اور بازنطینی صلیبیوں تک (۱۹۳۱ء) وغیرہ۔

(۳) کارلوالفانسونل لینو، اطالوی مستشرق، زمانہ (۱۸۷۲ء۔۱۹۳۸ء) بے شمار مصنفات ومطبوعات اس سے منسوب ہیں، مثلاً منتخبات القرآن (لیپزگ ۱۸۹۳ء) اسلام سے پہلے قبائل عرب کی تکوین وترتیب (۱۸۹۳ء) تاریخ میں قبل اسلام (۱۹۲۷ء) ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل وتراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ اور حیات محمد ﷺ جو اس کے انتقال کے بعد روم سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔

(۴) سرتھامس آرنلڈ، انگریز مستشرق، زمانہ (۱۰۶۴ء، ۱۹۳۰ء) اس کی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام ہے، (مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء)۔

(۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault, Robert) برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب دی میکنگ آف ہیومینٹی تھی۔

(۶) اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق.......... (زمانہ ۱۸۵۴ء، ۱۹۳۱ء) مورخ ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ (۱۸۷۴ء، ۱۸۹۲ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے۔

(۷) نکلسن، مشہور برطانوی مستشرق، متعدد تصانیف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن و نیو یارک ۱۵۰۷ء) اور اس کا مضمون محمد اور قرآن نیز محمد ﷺ کی ایک نامعلوم سوانح، نکلسن کا زمانہ (۱۸۶۸، ۱۹۴۵) ہے۔

(۸) نولد یکے، مشہور جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۳۳ء، ۱۹۳۰)۔ تصنیفات زیادہ تر سامی زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر، نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل، سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ ۱۸۶۳ء)۔

(۹) ہرگرونج (Hergronge S,H) ہالینڈ کا مستشرق زمانہ (۱۸۵۷، ۱۹۳۶) اس کے آثار میں، مکہ کا حج، فقہ، اسلامی اور سیاست نبوی ﷺ شامل ہیں، مذہبی عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں، ماہر اسلامیات سمجھا جاتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتدا سے ہی سیاسی مذہب تھا، بہرحال اسے اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں، اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق متصور کیا۔

(۱۰) ونسک، ولندیزی مستشرق (۱۸۸۱ء، ۱۹۳۹ء) اس کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا موقف، جو اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بھی تھا، اور لندن سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، نیز محمد ﷺ اور یہود الاسلام (مطبوعہ ۱۹۱۱ء) وغیرہ کتابیں ہیں۔

(۱۱) زاخاؤ، جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۴۵ء، ۱۹۳۰ء) جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی، (سیرۃ النبی ج ا ص ۹۲)۔

(۱۲) جوزف ہوروز (Horovitz, J) جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۷۴ء، ۱۹۳۱ء)۔ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا، مطبوعہ ۱۸۹۸ء۔

(۱۳) جوزف ہیل، جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۷۵ء، ۱۹۵۰ء) آثار میں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے۔

(۱۴) کارل بروکلمان، جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۶۸ء، ۱۹۵۶) بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف، تاریخ اقوام مسلم ہے، اس میں آنحضرت ﷺ پر تحریر قابل ذکر ہے۔

(۱۵) بارتھولڈ، روسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۹ء، ۱۹۳۰ء) تصانیف کثرت سے ہیں، مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن رضی اللہ عنہ عبدالعزیز۔

(۱۶) سموئل زویمر (Zewe. Mer, G) امریکی نژاد، عاجل علماء مستشرقین، اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلاد عرب، دنیا میں اسلام، حیات محمد ﷺ، اسلام صحرائے عرب میں اور ورثہ نبوی ﷺ وغیرہ ہیں۔

(۱۷) ایچ۔ جی۔ ویلز، انگریز مستشرق، زمانہ (۱۸۸۲ء، ۱۹۴۶ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ متعدد تصانیف یادگار ہیں، خصوصاً دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، میں محمد ﷺ اور اسلام۔

(۱۸) گب، اس عہد کا مشہور ترین برطانوی مستشرق، ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوا اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے، گب کی تصانیف اگر چہ بہت سی ہیں، تاہم اصل شہرت کتاب محمد زم ﷺ سے ہوئی جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی، کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے خود تو جیہات پیش کی ہیں، لیکن یہ نام و توجیہات خود اس کے شاگرد سمتھ کو پسند نہیں آئیں، معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ گب کے یہاں، مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقاء واقع ہوا، اور وقت وحالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں

سے ملتا ہے، اپنی عمر کے آخری ایام میں بہر حال اس نے اسلام کے بارے میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔

(۱۹) ولفریڈ کینٹویل، اسمتھ، گب کا شاگرد، جولائی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا، پی، ایچ، ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں ایک اور مستشرق فلپ کے ہٹی کی زیر نگرانی، تحقیقی مقالہ مجلہ الازہر، تجزیہ وتنقید پر حاصل کی، مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف حال پروفیسر رملیجن ڈلہوزی، یونیورسٹی کناڈا۔

(۲۰) جوزف شاخت، جرمن مستشرق، پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی، خالص یہودی، اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں، لیکن اصل کام قانون اور اصول فقہ اسلامی پر ہے۔

(۱۲) برنارڈ لوئیس، عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق ۱۹۱۶ء میں لندن میں پیدا ہوا، تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں عربس ان ہسٹری، اسلام ان ہسٹری کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار ہے۔ اسلام دشمنی کے لیے مشہور ومعروف ہے۔ اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں سرفہرست ہے۔

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن تحریک استشراق کے کیف وکم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے، اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریک استشراق اپنے آغاز اور عروج وارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار سے دوچار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنّفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا، مستشرقین کی نوجوان نسل، زمانہ کے حالات ووسائل کے پیش نظر ذہن وفکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہو رہی ہے اور بعض جدید مفکرین و مصنّفین مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے، پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ اب طاقت وقوت کے سارے اوزان وپیمانے بدل گئے ہیں، استعمار اور استحصال کی لغات بدل گئی ہیں، علمی وذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر، فلک، فضا اور زمین دیکھ رہا ہے، اس لیے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کا بگل بجادے، اس لیے بقول ایک مصنف ''وقت

آ گیا ہے کہ اسلامی مفکرین وعلماء اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین ومخالفین اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آرا ہوں، البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریب نظر (Myth) ہے" جانسن ہلی ٹینٹ اسلام ص ۸۵ لندن ۹۷ء۔

## اسباب ومحرکات:

تحریک استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے، اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے، اور بین السطور تحریک کے اغراض ومقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہو چکی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات واسباب کو صاف صاف بیان کر دیا جائے چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اسلام اور ادیان غیر میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اسلام کا نظریہ حیات، اس کا نظام فکر وعمل اس کے تہذیب وتمدن کا اظہار یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے، پھر دانائے سبل، ختم الرسل ﷺ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس نے روز اول سے ہی ادیان باطلہ کی نفی کر دی تھی، .............. اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں، اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت وقساوت دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

"تم دیکھو گے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں، اور مشائخ بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔" (مائدہ)

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں، یہود، نصاریٰ اور مشرکین

ہیں، ان کو اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں، بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان، اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔

(۲) نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے، محمد رسول ﷺ کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا، اور اس کے علم برداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیائے مغرب آج تک انگشت بہ دنداں ہے، خاص طور پر اس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم وفارس کا سر غرور سے یوں سرنگوں کیا، کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا، بہرحال اسلام کی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت واشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی ونظریاتی رفعتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے، شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیروزبر کر دیا، اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی، یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

(۳) محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریک استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا، صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام ونامراد ہوئیں اور (۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک کے) معرکہ ہائے صلیب وہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ اس لیے انھوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی وفکری محاذ کو منظم کیا جائے، یہی فیصلہ بالآخر تحریک استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔

اس سلسلہ میں لارڈ ایلنی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے، کہ فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں، مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے، ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔

ایک فرانسیسی Pierremar Tino اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے یہاں تک کہ انھوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدان ادب میں لے لیا۔" چنانچہ تحریک استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں۔ اور اس طرح تحریک استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ واقعتہً عسکری محاذ پر ان کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا، مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لو لینے لگیں اور رفتہ رفتہ ان کی آتش عداوت دامن مشرق کو جلانے لگی۔

(۴) مستشرقین من حیثیت المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل ونسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں، گویا اختلاف دین ومذہب کی بنا پر ان کے جذبات وخیالات تو پہلے سے ہی مذہبی بغض وعداوت (Religious Hostility) کے آئینہ دار تھے، اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی ماخذ سے دور صدیوں جہالت و بے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے، اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظم ﷺ کے بارے میں کم وبیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صریحاً ظن وتخمین اور وہم وگمان کی پیداوار تھا، چنانچہ بے سرو پا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ وفسوں لچر قصے کہانیاں اور اسی طرح کا بلا تحقیقی خام مواد مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے، (جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں بھی سامنے آچکا ہے، اور کچھ جھلکیاں آئندہ فصل میں سامنے آئیں گی) پھر دوسری طرف جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا۔ اور مستشرقین اسلامی ماخذ کی تحقیق وتفتیش میں

منہمک ہوئے، تب بھی انھوں نے دانستہ طور پر قرآن واحادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ نیز مشرقی مصادر کی ترتیب وتبویب کے سلسلہ میں، تمام محنتوں کے باوجود، فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے (سیرۃ النبی ﷺ از مولانا شبلیؒ ج اوّل ص ۱۱۰، ۱۱۱) بہرحال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا یعنی تشکک وتذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالم ﷺ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انھیں آمادہ بہ نفرت کرنا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بقول ایک مصنف ''ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے مقام فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں۔ انھوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چون وچرا درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انھوں نے اپنی جولانگاہ کے لیے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انھوں نے خلط مبحث سے کام نہ لیا ہو۔''

(۵) مسلمانوں کا زوال انحطاط بحیثیت مجموعی تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا، اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی واخلاقی زوال اور تہذیب وثقافت کے تنزل کا باعث ہوا۔ تو ادھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لے کر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر پندرہویں صدی عیسویں کے بعد سے انھیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوام یورپ نے ایشیاء افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا، اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ واضح تھا، مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی، اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں، انھوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار وعلوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں

اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

(۶) پندرہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی، اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا، اور ان کے ہاں علم وتحقیق بیداری، تہذیب وتمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا، اور انھیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انھوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں، انھیں مضبوط ومستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی وذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے، چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگریز تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم وفنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں کی تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی، بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں، جو ان کی تحقیق وتفتیش کے لیے ضروری تھی۔

(۷) مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق سے وابستہ تھے، اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتداء تجارتی تعلقات سے ہی ہوئی تھی، پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ وسفید کے مالک اور حکمراں بن بیٹھے۔ تاہم منڈی دالی تجارت میں وہ اب بھی منہمک تھے، استشراقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی طباعت واشاعت، مؤرخین کی کتابوں کی جلد فروخت اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ اہل یورپ کے تجارتی مفادات کے تحفظ وفروغ کا باعث بھی ہوا۔

اسباب ومحرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ تحریک استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے مالہ وما علیہ کو جاننے کے لیے کافی ہے، اس لیے اب ہم آگے بڑھ کر ایک نظر ان اعتراضات، الزامات اور مفتریات پر ڈالنا چاہتے ہیں، جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادی برحق سید الانبیاء والرسل ﷺ کی شخصیت وکردار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لیے ان کی تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔

## اعتراضات، الزامات، مفتریات وہفوات

مستشرقین کی جانب سے اسلام کے لیے بالعموم اور آنحضرت ﷺ کے لیے بالخصوص جو

طرزِ عمل اختیار کیا گیا، اس کا مختصر سا خاکہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اب جہاں تک سیرت رسول کے حوالہ سے ان کے اعتراضات اور الزامات کا تعلق ہے، اس مختصر مقالہ میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اس لیے ہی ممکن نہیں کہ اعتراضات و الزامات کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مستشرقین کی تحریروں میں، اُن کے پیدا کردہ لٹریچر میں، اور اُن کے خرافات کے ذخیرہ میں بکثرت صدیوں سے پائے جاتے ہیں، ان کے ہاں الزامات واعتراضات کی بہتات اس لیے بھی قابل فہم ہے کہ الزامات واعتراضات قائم کر کے (خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرت رسولؐ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، مستشرقین کی حکمت عملی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے، کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ اور وہ افراد جن کا علم و مطالعہ راسخ نہیں ان کے پروپیگنڈے سے بآسانی متعلق ومتاثر ہو سکتے ہیں، حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کے تمام اعتراضات والزامات کو مرتب کر کے اُن کا مفصل جواب دیا جائے، لیکن اِس کی نہ فرصت ہے نہ موقع، تاہم ذیل میں ہم مختصراً سیرت رسولؐ کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات والزامات بلکہ مفتریات کو نقل کر رہے ہیں تا کہ عام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ سیرت نبویؐ کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلا رہے ہیں اور کیسے کیسے الزامات واعتراضات عائد کیے ہیں، ان میں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے۔

### نام حسب نسب

(۱) یہ یاد کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام کا نام نامی اسمِ گرامی ''محمد'' (ﷺ) نہیں تھا بلکہ ماہومٹ (Mohomet) تھا، بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ ماہوند (Mahound) یعنی بقول ان کے ''شہزادہ تاریکی'' کا نام تجویز کیا، اور بعض کے نزدیک ''بافومٹ'' (Baphomet) اور ''بافسم'' (Bafum) تھا، ۲ ؂ نیچ ذات (Owbirth) تھے (العیاذ باللہ) اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شدومد کے ساتھ اپنی کتاب ''محمد اینڈ دی رائز آف اسلام'' مطبوعہ لندن (۴۷) میں پیش کیا۔ اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمدؐ ایڈنبرا ۱۹۲۳ء) ص (CXIV، CXV) ہی مسترد کر دیا بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت

ہے کہ آنحضرت ﷺ انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپ کے جدامجد ہاشم تھے جس کے ذمہ شہری مملکت مکہ میں افادہ کی ذمہ داری تھی۔ اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے اُن سے معاہدہ کیا کرتے تھے، (ملاحظہ ہو: صدیقی مظہر الدین، ص ۱۴۳) (۳) محمد دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardiusi) تھے۔ خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب ''اسلام'' کو ایجاد کر لیا، اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا۔ (۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقہ کے بانی تھے، (۵) مخالف مسیح (anti-christ) اور دشمن عیسائیت تھے، (۶) ترکوں کے پیغمبر تھے، (۷) بت پرست تھے (نعوذ باللہ) (۸) خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا۔ (۹) آپ بقولِ ایک مصنف، عرب منافق و ناپاک تھے۔ (۱۰) جین بررڈ (Gerebrard) کے نزدیک (خدانخواستہ) آپ حیوان (Beast) تھے۔ اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے جو ان کے حیوانی ماحول کے لیے مناسب تھی (۱۱) آپ ماشاللہ، شہوت پرست (Lescirous) تھے خود بھی ملوث تھے اپنے پیروکاروں کو بھی ملوث کیا، (۱۲) دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے، خوفناک، حدتک بے شرم تھے، (استغفراللہ) (۱۳) وہ ایک ہنر مند مکمل سیاست دان تھے۔

## نبوت ورسالت

نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خود خیالی (Auto Sugestion) خود الیعاذی اور القائے نفس کا، (۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے، (۱۶) وہ بزعم خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بہر حال دوسروں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ان پر وحی، اترتی ہے، محمدؐ نے ایک سفید دو دھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھا رکھا تھا، جو اُن کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے چگا کرتا تھا، اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتہ ربانی (جبرئیل) ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انھیں املا کرا رہا ہے۔ (۱۷) انھیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ

توہمات فریب مستی میں مبتلا تھے۔ ❶ (۱۸) نزولِ وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ ❷ (۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے، کیونکہ وہ غیر متوازن اعصابی مزاج والے آدمی تھے۔ ❸ (۲۰) اعصابی دورے پڑتے تھے اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں۔ یہ نولدیکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے۔ (۲۱) اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک ومتذبذب تھے۔ میور کے نزدیک ابتداً انھیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں، البتہ ایک طویل عرصہ تک، شک وتذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ تبلیغ ہوئے۔ (میور لائف آف محمد ۱۹۲۳ء ص ۴۶، ۴۷) یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے، اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے، اگر ذرا بھی تذبذب ہوتا تو اپنی زوجۂ محترمہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنے بھائی علی رضی اللہ عنہ کو اپنے جگری دوست ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کیوں کر مطمئن کرتے (۲۲) مذہبیت اور الہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا، (۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات کا علم تھا، (۲۴) نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا ❹ یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی ورسول کی حیثیت سے تسلیم کرلیں ملاحظہ ہو تفصیل جناب مظہر الدین صدیقی کا مضمون، اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد، جلد ۹ نمبر ۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے (صدیقی مظہر الدین ص ۱۴۴)

(۲۵) محمد (ﷺ) ان کے لغو خیال میں نبی کاذب تھے، (۲۶) وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب تھے، (۲۷) شیطان کے آلہ کار اور اس کے توہین آمیز جاسوس تھے، (۲۸) ترویج واشاعت مذہب کے لیے تشدد کا سہارا لیا، (۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا، (۳۰) حِطی کے خیال میں حضورؐ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور لامنس کے نزدیک ان کی مکی زندگی کے

---

❶ حماہ سے ص ۶۵۔

❷ ایضاً۔ عہد حاضر کا مستشرق واٹ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد ہے۔ (محمد پروفٹ اینڈ اسٹیٹس مین آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء ص ۱۹)

❸ حماہ کے ص ۳۔ ❹ حماہ سے ص ۶۵۔

حالات محض افسانہ (Fiction) ہیں، (۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرا سے خاص ملاقات رہی، (۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام وزنی الزام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی، لیکن مدینہ جاکر بادشاہی میں بدل گئی، اور وہاں لشکر کشی انتقام خون ریزی کا بازار گرم کردیا۔

## کارہائے نبوت ورسالت، واقعات سیرت

(۳۳) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی، (۳۴) میور لکھتا ہے ''کار نبوت کی ابتدا میں تو ایمان داری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انھیں بنیاد بنایا گیا۔ لیکن جب مطلب حاصل ہو گیا اور اقتدار حاصل ہو گیا، تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انھیں بالکل مردود قرار دے دیا'' (۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی۔ واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جاکر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم ''یہودیت'' سے بدل دیا جائے۔

(۳۶) تحویل قبلہ، (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت وعیسائیت سے بے زاری کی کوشش ہے)

(۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے (۳۸) محمدؐ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی (۳۹) منشور مدینہ (Charter of Madinah) میں حضور کا مقام و مرتبہ غیر معین تھا، (۴۰) حضورؐ کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے، مارگولیتھ لکھتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمدؐ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہوں کہ وہ اپنے ایک تکلیف دہ ہم وطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پاگئے۔ (صدیقی مظہر الدین ص ۱۳۸ تا ۱۵۰) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے، (۴۱) محمد ﷺ نے قریش مکہ کو (بلاوجہ) اپنے خلاف بھڑکایا، ❶ (۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی

---

❶ یہ مستشرقین کا عام الزام ہے، اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ غزوات پاکیزہ جذبات اعلیٰ وارفع مقاصد اور شوق شہادت کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب ومفلوک الحال عربوں کی تنگ دستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال ودولت کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو (قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر، ج شمارہ XIV ۵ مئی ۱۹۲۸ء ص ۷۷۔۸۷۔ نیز شمارہ ۹ ستمبر ۶۸ء) ص ۸۔

مہمیں تھیں، ❶ اور عربوں کی غربت و تنگ دستی دور کرنے کا ذریعہ، (۴۳) بعض یورپی مصنّفین کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب تھا، اور اہل عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے۔ ❷ (۴۴) جنگ موتہ، اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔

متفرقات

(۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرت ﷺ محض قیصر عرب تھے، ایک سیاسی لیڈر تھے (۴۶) جے سی" آرچر کے نزدیک محمد ﷺ محض ایک، صوفی اور مجذوب تھے، (۴۷) آپؐ (نعوذ باللہ) رہ زنوں قزاقوں کے سردار (Robber Chief) تھے۔ اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور محمدؐ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا، (۴۹) اسلام ایک اشترا کی رجحان تھا اور محمدؐ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر، (۵۰) وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے، (۵۱) کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔ ❸ عورتوں کے دوست سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے، ❹ (۵۲) آنحضرت ﷺ اور قرآن تہذیب کا تمدن حریت آزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی و سرکش دشمن تھے کہ ان جیسا دشمن صفحۂ ہستی پر نمودار نہیں ہوا۔ ❺ (۵۳) لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا، ❻ (۵۴) داستانِ غرانیق، ❼ شیطانی آیات، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے سورۂ نجم کی یہ آیت (۲۰) پڑھی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے: تلك الغرانیق

---

❶ دیکھیے صدیقی مظہر الدین (ص ۱۶۳) ۱۶۴۔ ❷ ایضاً۔

❸ سیرۃ النبی ص ۱۴۔

❹ صدیقی، مظہر الدین ۱۶۲ء (حضورؐ کی شادیوں اور تعداد ازواج کے بارے میں ذات رسالتؐ پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے جس کے ذریعہ وہ (نعوذ باللہ) آپ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان میں انھیں کوئی خیر پاکیزگی، عفت اور حکمت نظر نہیں آتی)۔

❺ ۳ حماہ سے (ص ۶۶) ❻ شبلی، ج ۴ ۱۱۔ ❼ ایضاً۔

العلیٰ وان شفاعتھن لترجیٰ ۔(یعنی یہ بہت معظم ومحترم ہیں اوران کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کومستشرقین بڑھا چڑھا کر کے پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بناڈالتے ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھئے سیرۃ النبی ج ۲۸۔۳۲۷۔۳۲۶) (۵۵) واقعہ حضرت زید وزینب رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زید بنؓ حارثہ کا نکاح کردیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکررنجی بڑھ گئی، آخر کار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی حضورؐ نے رسم جاہلیت مٹانے کے لیے اور حضرت زینبؓ کی دل جوئی کے لیے خود نکاح کرلیا۔ حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحا بوالہوسی تھی، (۵۶) ان کا آہنی تابوت خانہ کعبہ میں دوستونوں کے درمیان معلق رہا۔ (۵۷) ابتدا میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا، لیکن جب قوت واقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلہ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کرلیا، (۵۸) بانی اسلام سے ہجرت کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے قائم کی گئی، (۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا حالانکہ یہ ان کا خود ساختہ تھا۔

## اعترافات

اگرچہ گذشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے تاہم یہ اُن کے مطالعہ سیرت کی صرف ایک رُخ ہے جو اوّل تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے۔ ایک دوسرا رُخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب وتظلم کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف واعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے منزہ ہر الزام سے مبرا، بوا خلق وخلق کی تمام خوبیوں سے مرصع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور اُن کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر اُن کا کوئی مثیل نہیں ہے۔ اس موضوع پر اگرچہ دفتر کے دفتر نقل کیے جاتے ہیں، لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کررہے ہیں۔

## اثر انگیز شخصیت

جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد ۵۶۹ء میں، مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا، جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ (ڈریپر) ❶

## ناقابل فراموش

اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج ان تین باتوں کو انسانی تعقل وتفکر کا معیار بلند مانا جائے، تو کون ہے جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد (ﷺ) کے مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انھوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر دکھائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ انھوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے، جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کیے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیے جو اُس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انھوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین ومذہب کے پیروکاروں کو، خیالات وافکار کو، عقائد ونظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا، پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود باطل سے نفرت'' ❷

## جامعیت کبریٰ

عالم الٰہیات، فصاحت وبلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانی مذہب) آئین وقانون ساز

---

❶ ہارٹ کی کتاب:
(The 100 A Ranking of the most influencial persons in History) 1978 (p.33)

❷ لامارٹن (Histoire decaturqui) ج ۲ ص ۲۷۶-۲۷۷، پیرس ۱۸۵۴ء۔

(شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول ونظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی روحانی حکومت کے موسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو اُن سے زیادہ بڑا، اُن سے بڑھ کر عظیم ہو؟ ❶

## بے مثال کارنامہ

کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ، اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا جو انسانی ہمت وطاقت سے اس قدر ماوراء تھا۔ محمد (ﷺ) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں جس بڑے منصوبہ کو رد بہ عمل لائے، اُس کی صورت گری بجز اُن کے، کسی کی مرہونِ منّت نہ تھی، اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا اُن کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا، اور آخر کار ایک اتنے بڑے مگر دیرپا انقلاب کو برپا کر دیا، جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہوسکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکروعقیدہ اور طاقت و اُسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے، فارس، خراسان ماوراء النہر مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر، بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصّہ پر بھی چھا گیا۔" ❷

## تاریخ کی پوری روشنی میں

یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیحؑ کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں، لیکن اُن تیس ۳۰ برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انھوں نے (نبوت سے پہلے) گذارے جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آیندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب سے کتنی دور کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُن کی ماں کے بارے میں' اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اِسی سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسندِ نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یک دم خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہر حال کتنے

❶ ایضاً۔ ❷ ایضاً۔

ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں' مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر البتہ محمد (ﷺ) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے، یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے، ہم محمد (ﷺ) کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض' قیاس' تخمین وظن ماورائے فطرت روایات اور فسانہ و افسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے حقائق سے آراستہ ہے، اور ہم یہ باآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل وفریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز دن کی روشنی میں جگ مگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ اُن کی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تک ہمارے رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (ﷺ) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں۔ اُن کی جوانی، ان کی اٹھان اُن کے تعلقات ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ ذہنی سفر اور ارتقا وغیرہ، نیز اُن کی داخلی اور باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں۔ جو اپنی ابتدا، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز ومنفرد ہے، اور اب تک ایسی کوئی معقول ومستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔" ❶

## انقلاب انقلاب' انقلاب

بہر حال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے۔ جن میں اگر ہمیں والیٹر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رُخ بدل گیا، انقلاب آ گیا، انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب! ❷

## منفرد مقام

تاریخ مذاہب وادیان میں محمد (ﷺ) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔

❶ باسورتھ اسمتھ محمد اینڈ محمد نزم، سندھ ساگر اکاڈمی لاہور ص ۱۲- ۱۱۔

❷ باسورتھ اسمتھ ایضاً ص ۷۲۔

اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی، اور اُن کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و ممیز کر سکے۔" ❶

## سب سے بڑا انسان

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب ایک نئے فلسفہ ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کردی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امّی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کردیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کردیے، (مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۱ء ج ۴ ص ۴۰۰) نیز بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون سا ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داور مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

## عظیم و مخلص

عظیم محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیش وا تھے، انھوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا، اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی، بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لیے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے، اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے، ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔" ❷

---

❶ بوڈلے دی میسج ۱۹۴۶ء ص ۳۳۸۔

❷ لیونارڈ اسلام ہر موال اینڈ اسپری ٹیول ویلولندن ۱۹۲۷ء ص ۲۱، ۲۰۔

## مقام و مرتبہ

محمد (ﷺ) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے۔ وہ لوگ جو اُن کے گرد جمع ہوئے اور جو ملّت اسلامیہ کے اولین ارکان تھے۔ وہ قانون کی اطاعت، توحید الٰہی پر راضی تھے، اور محمد (ﷺ) کی تعلیمات اور اُن کے اُسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے، وہ مطمئن تھے کہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں، جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا۔'' ❶

محمد (ﷺ) نے ازخود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ ایک موقع تو ایسی وحی نازل ہوئی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟، پھر انھوں نے اُس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Imposter) تھے جیسا کہ معصوم مسیحی اُس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔'' ❷

محمد (ﷺ) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم مشربوں کے فہم وادراک کے مطابق تھا، اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم ورواج اور اُن کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات ونظریات سے بھی ایسی مناسبت وہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی نے اسے قبول کیا، اور سب کچھ چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا۔ ❸

## روشنی

پس وہ روشنی آ گئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لیے، ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی، چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ جلال لیے ہوئے، اُس

---

❶ گاڈفرے ڈی، ممبائز مسلم انسٹیٹیوشن، لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۰۔

❷ لیتھر محمد ‌ نزم، لاہور ۱۸۹۳ء ص ۴۔

❸ کاؤنٹ ڈی بولین ولیز La Via Mohamad ایمسٹرڈم ۱۷۳۱ء ص ۴۴۔۱۴۳۔

نے اُسے وحی'' کہا اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل۔ اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے، ہمارے سمجھنے کے لیے کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش، دراصل ایک روحانی عمل ہے، جس کے بارے میں منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے بقول نوالی ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (ﷺ) کا وجود کامل، جسم و روح، اسی حقیقت اور سچائی نور سے مستنیر تھا۔ ❶

## نور ہی نور

عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعہ پہلے پہل زندگی ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے، صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک گھومتے پھرتے تھے کہ ایک ہیرو پیغمبر ان کی طرف بھیجا گیا، ایک پیغام کے ساتھ، جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے، اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لیے قابل ذکر بن گئے۔'' ❷

## عظیم فاتح

فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات اس کے حق میں جائے گی اور وہ قابل تعریف ٹھہرے گے کہ اُس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انھیں جتنا بھی طیش آتا کم تھا، اور ان کے آتشِ انتقام کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا، مگر انھوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی و عبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجا لائے، صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنھیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا، لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال و حرکات کے مقابلہ میں، اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت و انسانیت سے تعبیر کیا جائے گا، (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ ۱۰۹۹ میں فتح یروشلم کے موقع پر انھوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں

---

❶ کارلائل وہی ہیرو وایز اے پرافٹ۔

❷ کارلائل۔

افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذرِ آتش کر ڈالا) محمد (ﷺ) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انھوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا اور کروفر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا، اور جب قریش کے مغرور و متکبر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد ﷺ نے اُن سے پوچھا کہ تمھیں مجھ سے کیا توقع ہے“؟ رحم! اے سخی و فیاض برادر، رحم! وہ بولے۔” جاؤ تم سب آزاد ہو“ انھوں نے فرمایا۔“ ❶

## صاحب خلق عظیم

”اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے، اُن کا کھانا، پینا، اُن کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا جب کہ وہ اپنی طاقت وحکومت کی معراج تک پہنچے، انھیں تخیل وتصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اُڑایا جائے، اُن کے خادم انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دس سال تک اُن کی خدمت میں رہا لیکن انھوں نے کبھی اُف تک نہ کہا، انھیں بچوں سے بہت محبت تھی وہ انھیں راستے میں روک لیتے اور اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انھوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اُسے کیا ہوگیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو، جب اُن سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے میں بددعا کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں“، وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوھ لیتے اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش کی جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت

---

❶ ارتھر گلمین دی سراسینز لندن ۱۸۸۷ء ص ۱۸۵،۱۸۴۔

کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، اُن کے گھر کے باہر ایک چھپر (صفہ) تھا، جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے، جن کی گذربسر کا تمام تر انحصار اُنہی کی فیاضی پر منحصر تھا۔'' ❶

## سنجیدگی اخلاص وفاداری

محمد (ﷺ) پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ (محمد ﷺ) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا، اُن پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق وکردار، اور اُن کی طرف امام وپیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں یہ سب دلیل ہیں، اُن کے اخلاصِ کامل کی، اس لیے محمد ﷺ کو ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں، مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد ﷺ کو اس لیے اگر ہم محمد ﷺ کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم محمد ﷺ کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کی خلوص اور وابستگی کے قائل ہوجائیں، اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں اُن کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا، جب تک کہ کوئی الزام اُن کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہوجائے۔ ❷

یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض ومفاد پرستی سے کلیتہً خالی تھی۔ مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام واستحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہوجانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اُس سادہ طرز وانداز کو برقرار رکھا جو اوّل دن سے اُن کے بود وباش سے نمایاں تھا۔ ❸

---

❶ لین پول دی اسپیچز اینڈ ٹیبل ٹاک آف دی پرافٹ محمد، لندن ۱۸۸۲ء، ص ۲۹۔ ۲۷۔

❷ واٹ محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء، ص ۵۲۔

❸ ڈیون پورٹ، پالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن لندن، ۱۸۶۹ء جز لاہور اڈیشن ص ۳۴۔ ۱۳۳۔

## مشن کی سچائی

محمد ﷺ کو بلا شک وشبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے ملک کی تعمیر واصلاح کی ہے، ان کا اپنا مشن نہ تو دنیا تھا اور نہ فریب دہی جھوٹ وافتراء پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم وتبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رُکاوٹیں بن سکیں، وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔ ❶

## سچے رسول

جہالت جس کا مظاہرہ اکثر وبیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوس ناک امر ہے، محمد ﷺ اُس وقت کی اقوام میں، ایک خدا پر یقین رکھتے تھے، اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انھوں نے بہ تاکید راست بازی اور دین داری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا، اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی' حی وقیوم خدا کے لیے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت واحترام اور سب کے ساتھ رحم وشفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل وتوازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین اُن کے دین ومذہب کا حصہ تھی، لہٰذا محمد ﷺ ایک نفس روحانی کے مالک اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔'' ❷

## امتحانِ سخت سے گذرے

ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گذرا تھا جیسا کہ محمد ﷺ، کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انھیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے، لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز ومحترم

---

❶ ڈیون پورٹ ایضاً۔

❷ لنڈ سے مضمون، مطبوعہ ٹو ورلڈ مانچسٹر ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء۔

ٹھہرے الا یہ کہ جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔" ❶

## آسمانوں کی بادشاہت زمین پر

اسلام کے ذریعہ محمد ﷺ نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج وانتشار کو، رقابت وعداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سودخواری قتل وغارت گری، دختر کشی کی رسوماتِ قبیحہ کا استیصال کیا، اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات وتوہمات اور مادیت واشیا پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اُس بادشاہت کو انھوں نے عملاً اس زمین پر قائم کردیا جس کی بشارت بڑے ذوق وشوق سے جناب مسیحؑ نے دی تھی۔" ❷

## ہمہ گیر اصلاح

ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی، جس نے اتنی بہت سی اور تادیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع واقسام کی بت پرستی کے بدلے، جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا جس نے دختر کشی کی رسم قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیا کو حرام ٹھہرایا، جوئے کی ممانعت کی نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدد ازواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ اُس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں ہرگز نہیں! محمد ﷺ کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انھوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی پامردی واستقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اُس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب ومشکلات کی۔ یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انھیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بانہوں میں آخری سانس لینے تک۔ ❸

## عظمتوں کے نشان

حالات مواقع اور وقت سب نے محمد ﷺ کا ساتھ دیا، اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی

---

❶ گبن زوال سلطنت رومہ ص ۱۰۸۔ ❷ گبن ایضاً ص ۶۹۔۷۰۔

❸ ڈیون پورٹ۔

زندگی میں کامیابیوں کی اوران کے بعد اسلام کی توسیع وترقی کی راہ ہموار کی۔ محمد ﷺ کی ذات میں صفات وکمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اُس کی تین جہتیں تھیں۔ ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست وحکمرانی میں اُن کی بصیرت، اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت و حذاقت اور تمام مناسب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔ جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد ﷺ پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اُسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ حالات نے انھیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذونادر حاصل ہوتے ہیں۔ بالکل وقت کی آواز بن کر ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انھیں اگر حاصل ہوتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انھیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا اور وہ اس یقینِ محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ اِنسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا ہے۔ ❶

## صدق وصفا

یہ محمد ﷺ کے صدق کی دلیلِ قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ اُن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ اُن کے اسرار ورموز سے پوری طرح واقف تھے، اور اگر اُنھیں اُن کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔'' ❷

## اتمام واکمال

محمد ﷺ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا آپؐ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر تھا بنیاد ڈال چکے تھے، آپؐ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔'' ❸

---

❶ واٹ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین، آکسفورڈ پریس، ۱۹۶۱ء ص ۲۳۷۔۲۳۶۔

❷ ایچ۔ جی ویلز بحوالہ زکریا ہاشم زکریا، ص ۲۷۔

❸ مارگولیتھ بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۲م از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۹۹۔

# مقالات سرسید احمد خاں اور مستشرقین

از عبیداللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنّفین

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث ومناظرہ اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو ردعیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر مبہم حملے کر کے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لیے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سرسید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثے میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر

کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو، ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں۔'' (خطبات احمدیہ ص ۱۷)

سر ولیم میور اضلاع شمال مغرب ویوپی، کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سرسید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سر ولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انھوں نے ''احکام طعام اہل کتاب'' لکھی جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی اس لیے وہ ''کرسٹان'' سمجھے جانے لگے تھے، اور علماء کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا، لیکن سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بُری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے وہ بے چین ہو گئے، وہ اکثر اس کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں'' (حیات جاوید حصہ دوم ص ۱۲۰) ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے، اور سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لیے سرسید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود یورپ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لیے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سر میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن پہنچ گئے، انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی

لگا تار محنت سے بارہ اسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا (حیات جاوید ۱۳) اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں، انگلستان سے مولوی سید مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ان دونوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے اور میں فقیر اور بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیَر منگائی شروع کردی ہیں۔'' (حیات جاوید ص ۱۲۱)

ایک اور خط میں یہ لکھتا ہیں کہ ''مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب وروز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچنے پر کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجئے ہزار روپے بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیج دو کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب وخور حرام ہوگیا ہے، خدا مدد کرے گا۔''

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ میں روز وشب تحریر کتاب میں مصروف ہوں سب کام چھوڑ دیا ہے لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کردیا، روپیہ کہاں سے آئے گا۔'' (حیات جاوید ص ۱۲۱)

خطبات احمدیہ کی جلد اول تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں ۴ ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپے ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کرکے روانہ کیے اور کچھ انھوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زادراہ کے لیے کچھ نہ تھا، اور وہ

نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرہ حامد محمود کا انتقال ہوگیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکر مند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''جیسا کہ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعہ کربلا سے کم نہ تھا۔ ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (ایضاً ص ۱۲۲)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصہ اوّل کی تکمیل پر، ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض وغایت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''آنحضرت ﷺ کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سرولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کہ حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ وہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔'' (حیات جاوید ص ۱۲۳)

## مستشرقین کی تردید میں خطبات احمدیہ کا امتیاز

لاہور ڈیونسٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ:

''ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جاکر ان ہی کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔'' (ایضاً ص ۱۲۴)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے

دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لیے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی، اور تحقیقی جوابات دیے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، اس کے خیال میں اس کتاب سے مصنف کا غیر معمولی تعلق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول دین ہے، اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تحریروں کے مخالفت کی ہے، اور خوب چٹکیاں لی ہیں، اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سرولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔" (حیات جاوید ص ۱۲۶)

سرولیم میور سے پہلے مستشرقین اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کر رہے تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کا شائستگی تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور منزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا (خطبات احمدیہ ۲۳۷) یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب یابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خواہ کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سرسید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول وقواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں، اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے، ان کی تشریح کی ہے، جس سے سرولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ

اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو، اور مسلمانوں کے اعمال وکردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں، ان کے جواب دہ خود مسلمان ہیں نہ کہ اسلام، انھوں نے سر ولیم میور کے مغالطّوں کا نہایت معقول دلائل اور دل نشین پیرایے میں جواب دیا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص۲۹۲)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ طریق استدلال ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی، اور ہمدردانہ لب ولہجہ کو برقرار رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم مؤرخوں کا ذکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنھوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت ﷺ کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے کہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں انھوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے۔"

(خطبات احمدیہ ص۲۰)

انھوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں منقل کیے ہیں، خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی حیات جاوید (ص ۱۶۷) میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض علمائے محققین نے بھی وہی لکھا ہے، جس کو سرسید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انھوں نے رویا پر محمول کیا ہے، اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے یا ایک آدھ بات اور ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کیے

گئے، خطبات احمدیہ میں انھوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی، اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارے میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

## مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات

سر سید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیے ہیں، ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں، انھوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جابجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو، حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رسول اکرم ﷺ کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت سے بھی انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہی، ان سے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت مراد نہیں ہے۔

سر سید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے تورات کی پیشین گوئی نقل کی ہے، لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں۔

''اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی، اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے، تو اس کی بات مان کیونکہ

اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے، تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی، اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس کے لڑکا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی، اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا اور تیرانداز بنا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی۔'' (پیدائش باب ۲۱ درس ۹۔۲۱)

مذکورۂ بالا پیشین گوئی واضح طور پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر دے رہی ہے، اسی لیے سرولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے، اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی، اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

## فاران

''سرسید مرحوم نے سرولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ:

''عربی ترجمہ توراۃ سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام

لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے، اور وہ عبارت یہ ہے:

(وسكن فى بحرية فران (الهجاز) واخذت له امه امرأة من ارض مصر . ) (عربی ترجمہ توراۃ سامری) (خطبات احمدیہ، ص ۱۱۲)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ "عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے، تسلیم نہیں کرتے اس کے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے، بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ ﷺ کا نبی ہونا مراد ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعہ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں، جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شو، بیر شبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں۔

"اس بیان کی تردید کے لیے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دیں کیونکہ ان سے صاف منکشف ہو جاتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے، اور گردونواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا، (گنتی باب ۱۰ درس ۱۲) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا، قرار واقعی ثابت ہوتا ہے، کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جداگانہ بیابان تھے۔

(ب) اور چودھویں برس کدر لاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو

عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے، (پیدائش باب ۱۴ درس ۵ تا ۷) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس درس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۵)

مزید وضاحت کے لیے وہ تورات سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں:

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان کے ہاں کا رئیس ہو، چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کیے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (گنتی باب ۱۳ درس ۱ تا ۳)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی، اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (گنتی باب ۱۳ درس ۲۶)

(ھ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا، کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ میں: باہزار ہزاروں) قدسیوں میں سے آیا اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا باب ۳۳ درس ۲)

(ر) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حقوق باب ۳ درس ۲)

(ز) اور ڈمدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (سلاطین اول باب ۱۱ درس ۱۸)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا، اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سر سید مرحوم نے اس قول کی تردید میں (گنتی باب ۱۳ درس ۲۶ کے علاوہ) تورات کی یہ عبارت بھی

پیش کی ہے:

''اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادرس پہنچے اور عمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا۔ (پیدائش باب ۱۴ درس ۸۷۷)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورۂ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیے جائیں درس مذکورۂ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے، (ایضاً ص ۱۱۶)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپر وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے، جو فاران کے نام سے مشہور ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے، جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر ٹھہرے تھے، اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران نہیں ہے، جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے، سرسید مرحوم نے مذکورۂ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی، اورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسماعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں، وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین، (پیدائش) باب ۲۵ درس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے، ''اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی۔'' سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدے اسی میں ایفا ہو گئے تھے، جب کہ اسماعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانۂ فرات تک پھیل گئی تھی۔'' اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانۂ فرات پر قرار دیا ہے، اصلی حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ درس ۲۹ میں مذکور ہے، نواح ملین میں عرض بلد شمالی ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول

بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے، اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنے سے ہو سکتی ہے، جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے جن کا نقشہ رورنڈ کاٹرٹ بی کیرے ایم، اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں ''شور'' کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں صحرائے ایشام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے کیونکہ صحرائے ''شور'' سے توریت مقدس میں مراد تمام وہ وسیع میدان ہے، جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہیٰ ہوتا ہے۔'' اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

''اصل عربی توریت میں صرف دو نام ہیں شور اور اشوارہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں، ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشوارہ سے مراد حمیریا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطعے میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہیٰ ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجہ کی اصل امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب عزیمت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے مصر کے ہے، اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو۔'' یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۹)

انھوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں (۱۲۲) سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا، جس میں انھوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب ۱۱ درس ۳) میں کی پھر قبروت ہتاداہ آئے، اور وہاں سے حصروث پہنچے (گنتی باب ۱۱ درس ۳۴، ۳۵) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے، (باب ۱۲ درس ۱۹) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے، جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا، یعنی

قادیش کی طرف (باب ۱۳ درس ۲۶) اس لیے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہوسکتا، بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے عیسائی علماء نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں، جن کے اختلاف کی صورت میں:

''اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا، جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے، اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مورخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہوجاتی ہے، اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔''

(خطبات احمدیہ ص ۱۲۵)

توریت (پیدائش باب ۲۱ درس ۱۲۔۱۵) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف پانی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا، اور وہی ختم ہوگیا تھا، سرسید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے۔ ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب کنووں کا ہونا حضرت ہاجرہ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے بنائے ہوئے کنویں نہیں تھے، بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے، (پیدائش باب ۲۶ درس ۱۸ تا ۲۲) سرسید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

''مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیر شبع کے اردگرد قومیں لڑاکا اور جھگڑالو تھیں، اس لیے حضرت ہاجرہ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں، لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا، جب اس مقام پر پہنچیں

جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو چھپا دیتے تھے، جس وقت حضرت ہاجرہ مضطربانہ اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں، تو ان کو وہ چشمہ مل گیا توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جہاں لکھا ہے۔" پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔" (پیدائش باب ۲۱ درس ۱۹) بہر حال حضرت ہاجرہ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا، جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قریب دجوار میں آ کر آباد ہوئے۔" (خطبات احمدیہ ۱۲۹)

سر سید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور ان کی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ "تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار میں (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے، جو سفر تکوین باب ۲۵ درس ۱۸ میں مندرج ہے، کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے، جو سامنے مصر کے ہے، جب تو اسیریا کو روانہ ہو۔"

(خطبات احمدیہ ص ۱۴۱)

## حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ

تورات کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہو گا۔" کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہود بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں، اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہ کے لونڈی ہونے پر

استدلال کیا ہے، جو سرتاپا غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامہ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لیے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے، چند اہم نکات یہ ہیں،

(۱)......انھوں نے سفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی بادشاہ مصر نے اس کی قدردانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر والوں کیساتھ مصر گئے تو اس نے سارہ سے نکاح کرنا چاہا مگر پھر باز رہا، اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں دے دیا، رقیون عبرانی، زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہ کا اصل عبرانی نام ہاغا ہے، جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصری النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا، چنانچہ اس کے پاس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے اعزاز اور سامان وہدایا کے ساتھ روانہ ہوئے۔ (پیدائش باب ۱۳ درس ۱۔۶)

(۲)......مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہ کو بادشاہ کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ دوبی شلوو اسحاق نے کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے:

”وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہوکر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ میراث پائیں گے، چنانچہ انھوں نے ہاجرہ کو الگ کردینے کی درخواست کی، اور انھوں نے ہاجرہ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں،

تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہ کے لیے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات (سمول باب ۲۵ آیت ۴۱) میں حضرت داؤد علیہ السلام کی بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لیے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (خطبات ۱۶۳۔۱۷۵) سر سید مرحوم کے نزدیک:

''توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے، اور شبوث حرب کہلاتے تھے، یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے، جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقنت کشف کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھی؟ ولید البیت یعنی خانہ دار، مگر ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں، پھر وہ کیوں کر لونڈی ہوسکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔'' (ایضاً ص ۱۶۷)

## عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کیے ہیں، جن کو سر سید مرحوم نے ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے سے تعبیر کیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ:

''اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بسینہ چلی آتی ہے، یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقراری ہوئے'' (خطبات احمدیہ ص ۳۸)

سر سید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب

کی مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ "عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجہ غایت پابند تھے، وہ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا، اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بہ خوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب ونسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا، لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا، اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا۔ انھوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے، وہ اپنے جغرافیہ عرب میں لکھتے ہیں کہ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص وعام ہے، تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے، (خطبات احمدیہ ۳۶) پھر سرسید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل ذریعوں سے ہوسکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ونسب بہ آواز بلند بیان کرے تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔ کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا۔ تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جواب شرع میں بلفظ الدیة علی العاقلہ مستعمل ہے، اس قسم کے رسوم کا نتیجہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جاملنا غیر ممکن ہوگیا تھا، اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی، روایتوں پر اعتبار قائم ہوا، اور برقرار رہا، وہ اپنی تحویل بحث کے اختتام پر ریورنڈ مسٹر مارسٹر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ: (ایضاً ص ۱۳۷)

"محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تاریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے، خود عربوں کے ہاں زمانہ نا معلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداء حجاز میں آباد ہوئے

تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور خود محمد (ﷺ) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعووں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد قیدار کے سلسلہ سے تھی ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایے کو پہنچ جاتا ہے، جب کہ اس کی تائید، ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کے اسی حصہ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اور دوسری جانب اریانس، بطلیموس، ملیپنی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری، درانی، کدرون تائی، یا کدیتی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور نا قابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔'' (جغرافیہ تاریخی جلد اصفحہ ۲۴۸)

اسلام کے ذریعہ تکمیل دیں

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سرسید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے، جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذلوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا، اور اس کی حیرت انگریز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا، اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا۔'' اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا ہے اسلام نے عرب کے مختلف مذاہب میں کیا اصلاحات کیں، ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ ''اسلام درحقیقت اصول وعقائد متفرقہ ومنتشرۂ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے۔'' پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ:

''یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، تمام چیزیں جن کا مبدأ ایک ہی غیر منتہی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی، جس

طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے، اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے، جنھوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کہ تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنھوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے با ایمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیے۔“ (خطبات احمدیہ ص ۲۲۳)

## صدائے جنگ

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں جس پر سرسید مرحوم نے یہ لکھ کر بجا طور ان کی تحسین کی ہے کہ ”سر ولیم میور ایک نہایت دین دار عیسائی ہیں، اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے“ اس کے بعد شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ سر ولیم میور کے خیالات نقل کیے ہیں، لیکن اس درمیان اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی۔“ کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”سر ولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۲۶)

## ایڈورڈ گبن

سرسید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی اپنی تائید میں بڑی فراخ دلی سے نقل کی ہیں،

لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ (رسول اللہ ﷺ نے) عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں۔'' اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

''انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے ان دیکھی، ان چھوئی، ان چکھی، ان سمجھی چیز کو کیوں کر سمجھ میں آ سکتی ہے، جس چیز کے لیے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو وہ کیوں کر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیوں کر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات میں پس وحی یا الہام ان کو کیوں کر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے۔'' لا عین رأت و لأذن سمعت و لا خطه علیٰ قلب بشر پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے، اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر، اس لیے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام یہی فرمایا کرتے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ پیدا ہوگا۔ وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گا۔'' (خطبات احمدیہ ص ۲۲۹)

## چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات

سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر یہ اعتراضات کیے ہیں کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، اور یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دے دینا، اور غلام بنا لینا وہ باتیں ہیں، جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور

اس مذہب کا قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۳۷)

سرسید مرحوم کے خیال میں، عیسائی مصنفین، مسلمانوں کی مخالفت میں، سنجیدگی، اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنی عیب چینی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکتے کہ آب وہوا، مرد وعورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

## تعدد ازدواج

سرسید احمد خاں کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے، کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کارثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جن کو مختلف اسباب طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو، اس کے بعد وہ قانون قدرت، باہمی معاشرت اور مذہب کی رو سے مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا، کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو اُن کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، جن میں سے ایک نر ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مائیں ہونی مقصود ہیں ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادے کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں، وہ اکثر بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق قدرت نے اس کو عطا کیے ہیں ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی وقوانین حفظان صحت اور ملکی تاثیرات آب وہوا کے کام میں لائے پس جیسے کہ کثرت ازواج اکثر حالتوں میں

قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۳۹)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے، انسان مدنی فی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو تورات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''جب خدائے تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر وتردد اور رنج وراحت میں شریک ہو، اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو مدد دے، مگر جب وہ کسی سبب سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ اسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک، ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کر لے، یہ حق عورت کو حاصل ہونا چاہیے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر یہ سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا، اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا مٹنا محالات سے ہے، اس لیے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہوں گے جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۳۱) سرسید مرحوم نے تعدد ازدواج کی تائید میں دو مستشرقین کی یہ آراء بھی نقل کی ہیں کہ:

> ''گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ تعداد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔'' (مسٹر مانٹیگو) ''ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب وہوا میں نہیں ہے، جہاں دونوں برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں، مگر ایشیاء میں صرف مرد ہی کو یہ بات

حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے، تو بانی اسلام کے لیے اس بات کی کہ انھوں نے کئی بیویوں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی۔''

(سر ڈبلیواوسلی)

لیکن ان مذکورہ بالا تائیدی آراء سے سرسید کو کامل اتفاق نہیں جس پر وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

''افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعداد ازدواج پر صرف امور طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے، مگر اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امور طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج اور تلخیوں اور مقاصد تزوج کے فوت ہوجانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہوا، جو عین مرضی آدم وحوا کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کا کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔''

(خطبات احمدیہ ص ۲۴۱)

آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب اور اس کے گردونواح میں نکاح وشادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے، اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے یہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعداد ازواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں، تعداد ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے، مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سب کے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی نیکی شمار نہ ہوتی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی، اور مرد وعورت دونوں کے لیے یہی نیکی کا کام تصور کیا جاتا، ایسے زمانہ میں جب کہ عقل ودل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اخلاق ومعاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت کامل، عقل کامل

کے بالکل مطابق انسان کی تندرستی بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن ومرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۴۴)

سرسید مرحوم نے مذہبی نقطہ نظر سے بھی تعدد ازواج کا جائزہ لیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازواج کو روکا ہے، اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے یہودیوں کے یہاں بکثرت اور بلاتعین حد ازدواج موجود ہے، عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلم بند کرنے کے لیے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی۔'' جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔'' (ایضاً ص ۲۴۵)

اس کے بعد سرسید مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

> ''اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت ہی دو خاص حالت میں جائز رکھا ہے، ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے، اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا۔ جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔ وہ تعدد ازدواج

اس زمانہ میں رائج ہے، اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو ننگا کرنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں پس ایسے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا، چمگاڈروں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔'' (خطبات احمدیہ ایضاً، ص ۲۴۹)

## طلاق

سرولیم میور نے اسلام میں اجازتِ طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے جس کے جواب میں سر سید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے۔ جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔'' لیکن اس کے باوجود۔

''اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے، اور وہ علاج طلاق ہے بطور ایک علاج کے اسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے، تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔'' (خطبات احمدیہ ص ۲۵۱)

انھوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذاہب کے طرز عمل کا بھی جائزہ لے کر یہ واضح کیا ہے کہ یہودیوں کے یہاں طلاق دینا، کسی قید وشرط کے بغیر مرد کے اختیار میں تھا، وہ جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دے دیتا، اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں، سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا سخت حکم تھا، جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی، اگر یہ حکم اسی

طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں، تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے، اور جو رنج دہ امور زن وشوہر میں واقع ہو کر تمام ازدواجی مقاصد کی بربادی کا سبب بنتے ہیں، اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن و مرد دونوں کے لیے مختلف آیتوں سے طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں، سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں (آیتوں) پر ڈالی ہے، وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے، کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک لاعلاج مرض کا علاج ہے، مگر زن وشوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انھی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے، اس لیے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دل نواز اور مونس غم گسار پیدا ہوئی تھی۔'' (خطبات احمدیہ ص ۲۶۰)

سرسید احمد خاں نے ان تعلیمات نبوی ﷺ کو بھی نقل کیا ہے جن میں مرد وعورت کی اخلاقی تربیت اور زن وشوہر میں یکجہتی اور محبت وانس کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور جن میں طلاق سے امکانی حد تک بچنے، اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر، مناسب وقفوں میں تدریج کے ساتھ تفریق کی اس کاروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی، رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے، ان کی سختی اور بدمزاجی کو برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی، اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو روکنے کے لیے ہیں اپنی بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب ولہجہ میں یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

> ''اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے، کہ وہ زن وشوہر کے حق میں

ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں، اور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے، کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہو گی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس ان کے افعال کی نفریں انھی پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے، وہ عقل انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے، کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے، جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لیے، اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۶۳)

## غلامی

سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے، جس کے جواب میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یا اس زمانے کے رسم ورواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۶۴)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈ فری، ہیگنز انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ "سروس" یا

درلوس پایا جاتا ہے، اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے وہاں اس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیے۔ لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور ''فریدیشین'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے ہم معنی ہے، لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جائے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا، اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۵) گاڈ فری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مگر حضرت محمد ﷺ (جنھوں نے غلامی کے مٹانے کے لیے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں) وہ تھے جو ساتویں عیسوی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے، حضرت محمد ﷺ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریر سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کردیں تاکہ اپنے آپ کو آزاد کرلیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو، اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو۔'' گاڈ فری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔ (ایضاً ص ۲۶۷) لیکن سرسید مرحوم کا خیال ہے کہ:

''جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے پھر رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے، (ایضاً ۲۶۷) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈ فری ہیگنز نے کیا ہے کہ ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے، خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ جب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں، اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہوسکتا، یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مرجاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے، کتابت کا جو ذکر گاڈ فری ہیگنز صاحب نے کیا ہے، وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو، بلکہ

اس کرنا واجب تھا اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کتابت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار کیا، ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ...... خط آزادی بمعاوضہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے لکھوا دیا......"

(ایضاً ص ۲۶۹)

سرسید غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ روایت بھی درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ تمھارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمھاری خدمت کرتے ہیں، تمھارے کاموں کو سنوارتے ہیں، اللہ نے ان کو تمھارا تابع کر دیا ہے، پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلا دے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہنا دے، اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان تھکا دیں، اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے تو خود ان کی مدد کرے۔ (بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم العبید اخوانکم، ص ۳۴۶)

"اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے، اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے جو آپ کھاتے تھے، اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بیٹھاتے تھے، اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے، اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے، خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا، عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے، فاطمہ رضی اللہ عنہا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں، کبھی ان کا دست مبارک ہتھے کو نیچے سے تھامتا

تھا اور کبھی لونڈی کا، تا کہ دونوں کو برابر محنت پڑے، پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو بہتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے، ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی مقصود ہے، پس مذہب کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی، قیاس کرنا محض غلطی ہے، آنحضرت ﷺ نے صرف ایسی بات پر بس نہیں کیا، بلکہ ان کی نسبت لونڈی وغلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے ان کی حقارت نکلتی تھی منع فرمایا، اور نہایت شائستہ، مہذب وشفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی...... علاوہ اس کے آنحضرت ﷺ نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے، اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔'' (ایضاً ص ۲۶۹۔۲۷۱)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زرمعاوضہ لیے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا، وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے، اس کی وجہ کیا تھی؟ سرسید مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کر ان کو بھی دفعۃً کیوں نہ آزاد کر دیا، تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے، مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں، اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ ان بدنصیبوں کی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ بھی نہیں ہے، اور ایسا رحم وشفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل وبے نظیر ہے، اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں، اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، وہاں بلاشبہ جو سمجھدار اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے، ان کی

آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا، اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آیندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے، اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے، پس یہی کام اسلام نے کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے، بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔'' (ایضاً ۲۷۲)

قرآن مجید کی آیت ﴿فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا.... فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ (سورۂ محمد۴) کی تفسیر میں علماء نے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں، اہل کفر سے مقابلہ میں اگر کچھ قیدی ہاتھ آ جائیں، تو بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہوکر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں، اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے، اور کوئی شرط اُن پر نہ لگائی جائے، اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک چلے جائیں، سرسید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند، معتبر اور صحیح ہے کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینے میں، کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی ہے۔ (ص ۲۷۴)

وہ سر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

''بقول مسٹر ہیگنز کے گو حضرت مسیح علیہ السلام نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو۔ مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا، تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا، اور جو قدیم زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی، اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰ علیہ السلام نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا، اور جن کو حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہیں توڑا تھا، اور جن کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا، دفعتہً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور مطول قانونوں کو ایک دو لفظ

کے فرمانے سے کہ ﴿إِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ مٹا دیا۔

بیچے کرنا کردہ قرآن درست کتب خانہ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں) کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانا ہے اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے، ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑنے میں، جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے، یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں، پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے، ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیے، رقیّت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے، ہاں یہ بات ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو، اس وقت تک اس کو قید رکھے، مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا، اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی، اور اسی لیے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔ ۲۷۳۔۲۷۴

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا، اور اس وقت بھی بعض ملکوں میں ان کے یہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے، سر سید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پس ماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس رواج کی خبریں ملا کرتی تھیں، چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (اور بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم اس خطبے کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے، وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے، اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گناہ گار کے حاضر ہوگا، خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینے میں۔'' (ایضاً ص ۲۷۵)

## اسلام میں آزادی رائے

سرولیم کے نزدیک ''اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے۔'' مگر سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ سرولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے، اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے، جو اس آزادی دیتی ہے۔

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ اپنے تاریخی مضامین سمیت، باوجود اس کے کہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں، وحی آسمانی ہیں، اور اس لیے یہود خطا و غلطی سے بالاتر ہیں، اور ہر ایک انسان کو کسی تامل، یا کسی حجت، یا اپنے قوائے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں، ایک وہ جو کتاب مقدس کے اہتمام وکمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور دوسرا وہ جو صرف اس کے حصہ کو جو مسائل و احکام سے متعلق ہے، وحی سمجھتا ہے، اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا، مگر اس اختلاف سے قطع نظر ان سب کے لیے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے، اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، وہ دو مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے، یہ ایک عجیب مسئلہ ہے، جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے، خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لیے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسیا میں بھی (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ۳۲۵ برس بعد ہوئی تھی، اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا) طے نہیں ہوا تھا، اور کچھ اس پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ پارسن اور دوسرے مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت

ہوگئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے الحاق ہے، پس اگر نہایت عجیب ومشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا، اور کسی کے لیے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب وغریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا، بقول سرسید احمد خاں:

> ''تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل برخلاف ہے۔ تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار ومعطل چھوڑ کر، نہایت اصرار تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے، دلیل وعقل کو اس میں دخل دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔''

(ایضاً ص ۲۷۷)

دوسرا مسئلہ فدیہ کا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے، اور یہ بات قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے، جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا، اس کے لیے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں، کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا۔ (ایضاً ص ۲۷۷) بہر حال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادی رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سرسید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

> ''مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جاسکتی ہے کہ سرولیم میور صاحب نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے، اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں...... ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانش مند، بے تعصب معتقدوں کی بھی

شہادت پیش کر سکتے ہیں، مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہلیر نے لکھا ہے کہ ''اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور عجوبہ کے نہیں ہے، مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے، اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتداء ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔'' (ایضاً ص ۲۷۹)

انھوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدی کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت، راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصبانہ رائے اور تحقیق کے بعد نامعتبر ٹھہرانے کا ہر شخص کو کلیتاً اختیار ہے، جو روایتیں کہ غور و فکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں بے سند ہوں ان سب کو رد کر دینے کا کلیۃً مجاز ہے، قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں، مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کی سچائی ثابت ہونے ہی پر مانا ہے، مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پائے اس پر عمل کرے، اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے، مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت انھیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت، وہ بھی عقل کی مداخلت کے بغیر، اندھا دھند اعتقاد اور بے سمجھے غلامانہ طور تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و ناسمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے، قرآن مجید میں سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد اس لازوال ہستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے پر بیان کی ہیں، پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ کیا ہوگی، (ایضاً ص ۸۸۔۲۸۰ ملخصاً)

## تلوار کی کاٹ

اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے، مگر جیسا کہ سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

(یہ اعتراض) منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں، یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں، یا وہ حق پوشی کی نظر سے دیدہ ودانستہ باندھے ہیں، اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے، اور دلی یقین جبروزبردستی سے پیدا ہی نہیں ہوسکتا، یہ خیال کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے قرآن مجید کے اس صاف اور روشنی کے بالکل برخلاف ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ''دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ سیدھی راہ گمراہی سے علانیہ کھل گئی ہے۔ (البقرہ: ۲۵)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان ومال کے امن سے نہ رہنے دیں، جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا، اور پھر جہاں گئے، وہ تعاقب میں دوڑے اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے، اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے، مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہوجائے، تاکہ مسلمانوں کو جان ومال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ وتلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دل میں بیٹھا دیں،...... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے، نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو جس اصول پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی، کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل وغارت ونیست ونابود کردیں، اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان

سے نہیں نکالا، اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست ونابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے، اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔''

(ایضاً ص ۹۰۔۲۹۹)

## دوسرے مذہبوں کے لیے آزادی

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے، چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لیے تھا، اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں، خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں، اور اپنے چال چلن اور عادت عبادت و محبت سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلا دیں اور اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک ہی مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں، جیسا کہ مدینہ میں ہوا، دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے، کفار فرائض مذہبی کی ادائیگی پر معترض نہ ہوں، جیسا کہ ابتداء مکہ میں تھا، یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے یہ کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر یہ تسلیم کرلیں کہ مسلمانوں کو ملک میں رہنے، آمدورفت رکھنے، ان کی جان ومال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائیگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے، تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائیگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے، اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

''ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست انداز کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے، اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔'' (ایضاً ص ۲۹۱)

سرسید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ''مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت

بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا'' مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہم کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ انھوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے، مگر وہ مسلمان فتح مند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے، دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز تھے، اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرف دار ہو، اسپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے جس میں یہ ہے کہ:

''اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے، کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان کے بادشاہوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا۔''

(ایضاً ص۲۹۲)

مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں سرسید رحمہ اللہ نے ایک مسیحی عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ ''کوئی بات ایسی عام نہیں ہے، جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت، یہ عجیب زعم اور محض ریا کاری ہے، وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لیے جلا وطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے، اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام دے دیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے، مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں، اور ان کے مذہب ان کے پادریوں ان کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے، جو لڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے، وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ویمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی، کچھ زیادہ مذہب

کی وجہ سے نہیں ہے، جب کبھی خلیفہ فتح یاب ہوتے تھے، اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے، تو فوراً ان کی رتبہ بالکل فتح مندوں کے برابر ہو جاتا تھا، ایک نہایت دانش مند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے، اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش وخرم تھے۔" گاڈ فری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلا وطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

"اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلا وطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے، مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب اور ہی تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے، اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی۔ وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا، جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے، وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے، جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب یہ امن وامان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیے جاتے تھے، اور اس سے پچھلے حق کی بات ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا، خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا، اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب چلا گیا ہو، نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانہ اسپین میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۲۹۵)

## جزیہ کے بارے میں ہیگنز کے خیال کی تردید

ابھی مذکورۂ بالا اقتباس میں گاڈ فری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملہ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہب پر باقی

رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں، چنانچہ سرسید احمد خاں مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مسٹر ہیگنز نے یہاں غلطی کی ہے کافروں میں جو مفتوح ہو جاتے ہیں اس معاوضہ کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے جزیہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبوراً نہیں کیے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن و امان کے بحال رہنے کے گورنمنٹ کے مقصد اور غرض میں کوئی خدمت بجا نہیں لاتے بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ و امن کی ذمہ دار ہوتی ہے، ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے بلکہ خلیفہ کو ملکی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہے، چاہے لے، چاہے نہ لے، پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے، مذہب سے مسلمان پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے، یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔'' (ایضاً ۲۹۴۔ حاشیہ)

## اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرز عمل

اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے، لیکن اس کے برخلاف عیسائیوں کا طرز عمل بڑا افسوس ناک رہا ہے، چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی'' میں لکھا ہے کہ ''نائیسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو یہ اختیار دیا تھا کہ جس سے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے، یعنی خون ریزی اور بربادی، ان احمقانہ جہادوں کو جو عیسائیوں نے قریباً دوسو برس تک ترکوں پر کیے تھے، اور جس میں کئی لاکھ آبادی ہلاک ہوئے، ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیرووں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا، وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا، اور چالیس برس تک اور دوسرے بہت سی خون ریزیوں کا ہونا، فرانس اوّل کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جواب تک قابل نفریں ہے، کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا،

اس کے علاوہ دوسری بے انتہا بدعتوں اوران بیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے، زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی وارداتیں، تیرہ، چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک نیرو یا ایک کیلیکیولا سے بڑھ کر تھے، اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا، اور جو قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا۔''

(ایضاً ص ۲۹۷)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس کے بارے میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

''آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظائر قائم کیں، ان سے خلفاء نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی...... ملک عرب میں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے، اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے شرعاً نیست ونابود کیے جاسکتے تھے، مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدابیر اختیار کی گئی، ہندوستان کے مسلمان فتح مندوں نے اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا۔'' (ایضاً ص ۲۹۸)

وہ ایک دوسرے مصنف کے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شایع ہوا تھا، یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت، مخالف والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی، اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو باجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو

جاری کرنا چاہا مگر ان کو بزور جاری نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتح مندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے، اور مفتوحہ سلطنتیں اور شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتح مند نے ابتداء سے حضرت محمد ﷺ کے زمانے تک ہمیشہ قرار دی تھیں۔'' یہی مصنف مزید یہ بھی لکھتا ہے کہ ''فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔'' اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۹۹)

مندرجہ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں کہ:

''اب دیکھو کہ بہت سے ناظرف دار، فیاض طبع، عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے سے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے، کتنی مختلف ہیں۔'' (ایضاً ص ۳۰۰)

سرسید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان وسیع تر فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہنچے، اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گئے تھے، ان کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بد اخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے، جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا، اسلام نے ان خدا پرست لوگوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا، اور ان کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا اعلان کیا، اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، اور ان کی بیٹیوں، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یہودا علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیویوں اور بیٹیوں، اور ہارون علیہ السلام، داؤد وسلیمان علیہما السلام وغیرہ کی ان کے ہاں، باوجود نبی ماننے، مذہبی رہنما تسلیم کرنے اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر پیش کی جاتی تھی جیسے کہ وہ مجرم جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں، یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں، یہ صرف اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد

تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے، یہود عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے منکر، مخالف اور دشمن تھے، جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی، جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے، اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی، ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے، جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں، درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا، تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا اور آخر کار وہ عظیم الشان اصلاح کرنے پر قادر ہوا، جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، درحقیقت انسان کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے آزاد کر دیا، ہم کو یقین ہے کہ اگر "لوتھر مقدس" اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے، اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے، اور آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا، پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے۔ (ایضاً ۱۰۔۳۰۱)

## کچھ مذہبی کتابوں کے بارے میں

ابتدائے عہد اسلام تدوین علوم کا دور تھا، جس میں ہر طرح کے علوم وفنون کی تدوین ہوئی، کچھ لوگوں نے ثقہ راویوں کے بیانات قلم بند کیے، کچھ نے ثقہ اور غیر ثقہ، صادق وکاذب ہر طرح کے راویوں سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر دیں، اور ان کے راویوں کا ذکر بھی درج کتاب کر دیا، کچھ مصنفین کی غرض نہ تو کسی قصے کی تصدیق تھی، اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقعہ کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے، اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں، اور ان قصوں کی صحت یا عدم صحت کی چھان بین پڑھنے والے کی جاں فشانی اور تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں، بعد کے علماء نے متن اور راویوں پر نظر کر کے صحیح، ضعیف اور موضوع روایتوں کے الگ الگ مجموعے تیار کیے، اور راویوں کے حالات میں مفصل کتابیں تحریر کیں، جس کی وجہ سے اب صحیح اور غلط کی تمیز کا کام آسان ہوگیا، اور یہ واضح ہوگیا کہ کون سی کتابیں اور کون کون سے راوی معتبر

ہیں، اور کون غیر معتبر، روایت کے قبول کرنے کے بارے میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

''جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں، ان میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا ضرور لحاظ ہونا چاہیے، راوی نے صاف اور صریح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی، سلسلہ راویوں کا پیغمبر ﷺ تک غیر منقطع (یعنی مسلسل) ہو، پیغمبر خدا سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقوی اور تدین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں، ہر راوی کو اپنے سبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہوں، ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو، تاکہ یہ امر متقین ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا، اور دوسروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا، وہ قرآن مجید میں درج احکام یا قرآن سے معلوم ہونے والے مذہبی عقائد یا مستند حدیث کے مضمون سے متناقض (مخالف) نہ ہو، اس میں عجائب وغرائب، دور از عقل بیان نہ ہوں، بلکہ مفہوم حدیث ایسا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدہ مذہبی کی بنیاد بن سکتی ہے، لیکن اگر وہ حدیث ایک ہی شخص کی روایت ہے تو مفید یقین (یعنی عقیدہ کی بنیاد) نہیں ہو سکتی، بلکہ افادہ ظن کرتی ہے۔'' (خطبات احمدیہ ص ۲۵۴)

اسی بنا پر علمائے اسلام نے احادیث کی قسمیں، ان کے درجات، قبول کی شرطیں، کتب احادیث کی تفصیل، ان کے درجہ ومعیار کی وضاحت، راویوں کی قسمیں، ان کے تفصیلی حالات، سب ہی پر کام کیا ہے، اور حق اور ناحق، صحیح اور غلط کی تمیز، قرآنی احکام، قرآنی عقائد، مستند احادیث اور غیر معتبر روایت پر اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ اب مسلم اور غیر مسلم محقق کے لیے اصلیت کا پتہ لگانا کچھ بھی دشوار نہیں، مگر مستشرقین رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتے، اور نہ ہی راویوں کے حالات اور روایت کے معیار سے کچھ غرض رکھتے ہیں، بلکہ وہ بقول سرسید مرحوم:

''ہمارے جناب پیغمبر ﷺ خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں اور یہ جن مصنفوں نے اس قدر متحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں

کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے، جب کہ وہ برخلاف اس کے بغض اور تعصب کی وجہ سے انھوں نے دیدہ ودانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے جس کی شعاعیں ان کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، اور اس طرح انھوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے وہ لوگ ارادۃً نہیں دیکھتے۔'' (ایضاً ص ۳۲۲)

## مقدس جھوٹ

غلط روایات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں علمائے اسلام اور علمائے مسیحیت یا مستشرقین کے درمیان ایک بنیادی فرق سرسید مرحوم کے نزدیک یہ بھی ہے کہ:

''علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقائد میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے، اور اس لیے انھوں نے جھوٹی روایتوں کے بتانے والوں کو اگر کیسے ہی پاک اور نیک ارادے سے انھوں نے ایسا کیا ہو، جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی، مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔'' (ایضاً ۳۴۰)

سرسید مرحوم نے اس بارے میں خود سر ولیم میور کی اردو کتاب ''تاریخ دین مسیحی'' سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ ''دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے، تو انھی کے بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں'' آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے مطابق طریقہ مذکور تسلیم ہوا، اس سے البتہ مسیحی مباحثوں کی تیز عقلی، نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی، لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا، پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو آغاز زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں۔ اسی طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقے کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجراء کرتے تھے کہ اس حیلہ سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی

باتیں زیادہ مانیں گے، اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں، سواسی طرح مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے، کتاب لکھ کے کسی حواری، یا خادم حواری، یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے، ایسا دستور تیسری صدی میں شروع میں ہوا، اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا، یہ بات بہت ہی خلاف حق اور الزام شدید کے قابل تھی۔" (تاریخ دین مسیحی حصہ دوم باب ۱۳، مولفہ سر ولیم میور) اسی سلسلہ میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے موشیم کی کتاب تاریخ مذہبی سے یہ عبارت بھی درج کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "میں نہیں لکھتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا...... مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس تصور سے مبرا نہ تھے، صریح انکار نہیں ہوسکتا۔" (اینکلیزیا سٹکل ہسٹری باب ۳ ص ۷۰ مطبوعہ ۱۸۶۰ء) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حضرت مسیح علیہ السلام کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں، ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شاید برے نہ تھے، بلکہ وہ وہمی، سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے، اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات حواریان مقدس کے نام سے سارے جہان میں مشہور کی گئیں۔" (کتاب مذکور حصہ دوم باب ۲ ص ۳۶)

## مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے معیار اور رتبہ سے عیسائی عالموں کی ناواقفیت

دوسرے مذہب والوں یا حکیموں اور فلسفیوں کے مقابلہ میں "مقدس جھوٹ" کا اثر مستشرقین پر بھی پڑا، جو ان کے لیے کوئی مستحسن بات نہ تھی، اس سے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی، سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

> "عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں، اور روایت کے تو نام سے ہی وہ واقف نہیں ہیں، وہ جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہوگئے، اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ ان کی یہ مایہ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گزرتی ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا

ہے کہ مصنّفین کی بے علمی اور تعصب پر جو ان کی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے، ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرف اوقات پر افسوس کرتے ہیں۔" (خطبات ص ۳۵۶)

## ڈاکٹر اسپرنگر

ڈاکٹر اسپرنگر کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ "اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے، اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو، اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔" (خطبات ص ۳۵۷)

## روایتوں پر سر ولیم میور کے اعتراضات

تاریخ اور سیرت کے بارے میں دور اول کے مسلمانوں کی روایتوں پر سر ولیم میور نے بڑی تفصیل سے اعتراضات کیے ہیں، اور سر سید مرحوم نے ان کے جوابات بھی بڑی وضاحت سے دیے ہیں، اس بارے میں انھوں نے پہلے تو سر ولیم میور کے طرز فکر پر ان الفاظ میں شکوہ کیا ہے کہ:

"ہم افسوس کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر متعصّبانہ اور آزاد تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہی ان کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی، لوگوں کی محض بناوٹ اور ایجاد ہیں، انھوں نے شروع ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں، وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے، جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشا ہوتا ہے، یا کم سے کم کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے۔" (خطبات ص ۳۵۸)

سر ولیم میور نے ایک بات یہ کہی ہے کہ "ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد ﷺ کو عجیب وغریب اوصاف سے متصف کر دیا، ان کے پیروؤں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ محمد ﷺ کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں، جس سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں

آئیں، جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کا کوئی اندازہ سر دست موجود نہ ہوتا تو حافظہ کی قوت کو واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی۔"

مذکورۂ بالا اعتراض میں اصل نکتہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی روایتوں کی تعظیم اور احترام وتوقیر جو زمانہ مابعد کے لوگوں میں تھی وہ سر ولیم میور کے الفاظ میں "امتداد ایام کا اثر تھا" جو لوگوں نے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا، سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اب کہ سر ولیم میور اس طرح استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا، اگر اس کی ہر بات اور عمل کو دغا بازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں، اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کر سکے ان کے اوپر عائد کریں۔"

وہ سر ولیم میور سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات، ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا، ان کا "ید بیضا" دریا کا خون کی مانند ہو جانا "مینڈکوں کی وبا" اور دوسرے معجزات جو ان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے، بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا، من وسلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدائے تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا، خدائے تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا، اور ان کو "میری منتخب قوم" کے خطاب سے سرفراز کرنا، اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو "میرا پہلوٹا بیٹا" کہہ کہ ممتاز کرنا، کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے، نہیں کہہ سکتے جن کو اس نبی کے سرگرم پیرووں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو جنھوں نے "مشفکانہ تعظیم" اور "شائقانہ تکریم" کے سبب "امتداد زمانہ میں اپنے نبی کو عجیب وغریب اوصاف سے متصف کر دیا؟ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی (جو دراصل سر ولیم میور ہی کے طریق استدلال اور زبان اور اسلوب بیان کے مطابق یہ ہوگی) کہ "ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبے سے عروج حاصل ہوا، اور زمانہ ان

کے پیرووں سے ان کو جس قدر دور کرتا گیا، اس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں سے (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلیف پیغام وسلام رکھتا تھا، زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا، دل میں دانستہ یہ خیال گزرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل ہیں، اور وہ ایسے سامانوں سے گھرے ہوئے اور آراستہ ہیں جو انسان کے امکان سے باہر ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے عقیدت منداور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا، جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کراماتی پیدائش اور ان کا (عیسائیوں کے خیال میں) از سر نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا، یعنی حسب قانون "وحدت فی التثلیث" اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔"

سیرت وتاریخ کے ابتدائی راوی یعنی صحابہ کرام اپنے کردار اور بلندی اخلاق میں ممتاز ترین افراد تھے، اس لیے سرسید مرحوم بجا طور فرماتے ہیں کہ "عقل وفہم کی تعظیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع ہے جنھوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو۔ البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر مصنف کو یہ لالچ ہے کہ جب دوسروں کی تحریروں اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرلے۔" (ایضاً ص ۶۰۔۳۵۹)

سرسید رحمۃ اللہ علیہ صاف اور واضح الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ:

> "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف ملتفت اور مصروف کردیا تھا، وہ امر حق کو مانتے تھے، اور اس جہان فانی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے، وہ ایمان دار، صادق القول اور نیک طینت تھے، اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے اس غرض سے کہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجموعہ تیار ہوجائے، دُور دراز کے سفر اختیار کرتے تھے، انھوں نے حکام وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کو بے شمار دقتیں پیش آئیں

اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بہ مشکل خیال میں آ سکتی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی اور اُس کو انجام تک پہنچایا جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو دینی سبب اور مخلصانہ طریقوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی، اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہو سکتے کہ ان کے افعال کو ریا کاری اور فریب کی طرف منسوب کریں، اور اس طرح کے بے بنیاد بیان پر کہ، وہ محض بناوٹی ایجاد ہیں، ان تصنیفات کی بے جا تحقیر کریں۔" (خطبات ص ۳۶۱)

## کیا حدیثیں سیاسی ضرورت کی وجہ سے سامنے آئیں؟

سرولیم میور کا یہ بھی خیال ہے کہ ترقی پذیر سلطنت کی ضرورتیں، قرآن کے مجموعہ سیاست میں ایجاد اور اضافہ کا سبب بنیں، جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادگی اور محدود نظام تمدن کے لیے کافی تھیں، ان کی اولاد کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے اب ناکافی ہوگئیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے معدود اور معرا (یعنی گنے چنے اور صرف احکام) و مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے۔" لیکن بقول سر سید احمد خاں:

اس بیان میں سرولیم میور نے دو طرح غلطیاں کی ہیں، ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت یا مجموعہ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا، یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے، انھوں نے احادیث نبوی ﷺ کو صرف دینی اغراض سے جمع کیا تھا، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب کہ مسلمان نے امور سیاست کو الہامی سمجھا ہو، خود جناب پیغمبر ﷺ اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے صلاح لیتے تھے اور اس کے مطابق کاربند ہوتے تھے، قرآن مجید اور نیز پیغمبر ﷺ خدا نے سیاست اور انتظام مدن کے سبھی معاملات کو چند اصول عام کے بعد بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے وہ کام کریں جو زمانہ حالات اور ڈھنگ کے

واسطے ضروری ہیں، پس مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنے روز افزوں ضرورتوں میں قرآن کی تکمیل کے لیے حدیثوں کو تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلاشبہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، اسی طرح کی کاروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی، اور یہ اس محبت اور عشق کا تقاضہ تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبر ﷺ کے ساتھ رکھتے ہیں، اور اسی لیے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے، پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی، مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین معنی میں بیان کیا ہے۔''

(خطبات احمدیہ ص ۳۶۲)

انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا، ہم علانیہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نکال دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو، اس کے برعکس ہم یہ بات اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفاء کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے، اس زمانہ کے خلفاء جناب پیغمبر ﷺ خدا کے خلیفہ نہ تھے بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلہ خلافت (یعنی پیغمبر ﷺ خدا کے جانشین خلفاء کا زمانہ) جناب رسالت محمد ﷺ کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہوگیا۔ (ایضاً ص ۳۶۴)

## سر ولیم میور کا واقدی سے استناد

سر سید فرماتے ہیں کہ ''سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں۔'' پھر چند سطروں کے بعد وہ واقدی سے استناد پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہم کو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ سر ولیم کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے سب

بیانات کو واقدی پر مبنی کیا ہے جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں، اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے، نیز اپنے عقیدے کے مطابق ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی نسبت معترض ہوتے، تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی ضروری امر میں کوتاہی پائی جاتی ہے، مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوش گواری سے ہضم کر جاتے ہیں، اور دوسروں کی نسبت عجیب وغریب پیرایے میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ: ص ۳۶۵)

مسلمانوں میں جو لغو، غیر معتبر اور موضوع روایتیں پیدا ہوئیں، ان کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ اکثر کتابیں صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان کی صحت اور وجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول وقواعد اور سخت معیار مقرر کیے گئے ہیں اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گناہ گار ٹھہرائے گئے ہیں، لیکن اس موقع سر سید رحمہ اللہ علیہ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹی روایتوں کے باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے، مذہب عیسوی میں دینی کتب کے نام سے جو روزانہ ہر کلیسا میں پڑھی جاتیں، بے شمار رسالوں اور موضوع کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، جن کی وجہ سے ان کے دین دار حلقوں میں بے انتہا مناقشے اور قضیے پیدا ہوگئے، قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول کیا تو اس نے ۳۲۰ء میں مجلس نیس (نسیا) منعقد کی جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صحیح اور موضوع انجیلوں میں تمیز کی جائے۔ بقول والٹیر عیسائیان سابق پر اس لیے نفریں کی گئی کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جب کہ اس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا، حضرت مریم علیہا السلام کے خطوط، سنیقا کی جانب سے پلوس کے نام خطوط، پلاط کے خطوط اور افعال، مصنوعی اناجیل، جھوٹے معجزات اور دوسری ہزاروں جعل سازیوں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے

تھے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔"

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی، الوہیت مسیح علیہ السلام کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ ۱۸ بشپ اور ۲ دو ہزار پادریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت سے انکار کیا، اس پر دلیلیں دیں، لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، اریس جو اٹھارہ بشپہائے معترضین میں سے ایک تھا، فرقہ یونیٹرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا، جو حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے منکر تھے، وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا۔ جہاں اس کے عقیدے کو بالاتری حاصل ہوئی، اور تمام صوبہ جات روم میں اس نے رواج پایا، جب کہ آثاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرکردہ تھا اس کے خلاف سخت جدوجہد کی، اس مجلس نیس کی کاروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آبائے کلیسا، توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب وتصحیح میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب بلا لحاظ وتمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا، اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے، زمین پر گر پڑے۔

دوسرے مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی، جن میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر مفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے، اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے، ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افسیس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریم علیہا السلام ام اللہ (مادر الہ) تھیں، خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں دو صفتیں تھیں، اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسا روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا، جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدہ کے لیے تقریباً انتیس خوں ریز جنگیں ہوئیں۔

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۸۔۳۶۵)

سر ولیم میور، تورات وانجیل کی مذکورۂ بالا ناگفتہ بہ صورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اس سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انھوں نے بعض یوروپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انھوں نے ابھی معتبر مانا ہے، بلکہ بقول سر سید:

''یوروپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے نمبر اول ہیں، بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی، مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں، جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے۔''

(ایضاً: ص ۳۶۹)

سر ولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ ''جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے خراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا'' کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اول یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کر کے ان کی روایتوں کو قلم بند کر لیا جائے، قرآن وحدیث کے مقصد اور اصول وکلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے، اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں، اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مضامین حدیث کے لحاظ سے حدیث کے اعتبار وعدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پر چاہے، معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے۔

(ایضاً ص ۳۷۱)

## اوائل عمر سے متعلق روایتوں پر اعتراض

رسول اکرم ﷺ کی ابتدائی عمر سے متعلق روایتوں پر بھی سر ولیم میور نے بے سر وپا اعتراض

کیے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کے اس زمانے کے حالات جن لوگوں نے بیان کیے ہیں وہ لوگ آپ سے عمر میں تو چھوٹے تھے یا برابر، اس لیے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات، یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے، اور آپ کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کیے ہوں گے، مگر

> ''بظاہر یہ لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوا ہوگا، لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے پہلے یہ فرض کرلیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''روایت کی سب سے پہلے ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا'' مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں، اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر ﷺ خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی، دوم یہ کہ موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کرلیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے پیغمبر ﷺ خدا کی حیات میں وفات پائی تھی، یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے، یہ امر تاریخی واقعہ کے خلاف ہے، اور صحابہ بھی بہ لحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو باچشم خود دیکھا اور ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر، اوروں سے بے کم وکاست نقل کیا ہو، اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔''

(خطبات احمدیہ: ص ۳۷۶)

سرسید یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موصوف رکھنا، شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کرلیا ہے، سراسر انحراف ہے، گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے، اور جن سے کسی واقعہ کے صدق یا کذب کا فیصلہ ہوسکتا ہے، صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ کے بارے میں کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق کرے فوراً تسلیم کرلیا جاتا ہے، اور دوسری صورت میں راویوں کی کثرت اور تواتر سے اس کی صحت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جناب پیغمبر خدا کے زمانہ کے

واقعات کی تصدیق کے لیے یہی صورت لازم اور ممکن ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ کسی مذہب کا لحاظ کیے بغیر جو سچے اور مسلمہ قوانین شہادت مرتب کیے ہیں، ان ہی کی روشنی میں گواہوں کے بیان صدق کا امتحان کریں۔

رسول اکرم ﷺ کے اوائل عمر میں جو واقعات پیش آئے، سر ولیم میور کے نزدیک ''ان کے بارے میں کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی۔'' اس اصول کو سر ولیم، رسول اکرم ﷺ کے دور نبوت کے ابتدائی عرصہ تک وسعت دیتے ہیں جب کہ آپ ﷺ نے علانیہ دعوائے نبوت کیا، شرک سے ممانعت فرمائی، اور باشندگان مکہ سے لڑائی کے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب کہ انھوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے، لیکن بقول سرسید:

''سر ولیم میور کا یہ فرضی اصول جو انھوں نے اپنی ذہانت سے ایجاد کیا ہے، اگر مان لیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس سوانح عمر کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پہلے وجود میں آئی تھی کیا کیا جائے گا، کیا ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا؟...... ہم کو آنحضرت ﷺ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرت ﷺ کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں ایسا نہیں ہے، ان دونوں کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے، ہم کو کس طرح یہ یقین ہوسکتا ہے کہ وہ نامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا، جس کو تمام دنیا حضرت موسیٰ کہتی ہے، اور ہم کو کس طرح اس بات کا مکمل یقین ہوسکتا ہے کہ وہ بچہ جس کو ہم کلمۃ اللہ اور روح اللہ اور عیسائی اس کو ابن اللہ کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ

کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل سے تھا، اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی بھی محال اور غیر ممکن چیز کا ثابت کرنا۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۵)

مسلمان تو حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور کا اصول خود ان کے حق میں سخت مضر ہے جس سے ان کی اپنی مذہبی بنیادیں ہل جاتی ہیں، پھر یہ اصول شہادت کے مسلمہ قوانین کے بھی برخلاف ہے، جہاں تک رسول اکرم ﷺ کے ابتدائی واقعات کا تعلق ہے تو ''بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد'' ان کی روایت کا افسانہ بھی ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، اس لیے کہ:

''پیغمبر خدا ﷺ کے غیر مشہور زمانہ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گزرا تھا، زمانہ روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے، جنھوں نے جناب پیغمبر ﷺ خدا کی پیدائش، ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور ان کی نوجوانی دیکھی اور گو بقول سر ولیم میور ''ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا'' تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دید باتوں کو بھول گئے ہوں، برخلاف اس کے جب کہ ایک بے کس یتیم بچہ، ایک ایسا شخص جس کی نسبت تمام باشندگان مکہ میں سب سے کم یہ گمان ہوسکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں، اور ایسا غیر مشہور شخص وہ چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہوا اور جو اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص جو اس سے قرابت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانے کے حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا، اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں، اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے

گواہ ہوں۔" (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۶)

لیکن سر ولیم میور اس دور سے متعلق کسی بھی طرح کی قباحت کو بناوٹ کی ایک بڑی علامت تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ اصول واضح طور پر مسلمہ قانون شہادت کے خلاف ہے، اور وہ نتیجہ جو انھوں نے عیسائیوں کے فن تحقیق کے قانون کو روایات اسلام پر جاری کر کے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا، جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں ص، لیکن بقول سر سید، سر ولیم کا یہ اصول پیغمبر خدا ﷺ کے زمانہ غیر مشہور پر ٹھیک صادق نہیں آتا، اور جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن ہوتی ہیں، تو اس بنا پر جو شبہ ہوتا ہے، راوی کی نسبت ہوتا ہے کیونکہ اس کو تفصیل یاد رہی نہ مضمون روایت کے بارے میں کیونکہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن نہیں، اور اسی لیے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامعین روایت کے نزدیک، قواعد کی روشنی میں راوی کا چال چلن ہر طرح درست ثابت ہو، اس کے حافظ پر اعتماد ہو، اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کے صحیح تسلیم کر لینے میں کچھ شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً: ص ۳۷۸)

## دور نبوت کے اہل کفر کے بارے میں

مکہ میں دور نبوت، بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانہ نبوت کو بھی سر ولیم نے اپنے قیاس وتخمین کا نشانہ بنایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے، اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات، بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا، اور چونکہ خود رسول اکرم ﷺ ان پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی، اور اسی وجہ سے اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے، اور مؤرخین ہمیشہ اس شہادت پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے، لیکن سر ولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ باد ہوائی ہے، بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے، بقول سر سید:

''صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین پر بھی صادق آتا ہے، خصوصاً اس زمانے پر جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کے منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں، اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمان داری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں، لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں، اور وہ سب یک دل، یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں، یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں، اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو، یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات میں غلط بیان کی عدم امکان کا ثبوت ہے۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۹)

## ہوس مادی کا الزام

سر ولیم میور اپنے تعصب اور جوش میں عجیب و غریب باتیں تراشتے چلے گئے ہیں، وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ صاحب کی صحبت میں راوی کی ہوس نے بار پایا'' کیونکہ پیغمبر ﷺ کے نام کے ساتھ شرافت و حرمت وابستہ تھی، اور ان کی دوستی حصول مارج اور عزت کا سبب تھی، اور ''اس ہوس نے محمد ﷺ صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کی سب سے بڑی ممکن الحصول عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا جو خلاف فطرت واقعات کے ایجاد مبالغے کا باعث ہوئی، اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی'' اس موقع پر سر سید نے جو جواب دیا پڑھنے کے لائق ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرف دار بن جائے تو اس میں کوئی چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آ سکتا ہے کہ کسی مذہب کے

ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر ﷺ خدا کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے، اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا گمراہی کا موجب ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیز گار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریا کاری میں یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں، خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں، بطور مثال کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مت مذہب کو، دیگر مشرک مذاہب کو یہودی مذہب کو عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرین، ٹرنٹیٹیرین، ویزولینز بپٹسٹ، جمپرز، مورمنز، وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، ایمان داری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جان نثاری کی بو پاؤ گے، اور اپنے نبی کے احکام اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے، ہم کو اپنے بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن کے منتشر اجزاء کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے فرمایا: تو کچھ عرصہ تک زید بن حارث خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے، اور پھر جب ہوش وحواش درست ہوئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کی جو خود پیغمبر ﷺ خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا، آپ کیوں کر جسارت کرتے ہیں، اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آسکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے، اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے، فوراً ہی (سرولیم کی بیان کردہ) برائیوں

کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل وخوار کر دیا ہو، اور ایسے ایسے گناہ عظیم ان سے سرزد ہوئے ہوں۔" (خطبات: ص ۳۸۱)

## موضوع روایات کو خارج کیے جانے کی وجہ

راویوں کے عدم اعتبار یا بہت سی روایتوں کے بالکل ہی بے اصل ہونے کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو درج نہیں کیا، یا ان کو موضوع اور جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، سر ولیم میور نے ان کے بارے میں بھی اپنے قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں، اور تعصب کی وجہ سے ان روایتوں کے خارج کیے جانے کی عجیب توجیہ کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں، اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور عموماً بے اعتبار بالکل خارج ہوگئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔" پھر وہ کہتے ہیں کہ اس معاملہ کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گزشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کردی گئیں کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا،

سرسید نے میور کے "ایک طول طویل بیان کا خلاصہ" درج کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے، ان کے خیال میں سر ولیم میور کے مذکورۂ بالا بیان سے "صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے، بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے، اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے، جو اپنے بیانات، اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے، اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذاہب کی باتوں اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی طرح پر مضرت پہنچی ہو، نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں گے جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذہب کے بارے میں استعمال کیا کرتے تھے، سر ولیم میور کہتے ہیں کہ "روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں، کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا کل خارج ہوگئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔" مگر اس کے جواب میں سرسید فرماتے ہیں:

''یہ کیسا غلط بیان ہے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اور گھمنڈ کے ساتھ صاف اور بے الگ زبان میں بیان کرتے ہیں، گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے، اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ صرف اس قدر کہہ کر ہی اس کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ ''اس کو کامل طور سے ثابت کرنا...... غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کو جو اوائل میں ترک کردی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا۔'' کیا اس طرح پر دلیل لانا تعصب کا اثر نہیں ہے، جب کہ سر ولیم میور کا یہ بیان صحیح بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت ﷺ کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ خود قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں، اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے، اور نہ مخفی کی گئی، رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے، ہم تسلیم کرتے ہیں، مگر ان سے وہ بیجا اسباب منسوب کرنے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں، اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔''

(خطبات احمدیہ: ص ۳۸۴)

## ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ سر ولیم کی ہم نوائی

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب خوب ہوا دی ہے، جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہوگیا، مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی، اور اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں، اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورۃ النجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ''محمد ﷺ صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی، اور ان کو تسلیم کرلیا، اور جب وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا'' اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ سے منسوب کرتے ہیں، سر ولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے،

جس سے محمد ﷺ صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے وہ اس کے لیے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مولف نے اس ''مضمون'' سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علماء کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا ہے، جس کو سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اس روایت کو خاص اور اہم جزیہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے بتوں کی تعریف میں "تلك الغرانيق العلىٰ وان شفاعتهن الترجىٰ" کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے، اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچا، پھر مواہب لدنیہ کے مولف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا ﷺ نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی۔''

(خطبات احمدیہ: ص ۳۹۵-۹۶)

مواہب لدنیہ کے مولف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ ''جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب ان کو تسلیم کر لیں گے، مگر سرسید نے مواہب لدنیہ کی مذکورۂ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں، اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں، اور مرسل روایتیں یعنی جس کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو، مگر اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو، لیکن جب کوئی روایت مذکورۂ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو، اور جب کہ وہ جناب پیغمبر ﷺ کے ان تمام حالات کے خلاف ہو جو شرک مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں، اور جب کہ وہ

اسلام کے اصلی اصولوں سے اتفاق نہ رکھتی ہیں، پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے، اور کہنے والا بھی واضح نہ ہوا ہو تو ایسی روایت ازروئے انصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہوسکتی ہے جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس حرکت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں، اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند نہیں ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۹۵)

اصل واقعہ جیسا کہ سرسید نے وضاحت کی ہے یہ ہے کہ "جناب پیغمبر ﷺ کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے، کفار مکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرت ﷺ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے، وہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے، اور جب آپ خدائے واحد کی حمد وثنا بیان فرماتے تھے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے، پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سورہ نجم پڑھ رہے تھے، تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا: "تلك الغرانيق العلىٰ وان شفاعتهن الترجىٰ" اور جب پیغمبر ﷺ خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا، کچھ عجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا، مگر ان کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لیے مشرکین آنحضرت ﷺ سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہوگئے، اس وقت کے مسلمان ہرگز یہ یقین نہیں کرسکتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے وہ جملہ فرمایا ہو اور کہنے والا بھی متعین اور واضح نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے کہا یہ بات شیطان نے کہی تھی، اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور

لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا، جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو، انھوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے، کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے، مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر خدا نے وہ لفظ کہے تھے، بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسول ﷺ خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی بھی پیغمبر ﷺ خدا کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا، کیونکہ کوئی راویت ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کس نے اس بات کو بیان کیا ہو، بلکہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے، یہی بے سروپا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

(خطبات احمدیہ: ص ۹۸_۳۹۶)

## سرولیم کے خیال میں روایت کے معتبر ہونے کے لیے ایک عجیب قاعدہ

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سرولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''جب کسی روایت میں محمد صاحب'' کی تحقیر کے کلمات ہو مثلاً بعد ہجرت اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کار خیر میں ناکام ہونا، یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ روایتیں ایجاد کر لی جائیں، یا ایجاد ہو کر محمد ﷺ صاحب کے متبعین میں رواج پا سکیں۔''

مگر سرسید کے خیال میں ''درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے۔'' وہ فرماتے ہیں کہ کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا، اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کو تردید کریں، اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کر دیں، یا وہ کسی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، اور جن کی نسبت علماء نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں

ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں، دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے آنحضرت ﷺ کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اوراس کے بانی پر عیب لگائیں، اختراع کر لی تھیں، اس لیے ان مذکورۂ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا ان کی صحت کی دلیل نہیں رکھتی، تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ ''قیاس میں نہیں آتا کہ یہ روایات بنالی جائے یا گڑھ لیے جانے کے بعد متبعین محمد صاحب ﷺ رواج پاسکیں۔'' ان کی یہی دلیل ہر اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں۔

(خطبات احمدیہ: ص ۳۹۹)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لیے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک کا نام انھوں نے تلون آمیز اختراع رکھا ہے، اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً ان ہی کے بقول بیس ہزار گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب ﷺ خضاب کیا کرتے تھے، اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں، بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا، بلکہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ محسوس ہوتا تھا، کبھی خضاب نہیں کیا، اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔''

(ایضاً ص ۴۰۰)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ بیان واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے، جب کہ معمولی غور وفکر سے اختلاف کی اصل وجہ اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آسکتی ہے، چنانچہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا ﷺ کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے (بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق حضور ﷺ کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف ۱۷ سترہ بال سفید تھے) آنحضرت ﷺ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا، جو لوگ

ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے، ان کا یہی بیان ہے اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں اس لیے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں، اور ان ہی بھورے بالوں سے استدلال کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کا خضاب کرنا بیان کیا، خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے، بلکہ اس چیز کا ذکر ہے جس کو پیغمبر ﷺ صاحب غسل کے وقت اپنے سر پر مل لیتے تھے، پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورۂ بالا سبب سے قدرتی طور پر خود بخود ہو گیا، اس کو دیدہ ودانستہ میں بناوٹ نہیں کہا جا سکتا، ان کو بھی اس قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میورؔ نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض یا بناوٹی روایتیں نہیں کہا جا سکتا۔'' (خطبات ص ۴۰۱)

رسول اکرم ﷺ کی انگشتری مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم نے یہی طریق استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں خاتم نبوی کے باب میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے جانب داری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے سر ولیم کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے، ''ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحب ﷺ نے اپنے معجزات پر مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ خالد بن سعید نے اپنے لیے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی اور محمدؐ نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعد حبش سے لائے تھے، چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں کھدوایا تھا، اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمد ﷺ صاحب اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے، اور کچھ روایتوں میں ہے کہ بائیں ہاتھ میں کچھ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے، بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر صرف صدق اللہ منقش تھا اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''محمد رسول اللہ'' نقش تو سر ولیم کے بقول ''یہ سب روایتیں

ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی زیب انگشت کیا تھا، اور عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے چاہ غریس میں گر پڑی تھی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر ﷺ صاحب یا ان کے خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی، (ایضاً ص ۴۰۲) سر ولیم میور نے روایات میں تضاد ثابت کر کے انھیں پر فریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے، جس پر سر سید احمد خاں یہ تبصرہ کرتے ہیں:

''(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے، وہ نہایت افسوس کے قابل ہے، یہ بیان سر ولیم میور کا کہ ''یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں'' محض غلط ہے، اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کیا ہو، چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول کی انگوٹھی علیحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما والی انگوٹھی پر ''صدق اللہ'' اور جناب پیغمبر خدا ﷺ کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ ﷺ کندہ ہو؟ کبھی آنحضرت ﷺ نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو، اور کبھی الٹے ہاتھ میں، اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف اس انگوٹھی کو آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین میں ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے، جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی، سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق خیال کیا ہے، اس لیے اپنی دلیل میں کسی تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی، حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا، پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط

مستقیم سے منحرف ہوگئے، اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہوگئے، اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہہ کر بدنام کرتے ہیں، سر ولیم میور کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل وثبوت نہ ہو، ہمیشہ اس مقصد کی خرابی کا باعث ہوئے ہیں، جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۰۳)

## اسلامی روایات میں عیسائیوں کے "مقدس جھوٹ" کی تلاش

عیسائیوں کے یہاں مذہبی روایات کا زیادہ تر دارو مدار اس "مقدس جھوٹ" پر ہے جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے، اور اس کے کچھ شواہد کا تذکرہ آئندہ صفحات میں بھی کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں بھی "مقدس جھوٹ" کی جستجو کی ہے، اور اس بارے میں انھوں نے اسلامی روایات کو ان کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اپنی مذہبی روایات کے معیار سے قریب تر لانے کی "سعادت" حاصل کی ہے، مگر قواعد تصنیف میں اس قدر انحراف کو دیکھ کر ہر صحیح الدماغ اور ذی ہوش شخص کو یقینی طور پر ملال ہوگا کہ وہ دین اسلام پر الزام تراشی کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "مقدس جھوٹ" کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے، دینیات اسلام کی رو سے بعض حالتوں میں فریب روا ہے، خود پیغمبر ﷺ صاحب نے اپنے احکام ذریعہ اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے، کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔" پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے یہاں عام عقیدہ یہ ہے کہ ۴ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، کسی شخص کی جان بچانے کے لیے...... صلح واتفاق کرانے کے لیے، عورت کی ترغیب کے واسطے اور سفر یا کسی خاص مہم کے موقع پر" سر ولیم ان چار موقعوں کے لیے اپنے خاص انداز میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں "اول کی نسبت تو پیغمبر ﷺ صاحب کی صریح منظوری موجود ہے۔" وہ لکھتے ہیں کہ "عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انھوں نے رہائی پائی، پیغمبر ﷺ صاحب نے اس فعل کو پسند کیا، اور فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح

انکار کر دینا۔'' (واقدی ص ۱/۲،۲۲۷) ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا، اور جب تک کہ ان سے محمد ﷺ صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی، ان کو نہ چھوڑا جب وہ پیغمبر ﷺ صاحب کے پاس آئے، اور انھوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی، جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا، پیغمبر صاحب نے پوچھا کہ تمھارے دل کا کیا حال ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے، تب محمد ﷺ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا، محمد ﷺ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابو جہل کے سچ سے بہتر ہے۔''

سر ولیم میور کی اس نکتہ چینی کے جواب میں سرسید کو شیکسپیئر کا یہ قول یاد آ گیا کہ ''دیکھو کہ ایک سادہ قصہ کس طرح تم کو دھوکہ دیتا ہے۔'' اس کے بعد وہ اس ''نکتہ چینی'' کا تجزیہ کرتے ہیں:

''اول تو ان روایتوں کی جن کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے، دوسرے جن الفاظ میں موصوف نے مضمون کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں، سر ولیم دونوں موقعوں جھوٹ بولنے کے جواز کسی کا جان بچانا بیان کرتے ہیں، اول تو یہی غلط ہے، جو روایتیں انھوں نے بیان کی ہیں، ان کے مطابق ان پر لازم تھا کہ ''اپنی جان بچانا لکھتے'' اور اس بے دھڑک اور جرأت آمیز بیان کے بجائے سر ولیم کو لازم تھا کہ تمام شرطیں قیدیں اور مواقع جو ''سچ'' سے اس طرح انحراف کو جائز ٹھہراتے ہیں، واضح کر دیتے، جس فریب دہ اور عیب دار پوشاک میں سر ولیم نے اس مضمون کو آراستہ کیا ہے، اگر وہ اتاری جائے تو جائز، منصفانہ دلیل اور صحیح اصول و مقدمات کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ اگر اہل کفر بے رحم، اور جفا کار لوگ جبر و اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی آدمی سے اس چیز کا انکار کرالیں جس کو وہ اپنے دل سے، اپنے ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس پر ایسی مصیبت میں بھی وہ یقین رکھتا ہو تو ایسے وقت میں اپنے انکار سے وہ سزائے ارتداد کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۴۰۵)

وہ عہد و پیمان جن کی تکمیل و توثیق ظلم اور جبر کے زور سے کی گئی ہو ان سے انحراف کا جواز

سرسید کے الفاظ میں ''فرانس اول بادشاہ فرانس کی مشہور معروف نظیر سے بھی ثابت ہوتا ہے، اس بادشاہ کو چارلس خامس نے چنگ پادیا، ۱۵۲۵ء میں قید کرکے ماڈرڈ کے ذلت آمیز صلح نامہ پر بزور منظوری حاصل کرکے دستخط کرا لیے تھے، بادشاہ فرانس نے اس قید سے چھوٹتے ہی زور وزبردستی کا عذر ظاہر کرکے اپنے قول وقرار پر قائم رہنے سے انکار کیا، اور پوپ کلیمنٹ سابع نے اس کو اس جبریہ حلف سے بری کردیا۔''

سرسید ظلم، اور جبر سے لیے ہوئے ''عہد وپیان'' کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ''آدمی کے افعال میں جرم اور بے جری کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے، اور اس بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک وبد قرار دیتے ہیں، کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے اس کو اذیت دے کر اور قتل کی دھمکیوں کے بعد زبانی طور پر یا تحریر کی صورت میں حاصل کر لیے گئے ہوں، اسی قدر سزا کے مستحق ہوں گے، جیسے کہ اس آدمی کے کلمات اور حرکات جو کسی جبر اور زبردستی کے بغیر اس سے سرزد ہوئے ہوں، سرسید نے اس موقع پر یہ بھی واضح کردیا ہے کہ:

''یہ اصول جس سے اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے، اور جو محض ایک بے خطا اصول اور قدرتی فطرت کا سچا نمونہ ہے، اور جس کو سروليم میور نے قابل اعتراض انداز اور خراب صورت میں پیش کیا ہے، قرآن مجید میں صاف اور سادہ طریقہ سے یوں، بیان کیا گیا ہے کہ ''جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا، ایمان لے آنے کے بعد سوائے اس آدمی کے جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کے دل، ایمان مطمئن ہو، اور جس نے کفر سے اپنے دل کو مطمئن کرلیا، تو اُن پر خدا کا غصہ ہے، اور ان پر بڑا عذاب ہے (نحل: ۱۰۸) اس آیت پر فقہاء نے غور کیا ہے اور دو صورتیں بیان کی ہیں، اول عزیمت کی، یعنی آدمی اہل کفر کی طرف سے اذیتوں، تکلیفوں اور قتل کے خوف کے باوجود ظاہر میں بھی اسی سچ پر قائم رہے، جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، دوم رخصت کی صورت یعنی اس صورت میں اس کو یہ اجازت ہے کہ اس ایمان کا انکار کردے جس کی تصدیق اس کے دل میں موجود ہے، اور اس طرح وہ دشمنوں کی ایذا سے اپنے آپ کو بچا لے، یہ عجیب

بات ہے کہ اس صاف اور سیدھی بات سے سر ولیم میور نے وہ ''مقدس جھوٹ'' ثابت کرنا چاہا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا، پھر انھوں نے اپنے مقصد اور مفہوم کے لیے یہ چند الفاظ ''کسی کی جان بچانے کے لیے'' کافی سمجھے، جو گمراہ کن ہیں، جب کہ قرآن میں بھی جو اپنی فصاحت اور اختصار میں بے مثل ہے اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ایک پوری آیت درکار ہوتی ہے۔ (خطبات ۴۰۷)

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور جس روایت سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ''وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے لیے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے، گو وہ کلمات جھوٹ ہوں۔'' مگر سر سید کے نزدیک:

''یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے، اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اور جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہ اس کو درج کرتے ہیں، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ام کلثوم نے کہا: رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ:

لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فیقول خیرا وینمی خیراً.

(متفق علیہ)

''وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے، پس بھلی بات کہے اور بھلائی پہنچا دے۔''

قاضی بیضاوی نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ ''وہ اس کے پاس ایسی باتیں پہنچا دے جن کو سن کر وہ مان جائے اور اپنی شر کی باتوں کو چھوڑ دے۔''

سر ولیم میور کی عربی دانی کا خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اصل حدیث پر غور کرتے اور خود اس کا صحیح ترجمہ کرتے، انھوں نے کپتان ای۔ این میتھیو کے غلط ترجمہ مشکوٰۃ کو اختیار کیا، اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ ''گو وہ کلمات دروغ ہوں'' اپنے ترجمے میں بڑھا دیے، جب کہ وہ

الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا لفظ بولتے ہیں، اس لیے جناب پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں داخل نہیں، یعنی جو سزا ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے، اس سزا کا مستحق یہ آدمی نہ ہوگا جس نے صلح کی غرض سے صرف اچھی باتوں کا تذکرہ کیا ہو۔" (خطبات احمدیہ: ۴۰۸)

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں وہ ہے کسی عورت کو ترغیب دینے میں یا سفر یا مہم میں، کسی عورت کو ترغیب دینے کے الفاظ بھی سخت گمراہ کن ہیں، جب کہ سر ولیم میور کی مراد "اپنی بیوی کو ترغیب دینے" اور اس کی دل داری کرنے سے ہے، وہ لکھتے ہیں کہ تیسرے موقع کے لیے "ہمارے پاس ایک افسوس ناک نظیر موجود ہے کہ محمد صاحب ﷺ نے ماریہ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی (دوسری) ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے کو معیوب نہ سمجھا۔" اور چوتھے موقع کی مثال یہ دی ہے کہ پیغمبر صاحب ﷺ کا معمول تھا کہ "ترتیب مہمات کے وقت (تبوک کی مہم کو مستثنیٰ کرکے) اپنے اصلی مدعا کو پوشیدہ رکھتے تھے، اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے" سر سید نے ان دونوں موقعوں کو جو وضاحت کی ہے وہ درج ذیل ہے:

سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے، کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے، اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا، اور چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے، پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہوسکتی، جب تک کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو، کافی ثبوت نہ ہو۔

"ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو عام کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں

ہے، لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے اعلان جنگ نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکہ ہو، بلاشبہ اخلاق اور صداقت کے خلاف ہے، لیکن جب جنگ کا اعلان اور اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو اور اس سے اپنے عزائم اور جنگی منصوبوں کو مخفی رکھنا صداقت کے خلاف نہیں ہے۔" (خطبات ص ۴۰۹)

اسلامی روایات میں "مقدس جھوٹ" کی جستجو کے لیے سر ولیم میور نے جاں فشانی کی ہے، سرسید احمد خاں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے، مذہب اسلام پر عائد کرنا چاہتے ہیں، مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا، کیونکہ صدق حقیقی قرآن کا لب لباب اور جوہر ہے، اور سچائی اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جب کہ "مقدس جھوٹ" کا تصور قرآنی سچائی کے برخلاف ایک دوسری چیز ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جیسا کہ تاریخ میں ہے، صاف صاف ثابت ہوتا ہے، ارکان مذہبی میں ایک رکن "مقدس جھوٹ" بھی تھا، اور ہم کو تعجب ہے کہ مقدس پال حواری اس گناہ تو کیا سمجھتا، برا بھی نہیں جانتا تھا، اس بات کو عیسائی عالموں نے خود مقدس پال کے اس کلام سے ثابت کیا ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوء تو کس لیے میں گناہ گار گنا جاتا ہوں۔" (پال کا خط رومیوں کو باب ۳ درس ۷) سرسید تاریخی کتابوں میں سے اس مقدس جھوٹ کا جو عیسائیوں میں رائج تھا، ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ "کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ" نامی کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "کلیسا کا شریف اور راست باز فرزند موشیم جس کی سند اور تسلیم شدہ سچائی پر پادریوں نے کبھی شبہ نہیں کیا، وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پیروان، افلاطون و فیثا غورث کا یہ اصول تھا کہ صدق و پرہیز گاری کی صفات کو ترقی دینے کی غرض سے دھوکہ دینا یا بوقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہی مصر کے یہودی پیروان افلاطون

دفینا غورث سے یہ اصول سیکھ چکے تھے جیسا کہ بے شمار تحریروں سے کسی حجت اور اعتراض کے بغیر یہ بات ثابت ہو چکی ہے، عیسائیوں میں یہ غلطی دونوں راستوں سے دراندازہوئی، چنانچہ ان کے یہاں نامی گرامی اشخاص کی طرف بے شمار کتابوں کو غلط طور پر منسوب کیے جانے سے یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی موشیم کے بیان کے مطابق صرف دوسری صدی ہی میں بے شمار انجیلیں اور خطوط گڑھے گئے، اور دوسروں کی طرف غلط طریقہ سے منسوب کر دیے گئے، چوتھی صدی میں دینی مقاصد کی ترقی کے لیے دھوکہ اور مقدس جھوٹ پچھلے زمانوں سے بھی بڑھ گیا تھا، گسوبن نے یہ لکھا ہے کہ ''دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں مجھے یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی میں اپنی طرف سے باتیں ملا دینے کو ناموری سمجھتے تھے، صرف اس لیے کہ ان کے نئے عقیدوں کو عقلاء کفار (غیر مسیحی فضلاء) گوش دل سے سنیں گے، (کرسچین میتھالوجی ان فیلڈا ص۸۲۔۸۰) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انجیل کی کوئی بات دین داروں یا ملکی حاکموں کے اغراض کے موافق نہیں ہے تو اس میں ضروری تبدیلیاں اور تحریفات کر لی جاتیں، اس کے علاوہ طرح طرح کے اور مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں جو رائج تھیں، ان کو بہت سے پادریوں نے جائز قرار دیا تھا، (ایضاً ص۵۲) اسی کتاب میں یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ ''اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں، اور جو کچھ علم ہے وہ نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان روایتوں اور حکایتوں کے بیان کرنے والے جو اس زمانہ میں گزرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں، مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ ان سے بھی سبقت لے گیا، وہ خود فخریہ بیان کرتا ہے کہ ''جس سے ہمارے دین کی عظمت اور نام آوری بڑھے میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو، میں نے سب چھوڑ دیا ہے (ایضاً ص ٦٦) مندرجہ بالا مثالوں کو نقل کرنے کے بعد سرسید نے مقدس جھوٹ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

> (دور اول عیسائی مؤرخین) کی تحریروں میں ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے، جسمانی خواہش اور خوف ایمانی کے درمیان غلبہ حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں...... اور

انجیل کے بے شرمانہ تحریفات اور تصرفات کی مدد سے کلیسائے روم نے عجیب وغریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر پھیلا دیا تھا، جس نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا، انھوں نے اس مقولہ کی تلقین کو جو موشیم کے الفاظ میں یہ کہ ''دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں، کار ثواب ہے'' کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس بے قید اصول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمے کا دہانہ کھول دیا جس کا پانی ابتدائے دین عیسوی کی سرزمین پر طوفان کی طرح چھا گیا، اور جس نے ان فریبوں اور باطنی صفات کو رواج دیا، جو اس زمانہ میں عیسائیان رومن کیتھولک کی بدنامی کا سبب ہیں، (دور اول کے یہ عیسائی مؤرخین) اور اول سے آخر تک ان کے سوانح نگار کفر آمیز سفلگی عقیدہ میں خوش فہمی تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے، اس کے باوجود پطرس حواری کے جانشینوں نے ایسے لوگوں کو پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں جگہ دی ہے۔

سر ولیم میور کے لیے یہ مناسب تھا کہ مذکورہ بالا حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اسلام پر مقدس جھوٹ کا الزام لگانے کی بے جا طور پر کوشش نہ فرماتے، اسلام سرتاپا صدق ہے، وہ نہایت درجہ کی سچائی اور راست بازی کا دین ہے، اور اسی حیثیت سے اس کو یہ حق ہے کہ دوسرے دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اپنی فوقیت اور برتری کے لیے دعوے دار ہو۔'' (خطبات ص ۴۱۳)

## اختلاف قرأت، قرآن اور بائبل میں

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، جس طرح آسان ہو پڑھو۔'' اختلاف قرأت، فن تجوید قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے سمجھنے میں عیسائی مصنفوں کو سخت دھوکہ ہوا، اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں) میں اختلاف قرأت ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی اختلاف قرأت ہے، حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف ہیں، اور جو اسباب عہد عتیق اور عہد جدید میں مختلف قرأتوں کے پیش آتے ہیں،

ان میں اور قرآن مجید کی قرأت سبعہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اگر ہم قرآن مجید کی قرأت سبعہ یا اختلاف قرأت کی ان ہی معنوں میں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے تو یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف قرأت سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، مسلمانوں میں اختلاف قرأت کی تمام صورتیں صحیح اور درست ہیں، لیکن بائبل کے اختلاف قرأت کی نوعیت بقول رورنڈ مسٹر ہارن یہ ہے کہ دو یا زائد مختلف قرأتوں میں سے صرف ایک ہی قرأت صحیح ہوسکتی ہے اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی۔'' وہ عہد عتیق اور عہد جدید میں اختلاف قرأت کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

(۱)...... ناقلوں کی چوک اور غلطیاں

(۲)...... جن نسخوں سے نقل کیا گیا ہے ان میں پہلے سے سقم اور غلطیوں کا پایا جانا۔

(۳)...... کسی معتبر سند کے بغیر کاتبوں کی طرف سے متن کی عبارت میں اصلاح کی خواہش

(۴)...... وہ تحریفات جو کسی فریق کے حصول مدعا کے لیے قصداً کی گئی ہوں۔

بائبل میں اختلاف قرأت کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی قرآن کے اختلاف قرأت کی اصطلاح سے تعلق نہیں رکھتی، قرآن مجید میں اختلاف قرأت کی ایک صورت جو دور اول میں پائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں نے جتنا قرآن رسول اللہ ﷺ سے سنا، مختلف سورتیں یا آیتیں وہ اپنی بیاضوں میں چمڑوں کے ٹکڑوں پر یا اور دوسری چیزوں پر بغیر کسی ترتیب کے لکھ لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت کا رواج تھا، تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا، قرآن کے حافظ موجود تھے، اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ترتیب طے شدہ تھی، اس لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں تمام صحابہ کی رائے سے حافظوں اور دوسری تحریروں کی مدد سے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کی نگرانی میں قرآن کو ایک جلسہ میں مرتب کر لیا گیا، اس لیے نامکمل بیاضوں کی وجہ سے جس میں اِدھر اُدھر بے ترتیب آیتیں لکھی ہوئی تھیں، قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ناواقفیت کی بنا پر اب بے ترتیبی کا امکان ختم ہو گیا، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں

میں تقسیم کردی گئیں تو اختلاف قرأت کی مذکورۂ بالا نوعیت کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہ گیا۔

دنیا کی ہر ایک زبان کی طرح عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی بعض لفظوں کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا تھا، قرآن مجید کی سات قرأتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ کو مختلف قبیلے اپنے اپنے تلفظ کے مطابق پڑھ سکتے ہیں، لیکن جہاں تک قرآن مجید کی کتابت کا تعلق ہے، تحریر کی حد تک الفاظ قرآن کے تلفظ کا یہ اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہوگیا ہے، چنانچہ سر سید احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کامیابی ہوئی ہے، قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا ﷺ اس کو پڑھا کرتے تھے، لیکن چونکہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ دوسرے قبیلوں سے ادا نہیں ہوسکتا تھا، اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا، مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے، مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید پڑھنے میں محسوس ہوگا نہ کہ اس کے املا میں اور اسی لیے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آسکتا، اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔'' (خطبات ص ۴۳۵)

حاضر و غائب صیغوں یا اعراب وابواب کا اختلاف جو پایا جاتا ہے وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، اور پھر چند ہی جگہوں میں سے جس سے قرآن مجید کے اصلی مطلب یا احکام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا، اور قرآن مجید کے حاشیوں میں ان کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور تفسیروں میں ان پر پوری بحث موجود ہے، اس لیے:

> جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اور جو الزام عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کمی بیشی کرنے کا یا آیتوں کو چھپا ڈالنے کا عائد نہیں ہوسکتا، علم ادب کی یہ شاخ جو قرآن مجید کی عبارت پڑھنے

سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا نام علم تجوید ہے، اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور علماء نے شرح وبسط سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔" (ایضاً ص ۴۳۶)

## ناسخ ومنسوخ کے بارے میں

حالات اور موقع ومحل کی مناسبت سے احکام شریعت میں تبدیلی انبیائے کرام کے ذریعہ بحکم خداوندی ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی کو نسخ کہتے ہیں، حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ کہا جاتا ہے، فقہائے اسلام کے یہاں ناسخ ومنسوخ کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا کردی گئی، مثلاً انھوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے، اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا، تو انھوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا، حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے، اور بقول سرسید احمد خاں فقہاء نے یہ رائے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقوں کو آسان بنانے کے لیے اختیار کی ہے، مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہے لازم نہیں آتی۔

قرآن مجید کی آیت نسخ اور فقہاء کی اصطلاح ناسخ ومنسوخ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی عالموں نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے، اور ان کو صریح مغالطہ ہوا ہے جس کا اندازہ درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے:

"مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے قرآنی آیات محمد ﷺ کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، ہر وحی ان کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے، اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول کے ذریعہ رفع ہوگیا کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیلی یا ترمیم ہوگئی ہے۔" (گبن)

"اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے، مگر مسلمان اس اجتماع ضدین میں تطبیق کی تابہ امکان کوشش کرتے ہیں، تاہم مجبوراً ان کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ کم سے کم دوسو پچیس ۲۲۵ آیتیں منسوخ ہیں۔" (سرولیم میور)

سر سیّد احمد خاں ناسخ و منسوخ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عیسائی عالموں نے ان لفظوں کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا، بیکار کر دیا ہے، مگر ان کا یہ خیال غلط ہے، مسلمانوں میں تو اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے کہ خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے، یعنی اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم ہے، اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ کے پہلے حکم میں کوئی نقص تھا جو بعد کو ظاہر ہوا، اور پھر دوسرا حکم دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے کمال علمی میں نقص تھا، اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے، اس لیے مسلمانوں میں ناسخ و منسوخ کا مطلب وہ نہیں ہے جو عیسائی علماء سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تبدیلی کی گئی، جس کی مثالیں بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا: کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا، لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اور گھر سے باہر نکال دے، اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی بیوی کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا، لیکن یہ قید لگائی کہ اگر کسی شدید ضرورت اور معقول وجہ کے بغیر شوہر طلاق دے گا تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا، ناسخ و منسوخ کی اس تشریح کی روشنی میں قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی، البتہ پچھلی شریعتیں منسوخ ہوئیں، مگر اس مفہوم میں نہیں جو عیسائیوں کے یہاں جانا جاتا ہے، یعنی خدا کے علم میں تغیر یا نقص واقع نہیں ہوا، بلکہ نئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے نیا حکم دیا، اور پچھلی شریعت خدا کے علم میں پچھلے زمانہ ہی کے لیے تھی، قرآن مجید کی آیت ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ

کَفَرُوْ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ.... مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْنُنْسِهَا.... قَدِیْرٌ ﴾ (البقرہ: آیت ۹۹۔۱۰۰) سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس میں صاف طور پر اہل کتاب کا ذکر ہے، جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی وبیشی ہوگئی ہے، ان کے بارے میں خدا نے فرمایا: کہ ہم جس آیت یعنی اہل کتاب کی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ناسخ ومنسوخ کے دوسرے معنی، ایک فقہی اصطلاح کے طور پر ہیں اور فقہاء کی اس اصطلاح کا اطلاق قرآن وحدیث پر بھی ہوتا ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں جن کا تعلق ایک ہی معاملہ سے ہے، مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں، جب وہ حالت باقی نہیں رہتی تو اس حکم کی تعمیل واجب نہیں رہتی، اور دوسرا حکم جو تبدیل شدہ حالت کے مطابق ہو، نافذ ہو جاتا ہے اگرچہ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ کہیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلی حالت پھر واپس آجائے تو اس کا حکم بھی دوبارہ نافذ کرنا ہوگا، نہ کہ دوسرا حکم، مثلاً جب شراب کی ممانعت ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کو بھی جن کا خاص طور پر عربوں میں رواج تھا ممنوع قرار دیا، مگر جب یہ حکم سب لوگوں کو معلوم ہوگیا اور شراب پینے کا رواج بھی ختم ہوگیا تو آپ نے ان پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی، اسی طرح جب مکہ میں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان محکوم تھے تو مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب یہ مسلمان دوسرے ملک چلے گئے تو اس وقت جہاد کے احکام دیے گئے، ان دونوں مثالوں میں پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہیں گے، یہ فقہاء کی اصطلاح ہے، لیکن اگر پہلے والے حالات دوبارہ پیش آئیں تو وہ حکم بھی دوبارہ نافذ ہو جائے گا، جسے فقہاء نے منسوخ کہا ہے، اور ناسخ پر عمل درآمد نہ ہوگا۔

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحات ہیں، جو علماء نے مقرر کی ہیں، محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ناسخ ومنسوخ کے الفاظ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت استعمال نہیں کیے گئے، عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

کچھ لوگوں کو سنا کہ قرآن مجید میں جھگڑا کرتے ہیں، تو فرمایا: کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ لڑایا، (رد کیا) خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو، پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو، اس میں سے جو جانو وہ کہو، اور جو نا جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔

(مسند احمد ابن ماجہ) (خطبات احمدیہ ص۴۲۔۴۳۲)

سر ولیم میور نے یہ جو لکھا ہے کہ ''قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں'' یہ محض بے سند خیال ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ نزول قرآن کے دور اوّل میں کچھ لوگوں نے اپنی غلطی سے قرآن وحدیث میں تمیز نہ کی ہو، بہت سی حدیثوں کو غلطی سے قرآن کا جزء سمجھ لیا ہو، اور قرآن مجید میں وہ حصے نہ پا کر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہوگئی ہیں، اور قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں، مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا، خود اس کی غلطی ہے۔ (ایضاً ص ۴۴۷)

سر ولیم میور نے آیتوں کے منسوخ ہونے کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے وہ قواعد اسلام کی رو سے درست نہیں ہے، اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے، مثلاً ان کا بیان ہے کہ اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مقصد کے لیے تھا جو عارضی حالات کی وجہ سے سامنے آیا، اور جن کی عظمت بہت جلد جاتی رہی، یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر صاحب کے نزدیک اس قسم کی آیتوں سے ان کی عام عظمت یا ان کو رائج کرنا مقصود تھا یا نہیں، قرینے سے تو یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان حصوں کی حفاظت کی انھوں نے کوشش کی ہو۔

سر ولیم کسی دلیل یا شہادت کے بغیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ حصے ایسے بھی شامل ہوگئے ہیں جن کی حیثیت عارضی تھی یعنی وہ منسوخ ہو چکے ہیں، لیکن بقول سر سیّد احمد خاں ''یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط معنی سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے، اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جائیں جس میں مسلمان فقہاء نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب بھی کوئی آیت (عارضی مدت یا) محدود مقصد کے لیے

قرآن مجید میں موجود نہ تھی، اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔" (خطبات احمدیہ ص ۴۶۹)

## قرآن مجید اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

مسٹر گاڈفری ہیگنز عموماً قرآن، اسلام اور سیرت رسول ﷺ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، مگر وہ اپنے اچھے خیالات کے باوجود ایک جگہ قرآن کے بلند اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ "یہ امر اس کے (یعنی قرآن مجید کے) مصنف کی لازوال نیک نامی کا سبب ہے، خواہ وہ محمد ﷺ عرب کے نامی پیغمبر ہوں، یا اس کے تیسرے خلیفہ عثمان" (خطبات احمدیہ: ص ۴۶۳) یہ ایک ایسی رائے ہے جو قرآن کے بارے میں دانستہ طور پر غلط بیانی کہی جا سکتی ہے، اور غلط فہمی پھیلانے کے لیے لکھی گئی ہے، قرآن کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے، اور تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس تلاوت کے لیے جو قرآن تھا وہ وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ پر خدا کی طرف سے اتارا گیا، اور جسے تمام صحابہ رسول کے اتفاق سے اور ان کی نگرانی میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق اسی ترتیب کے مطابق جو مسلمانوں میں پہلے سے معروف تھے، اور جس کو قرآن کے حافظ اپنے سینوں میں اسی کے مطابق پاتے تھے، ایک جلد میں اکٹھا کیا گیا تھا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی کی نقلیں دنیائے اسلام میں بھجوادی تھیں، اس لیے مسٹر گاڈفری ہیگنز کا یہ الزام غلط بیانی کی ایک بُری اور افسوس ناک مثال ہے، پیغمبر ﷺ صاحب قرآن کے مصنف نہ تھے، مسیحی علماء قرآن کی الہامی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، مگر ان میں جو اہل انصاف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو تورات وانجیل کا ہے اور قرآن کی زبان اور رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی زبانوں میں جو فرق ہے، قرآن کا جو دعویٰ ہے محمد ﷺ کا چالیس برس تک اس کے علوم ومعارف سے ناواقف رہنا، آپ ﷺ کا امی ہونا، قرآن کی فصاحت، اس کا اسلوب بیان اور محمد ﷺ سے قرآن کا انداز تخاطب، یہ تمام باتیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرآن اپنے لفظ ومعنی دونوں میں خدا کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ہے، مگر تعصب اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۱-۲۴ وغیرہ)

## قرآن کی فصاحت اور صحیفہ ایوب گبن کا اعتراض

گبن نے اپنی تاریخ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ "قرآن کے بلند ترین خیالات صحیفہ ایوب کی شان دار سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں۔" لیکن سر سیّد احمد خاں کے بقول گبن میں اس قدر علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیفہ ایوب کا باہمی فرق بتا سکیں:

> "ہم کسی اعتراض کا اندیشہ کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت میں بے مثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے فائق نہیں، نہ پہلے اور نہ اس کے بعد، لبید جیسا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور اس کی بلاغت کو انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا، اور آنحضرت ﷺ کی رسالت کو قبول کر لیا، مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ سب سے اوّل اور سب سے آخر جو بھی خوبیاں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں، وہ ہر قسم کے اچھے اوصاف کا بانی ہے، بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف اور خوبی کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۴۶۲)

سر سیّد نے مسٹر سیل کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ "یہ بات مسلم ہے کہ قرآن، قریش کی زبان میں جو اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے، نہایت لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے، وہ بے شبہہ عربی زبان کا نمونہ ہے، اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا، وہ لازوال معجزہ ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنے بارے میں رب کی طرف سے ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے، اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان لائق لوگوں نے تعریف کی جن کا اس کام میں مبصر ہونا تسلیم کیا جاتا ہے، جس کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ لبید بن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد ﷺ کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں تھا، خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (جو عربوں میں کسی اعلیٰ تصنیفی کارنامہ کے لیے ایک بڑی عزت کی بات تھی) کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیف کو پیش کرنے کی جرأت

نہ ہوتی تھی، لیکن کچھ دنوں کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی چند آیتیں کسی نے اس کے مقابلہ میں لگا دیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکوں میں تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور فوراً مذہب اسلام کو قبول کرلیا، اور اس نے یہ بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۵۔۴۶۴)

## قرآن مجید کے ساتھ ناشائستہ طرز عمل

یورپ کی زبانوں میں عیسائیوں نے قرآن مجید کے جو ترجمے کیے گاڈفری ہیگنز کا تبصرہ ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ: ''اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح شائع ہوتا کہ ہر لفظ کو متین اور شائستہ معنی کے بجائے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت کا مضمون، جوڑ توڑ ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف کے سر معیوب معنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور کیا جاسکتا ہے جس کے ساتھ یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی۔'' (ایضاً: ص ۴۶۶)

مگر اسی کے ساتھ سرسیّد احمد خاں چند عیسائی مصنفوں خصوصاً مسٹر سیل کے ممنون ہیں جنھوں نے بڑی کوشش سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور اگرچہ وہ کہیں کہیں صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم ان کی کوشش قابل قدر ہے۔

## بے سروپا حکایات

ان عیسائی عالموں اور مستشرقوں نے عجیب عجیب خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں، قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں، چنانچہ ہمفری پریڈو ڈین آف ناروچ نے لکھا ہے کہ:

> ''محمد ﷺ لوگوں کو سکھاتے تھے کہ اس کتاب کا اصلی نسخہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے، اور جبریل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں حسب موقع شائع کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، لایا کرتے ہیں۔''

لیکن بقول سرسیّد ''یہ بیان ایک ایسا بے ہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے، جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گزرتا ہے تو وہ حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کہاں

سے اور کیوں کر لکھا گیا۔'' مشہور مؤرخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے، جو لکھتے ہیں کہ'' وجودِ قرآن بقول آنحضرت (ﷺ) یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذاتِ الٰہی میں موجود ہے، اور نور کے قلم سے لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا ہے، اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پر لائے تھے۔'' لیکن سر سید مرحوم کے خیال میں، 'لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق، ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا۔'' ڈین پریڈو کی دلچسپ اور انوکھی باتیں جو بقول سر سیّد کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں، وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہیں، ان کا بیان ہے کہ'' محمد (ﷺ) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوق رسالت تھا، اور ابوبکرؓ نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اوّل اس کو جمع کیا، کیونکہ جب مسیلمہ نے ان ہی کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی اُمید میں، اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے پیروؤں میں شائع کی، اس وقت ابوبکرؓ نے محمد (ﷺ) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا۔'' مگر جیسا کہ سر سیّد نے تحریر کیا ہے کہ:

> ''مذکورہ بالا چند مثالیں ان سیکڑوں بے ہودہ باتوں میں سے ہیں جو عیسائی مصنفوں کی تمام تحریروں میں اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں۔ سر ولیم میور نے اپنے استدلالوں میں مسلمانوں کی مذہبی باتوں سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے، لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھوں نے بحث کے لیے صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف، سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ نا قابل اعتبار خیال کرتے ہیں، یا ان کے مطلب اور مقصد کے بارے میں مختلف الرائے ہیں...... سر ولیم اپنی کتاب کے حاشیہ میں مارکسی اور ویلس سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ'' عبداللہ بن مسعودؓ نے محمد (ﷺ) کی زبانی

ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اسے کاغذ پر سے اُڑا ہوا پایا جس کے بارے میں پیغمبرؐ صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اُڑ گئی، اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزاتی مضمون اور بڑھا دیا گیا کہ اس آیت کا اُڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا۔" ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا نام بھی معلوم نہیں گرد شیمی کے کبوتر کی طرح بے بنیاد اور صریح ایجاد ہے، اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ "اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور وہ بے شبہ ایک بناوٹ ہے۔" (خطباتِ احمدیہ، ص: ۲۶۸-۷۰)

## سر ولیم کی "وحی کامل"

سر ولیم نے ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" کی مسلمانوں کے مذہب میں استعمال کی ہے، اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "وحی کامل" سے میری مراد اس وحی سے ہے جو محمد (ﷺ) کے اخیر زمانہ میں موجود اور رواج پائی ہوئی تھی، جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو، لیکن سر سیّد فرماتے ہیں کہ:

"اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، شاید آیاتِ محکم کا ترجمہ سر ولیم میور نے وحی کامل کیا ہو لیکن آیاتِ محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے کیے ہیں، لیکن اگر ہم ان کی اس اصطلاح کو تسلیم کر لیں، تو وحی کامل کا لفظ وحی کی اس کامل مقدار پر بولا جائے گا جو جنابِ پیغمبر خدا ﷺ پر نازل ہوئی تھی، اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضایع یا غارت، یا غیر مستعمل نہیں ہوئی۔" (خطباتِ احمدیہ، ص: ۲۷)

## قرآنی آیتوں میں ربط اور ترتیب

قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ "قرآن جس طرح ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے، اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے، اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (ﷺ) نے اس کو ہمیشہ اسی تسلسل

کے ساتھ پڑھنے کے لیے فرمایا ہو، مضامین کی ابتر ملاوٹ، زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی، کسی جزء کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس آیت سے پہلے درج ہونا جو اس سے کافی عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہو چکی ہو، کسی حکم کا ایسے حکم کے بعد ہونا جس کی اس پہلے حکم سے تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو یا کسی دلیل کا کسی ایسے درمیانی فقرہ کی وجہ سے منقطع ہو جانا جو اپنے مقصد اور مدعا میں اس سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی اور کامل ترتیب خود محمد (ﷺ) کی حیات میں مستعمل اور رائج تھی۔''

سرسیّد مرحوم نے سر ولیم میور کے کلام میں بے ربطی کے باوجود آیاتِ قرآنی کی ترتیب اور ان کے درمیان باہمی ربط پر درج ذیل لفظوں میں اظہارِ خیال کیا ہے:

''ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید ہے، ایسی باقاعدہ ہے اور معنوی اعتبار سے اپنی طرزِ خاص میں اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے، بہت سی کتابیں آیتوں کے درمیان اس معنوی رشتہ، تعلق کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے درمیان موجود ہے۔ قرآن مجید کی عبارت میں ایسا ایجاز اور اختصار ہے کہ وہ آیتوں کے باہمی تعلق کی جن کے معنی بظاہر ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں، کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں، گونجنے والی اور سامعہ خراش، ابتر، خام، بے سری، مکروہ بیانی، طول کلامی، بجھانے والی، خام اور مہمل'' جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے، وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہٖ وہی الفاظ لکھ لیے گئے ہیں، کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے اُمور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے، مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا، عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ آیتوں کی شانِ نزول ان کے ذہن میں

ہوتی ہے، اس لیے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے گو مسلمانوں کو ایسی دشواری نہیں ہوتی۔'' (خطباتِ احمدیہ، ص: ۴۷۱)

اس موقع پر سرسیّد افسوس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ''سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں، اگر وہ چند مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جا بجا بے ربطی ہو تو اس وقت ہم یقیناً موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیتوں کے درمیان باہمی علاقہ کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ (ایضاً، ص: ۴۷۲)

## تدوین قرآن

ترتیب قرآن تو رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے مطابق پہلے سے معلوم اور مشہور تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو لوگ حافظ قرآن تھے ان کے سینوں میں قرآن مجید اسی ترتیب سے محفوظ تھا جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی تھی، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع و اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نسخہ تیار کر لیا گیا، جس کی مختلف نقلیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام عالم اسلام میں تقسیم کروا دیں، سر ولیم میور نے قرآن مجید کی ترتیب، اس کی تدوین اور پھر اس کی نقلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کارروائیوں کو اپنی چابک دستی سے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جن سے ان کے اغراض و مقاصد بے نقاب ہو جاتے ہیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

''اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی، حفصہ کے گھر میں دستیاب ہوئی اور غور و فکر کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی، اگر زید اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی، اس وجہ سے کہ وہ محاورۂ قریش سے واقف تھے، اور اس نئے مجموعہ کو اس طرح کی زبان سے تطبیق دی جس میں کہ پیغمبر صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔'' (سر ولیم میور، خطباتِ احمدیہ، ص: ۴۷۳)

سرسیّد احمد خاں نے مذکورۂ بالا اعتراض کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماخذ دریافت کرنے میں ہم نہایت حیرت زدہ ہیں، مسلمانوں

کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے۔ سر ولیم میور کے اعتراض میں تین جملے واضح طور پر قابل اعتراض ہیں، "نظر ثانی"؛ "اس طرح سے تطبیق دی"، "اور" نیا مجموعہ"۔ کسی بھی قسم کی روایت سے ہم کو اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید میں کبھی نظر ثانی ہوئی ہو، جس حدیث میں اس کا تذکرہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: فنسخوها فی المصاحف یعنی اس کی چند نقلیں انھوں نے کرلیں، مگر اس روایت میں کسی مخصوص نظر ثانی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، اس روایت میں یہ عبارت بھی ہے کہ اذا اختلفتم انتم و زید بن ثابت فی شیء من القران یعنی جب تم میں اور زید بن ثابت میں قرآن مجید کی کسی چیز میں اختلاف ہو جائے، یہاں لفظ اختلاف سے، کئی مفہوم پیدا ہو سکتے تھے، لیکن روایت کے آئندہ لفظوں نے اس کی تعیین کر دی ہے، چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ فاکتبوه بلسان قریش یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو۔ اس لیے روایت میں لفظ اختلاف سے اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ مراد نہ تھی، بخاری کی روایت میں اس مراد کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ فی عربیة من عربیة القرآن یعنی قران کے کسی لفظ کی عربی ہیئت میں اختلاف ہو، اور جو تلفظ مد، ادغام اور نون تنوین سے متعلق باتیں ہیں جو عرب کے مختلف قبیلوں میں رائج ہیں، سر ولیم میور کا یہ جملہ کہ "اور اس طرح سے مکی زبان سے تطبیق کر دی" یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جامعین قرآن میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے پچھلی تحریر میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، حالانکہ حدیث سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، جامعین سے اگرچہ یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم میں کچھ اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو، لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان میں دراصل کوئی اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ "انھوں نے مکی زبان سے تطبیق کر دی" صحیح نہیں ہے۔

سر ولیم میور کی طرف سے "نیا مجموعہ" کا لفظ بھی محض غلط ہے، جس پر وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے عربی کے ساتھ مختلف لہجوں میں نازل ہوا تھا، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس قسم کے خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں، تاکہ ایک ہی آیت

قرآنی میں لفظوں میں اختلاف کی دقت رفع ہو جائے، بقول سرسیّد:

''یہ (مذکورہ بالا) عبارت ایک ایسی طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، صاف باطنی اور راست بازی کے لیے ممتاز ہوں۔ دغا، فریب اور ریا کاری کا الزام لگانا صحیح دلیل و برہان کے معینہ قوانین اور اخلاق و تہذیب کے تسلیم شدہ اُصول کے خلاف ہے، ہم اس بات کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاک باز اور تقویٰ شعار ہیں وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں، مگر وہ ایسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ، پھر کیا سرولیم میور اس بات سے بھی ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مَد یا بغیر مَد کے، ادغام یا بغیر ادغام کے اور تنوین نون کے ساتھ یا بغیر نون کے پڑھنے سے جو عرب کے مختلف قبیلوں میں مختلف طریقے سے رائج تھے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے، لیکن لفظ یا معنی میں کچھ فرق نہیں ہوتا، یا کوئی لفظ اپنے اصلی مادہ میں تبدیلی کے بغیر مختلف صورتوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ فاتحہ میں مَـــالِكِ کا لفظ ہے، جو قدیم طرزِ تحریر میں مــلك لکھا جاتا تھا، اور اسے مَـلِكَ، مَلَّاكِ، مَالِكَ بھی پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ عرب میں مختلف قبیلوں میں اس لفظ کے تلفظ میں فرق تھا، اور اس کے باوجود اس لفظ کے مادہ یا معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، لیکن قریش کی زبان میں مَـــالِكِ کا تلفظ جاری تھا، اس کا قرآن مجید میں قائم رکھنا کیوں کر اعتراض کا مستحق ہو گیا۔

سرولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں دراصل ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنی تھی جن کے لیے انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ ''دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو، اور ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ

ایسی ہی رہے گی، اس بات کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے، خدا فرماتا ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (ہم نے قرآن مجید کو اُتارا ہے، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے"

(خطباتِ احمدیہ، ص: ۴۷۶)

سر ولیم میور نے عہد عثمانی میں قرآن مجید کی نقلیں کیے جانے کے واقعہ کی یہ عجیب توجیہ کی ہے کہ "اگر ابوبکرؓ کے قرآن کے متن خالص ہوتا تو اس قدر جلد وہ کیوں کر خراب ہو جاتا کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہو گیا۔" لیکن سر سیّد کہتے ہیں کہ:

"ہم نہایت صاف طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ ہی اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت پڑی، اور نہ ہی اس میں نظر ثانی کی گئی تھی، بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں۔" (خطباتِ احمدیہ، ص: ۴۷۶)

## تبدیلی آیات

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کے واسطے کہ خود پیغمبرؐ صاحب ہی نے بعض آیات کو جو یک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں، بعد کو تبدیلی یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے۔" وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دو مثالیں بھی پیش کرتے ہیں جو واقدی کی بیان کردہ ہیں، خود سر ولیم میور کے بیان کے مطابق "ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی ابن کعبؓ کی تعریف کی، اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے، ابی کی قراءت میں شامل بعض آیتوں کو ہم چھوڑ دیا کرتے ہیں کیونکہ ابی کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ صاحب کو یوں فرماتے سنا ہے، اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبرؐ صاحب نے قران مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں، مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے دو حصے ابی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے، جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں" سر سیّد نے اس روایت پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"جو کچھ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، اس اصل حدیث کے مضمون سے: جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے سراسر خلاف ہے، اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو ابی کے

پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں'' اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے اصل حدیث (بخاری کتاب التفسیر عن ابن عباس) یہ ہے (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابیؓ بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں، اور ہم لوگ اُبی کا قول چھوڑ دیتے ہیں، بات یہ ہے کہ اُبی کہتے ہیں کہ کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا.﴾

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ آیاتِ قرآنی کو جن کو اُبی پڑھا کرتے تھے، چھوڑ دیا کرتے تھے، یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات مستنبط کرنے سے متعلق ہے، اُبی قرآن مجید کی ہر آیت سے حکم کا استخراج کرتے تھے اور جملہ احکام کو صحیح خیال کرتے تھے، ان کی رائے میں ظاہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضروری نہیں جیسا کہ اہل ظواہر کا مسلک ہے، لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی رائے اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اُبی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ہیں، اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام وقوانین مستنبط کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُبی کے قول کو یعنی جو حکم انھوں نے قرآن سے نکالا ہے چھوڑ دیتے ہیں، اور حضرت علیؓ سے اتفاق کرتے ہیں، ہماری اس تشریح کی تصدیق دوسری باتوں کے علاوہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بخاری نے جو مسلمانوں میں نہایت نامور، مقدس، اور مستند محدثین میں سے ہیں، اس حدیث کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ احکام ناسخ ومنسوخ سے بحث کی گئی ہے، نہ کہ اس جگہ جہاں کہ انھوں نے مختلف قراءتوں کو بیان کیا ہے، بخاریؒ نے ہی حدیث کی کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں قاریوں کے باہمی اختلاف کی بحث (باب القراء) میں بھی بیان کیا ہے، اور اس میں قراءت کے بجائے ''لحن'' کا لفظ ہے،

جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے لحن کو (یعنی قراءت کے طریقہ کو) اُبی کے لحن پر ترجیح دی، بہر حال سر ولیم میور نے یہ معنی جو نکالے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ''ہم بعض آیتوں کو جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں'' یہ محض زبردستی کی ایک بات ہے، (یہ روایت کے الفاظ میں اس معنی کی کوئی گنجائش نہیں)'' (خطبات احمدیہ، ص: ۸۔۴۷۷)

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت یہ نقل کرتے ہیں کہ ''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا پڑھنا پسند ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبرئیل علیہ السلام سے پڑھوایا کرتے تھے، اور اپنی وفات کے سال اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا، اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما دونوں مرتبہ حاضر تھے، اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوئی تھی اس کا مشاہدہ کیا تھا'' مگر جیسا کہ سر سید احمد خاں نے صراحت کی ہے کہ ''اس روایت کے آخری ٹکڑے کی کوئی معتبر سند نہیں ہے، اور نہ ہی ہم اس کو کسی مستند اور معتبر حدیث میں پاتے ہیں، اور اگر وہ واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا، تب بھی وہ اعتبار کے لائق نہیں ہے، کیونکہ تمام نا معتبر اور بے سند روایتیں تسلیم کر لیں تو بھی سر ولیم میور کا یہ قیاس کہ ''قرآن مجید میں شاید'' بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں، مگر بعد میں منسوخ ہوگئی ہوں، یا بدل دی گئی ہوں۔'' (ایک ایسا قیاس جو ''شاید'' کے سہارے قائم رہے) کیونکہ ثابت ہوسکتا ہے، باقی رہی یہ آیت کہ ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا﴾ اس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ اس میں شریعت یہود کے منسوخ کیے جانے کا ذکر ہے، آیات قرآنی کے نسخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (خطبات احمدیہ: ص ۴۸۱)

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیوں میں قرآن مجید سے بعض آیتوں کا اخراج یا بعض آیتوں کا اندراج نہ کیے جانے کے بارے میں وہ اور روایتوں سے بھی استدلال کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ: ''بئر معونہ پر ستر مسلمان شہید ہوئے تو محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کے پیغام کے پہنچنے کا دعویٰ کیا جس کو راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح

نقل کیا ہے کہ "بلغو اقومنا عنا انا لقينا ربنا فرضي ورضينا عنه" (واقدی) تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا اخراج کردی گئی"، لیکن سرسید کے نزدیک:

"اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے، مزید براں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ "تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کردی گئی" محض بے بنیاد ہے، اور کسی مستند اور معتبر روایت میں پایا نہیں جاتا، اور اگر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کرلیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھ لیا تھا، اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔" (ص ۳۸۲)

دوسری روایت جو سر ولیم میور نے نقل کی ہے، احکام زنا سے متعلق ہے، اور اس میں اہل مدینہ سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "...... واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی بات قرآن میں درج کردی تو میں قرآن میں یہ آیت درج کر دیتا کیونکہ میں نے اس آیت کو پڑھا ہے کہ: "والشيخ والشيخة اذا زينا فارجموهما البتة" (واقدی) مذکورۂ بالا روایت پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید نے یہ رائے دی ہے کہ: اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے غلط بیانی اور غلط نمائی ہے، اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ "والشيخ والشيخة اذا زينا فارجموهما البتة" اصل حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے کہ کبھی مسلمانوں نے اس کو قرآنی آیت سمجھا ہو، دوسرے اس فقرے کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ عرب تو کجا، کوئی عجمی ادنیٰ درجہ کا عربی دان بھی اس کو نہ لکھے گا چہ جائے کہ وہ خدا کا کلام ہو......

ہاں البتہ مسلم شریف (باب حد الزنا) میں اس قدر ضرور ہے کہ "فكان مما انزل الله عليه اية الرجم" یعنی ان چیزوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاریں رجم کا حکم تھا، اس حدیث کے ترجمہ میں آیت کے لفظ کا ترجمہ "حکم" کرنا چاہیے اس بارے میں ہم بہت سی مثالیں پیش کرسکتے ہیں کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں "حکم" کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔

سورہ نساء کی آیت ۱۹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''ان کو اپنے مکانوں سے باہر نہ جانے دو یہاں تک کہ موت ان کو ٹھکانے لگائے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے'' اس آیت کے اخیر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے جو مسلم کی حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ شادی شدہ کو بجرم زنا ۱۰۰ درے لگانا چاہیے، اور سنگسار کر دینا چاہیے، اور غیر شادی شدہ کو سو درے لگانا اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دینا چاہیے، کچھ عجب نہیں کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھ لیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے حدیث مسلم کے مطابق سنگسار کرنے کی تھی، اور اس لیے جب وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا، اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو، مگر واقدی کا روایت کا وہ ٹکڑا محض بے اصل ہے، اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام محققین مسلمان (ایسی روایتوں کو) مہمل تصور کرتے ہیں اور اسلام ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۹۰-۴۸۲)

اسی بحث کے سلسلہ میں سر ولیم میور تیسری روایت وہ بیان کرتے ہیں، جو سونے کی گھاٹی کے بارے میں تھی، اور جو قران میں درج ہونے سے رہ گئی، چوتھی مثال کے طور پر سر ولیم میور نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے اس قصے کو پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں نے اپنے اوراق میں سے ایک آیت کو غائب پایا، پانچویں مثال میں وہ اس آیت کا ذکر کرتے ہیں جو مکہ کے معبودان مجاز کے بارے میں تھی، لیکن ان مثالوں پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ بقول سر سید احمد خاں ''ہم (سر ولیم میور کے) نہایت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے یہ بات کہہ کر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں، اس جھگڑے کو چکا دیا ہے، پس ہم کو مردے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔ (خطبات احمدیہ: ص ۲-۴۹۱)''

## خانہ کعبہ کی تاریخی حیثیت

سر ولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے خانہ کعبہ کی قدیم تاریخی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ بات تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے، قرآن مجید میں اگرچہ تعمیر کعبہ کے زمانہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس میں کعبہ کی دو صفتوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا

ہے، ''بیت العتیق'' (نہایت پرانا اور قدیم گھر) اور ﴿اَوَّلُ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے خدا کی عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے) سرسید احمد خاں کے نزدیک قرآن مجید کے مذکورۂ بالا بیان کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے، ان کے بقول:

''اس کے ثبوت کے لیے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں اور جن کو ان لوگوں نے لکھا ہے جن کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا، ہم ایسے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں، یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہیں......

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، دوسرا بیٹا قیدار جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا، رورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبیؑ کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے، جس میں مکہ ومدینہ بھی شامل ہیں، اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے، یہ بات بھی بخوبی ثابت ہے کہ یورنیس، بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں، گیڈری، گذرونا اور کدریتی سے قیداری اور قیدری مراد ہے، چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول ص ۲۴۸ میں کیا گیا ہے، پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھے، رورنڈ گاٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶۔۲۷ درجہ عرض شمالی، ۳۷۔۳۸ درجہ طول مشرق کے درمیان لگایا ہے۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۴۹۷)

گبن نے کعبہ کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''کعبہ کی قدامت صحیح طور پر سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے، ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تھیمویت اور سبئین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام اہل عرب تسلیم کرتے تھے، اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور ومعروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام عرب تسلیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔'' (خطبات ص ۵۰۶) لیکن سرولیم میور نے اس

بات کو تسلیم نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں کہ:

''جو کچھ ڈایوڈ ورس نے لکھا ہے، اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے ہے کیوں کر قیاس ہو سکتا ہے۔''

مگر سرسید احمد خاں اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ:

''ہم سمجھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلا شبہ یہاں غلطی کی ہے، جو کچھ ڈایوڈ ورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے، اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پہلے اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ اور وہ تمام مراسم جو کعبہ سے متعلق ہیں، ان کا ابراہیم علیہ السلام سے تعلق ہے، اس کی اصلیت و صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنو جرہم نے اور تمام عرب کی مختلف قوموں نے اس کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے منسوب کیا تھا، عرب ایک بت پرست قوم تھی، اور ابراہیم علیہ السلام بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا، اس لیے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے نفرت کرتیں، اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے منسوب نہ کرتیں، باوجود اس مغایرت اور منافرت کے تمام عربوں کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام سے تعلق ہے، یہ بات واضح طور پر اور علانیہ اس کی صحت اور اصلیت کی دلیل ہے، نہ کہ اس کے برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے، اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لیے دلیل ہے نہ کہ ہمارے مخالف کے لیے۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۵۰۷)

## اہل عرب کے مورث اعلیٰ

سر ولیم میور کے اعتراضات کی اصل حیثیت سرسید کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''لائف آف محمد'' میں کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا، انکار کیا ہے، اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو ان کے دل میں آئی، حقیقت

واقعہ قرار دیا ہے۔'' مثلاً انھوں نے یہ بات فرض کرلی ہے کہ مکہ کے قریب اسماعیل علیہ السلام کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے، سب بناوٹ اور قصہ اور ہر قسم کی تاریخی سچائی سے خالی ہے۔'' مگر بقول سرسید مرحوم:

''اس بات کے کہنے سے پہلے سرولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بیان کرتے کہ اہل بیان کو اگر وہ نسل، مذہب اور اپنی رسموں میں یقطان اور اسماعیل علیہ السلام سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کا کیا ضرورت پیش آئی تھی اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور باہم سخت عداوت رکھتے تھے، اور روز خانہ جنگی اور باہم لڑائیاں کرتے تھے، اس ایک بات پر متفق ہوگئے تھے، عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا، ان تمام باتوں کی کسی طرح سرولیم میور تردید کرتے ہیں، کیونکہ ایسے موقع پر ثبوت کے مقابلہ میں صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے، یونان کے مورخ اور جغرافیہ کے ماہرین، حجاز میں اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں، یونانی مورخوں نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں، ان سب واقعی باتوں کو سرولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں؟''

(خطبات احمدیہ: ص ۵۰۹)

## عربوں کی مذہبی رسموں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق

سرسید کے الفاظ میں سرولیم میور از راہ خود پسندی یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''اس عقیدہ باطل (یعنی حضرت ابراہیم سے نسبی رشتہ کے خیال) کے کسی اجزاء (رسموں) میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہو، حجر اسود کا بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منیٰ میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یا ان کے خیالات اور اصول سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے، جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے

پہنچیں، یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مقامی نوعیت کی تھیں، یا ان کا بت پرستی کے اس سرچشمہ سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھیں، تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرہم یا بنی قطورہ، یا ازدایت یا کوئی اور قوم یمن سے منتقل ہو کر مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی۔''

مگر سر ولیم میور کے یہ خیالات دلیل اور ثبوت کے بغیر سچائی سے انحراف کی ایک افسوس ناک مثال ہیں، جس پر سرسید نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیم علیہ السلام یا بنی اسرائیل علیہ السلام کی تمام رسمیات سے جو ان کے ہاں جاری تھیں، یک لخت چشم پوشی کر لی ہے، ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔''

سر ولیم میور کی ذکر کردہ رسمیات جن کو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں گم پاتے ہیں، وہ سرسید کی بائبل سے نقل کردہ شہادتوں کی بنا پر اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے خانوادہ میں موجود تھی، جن کی عربوں نے ایک قیمتی وراثت سمجھ کر حفاظت کی، چنانچہ جیسا کہ سرسید مرحوم نے تحریر فرمایا ہے ''حجر اسود ہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام بناتے تھے، (پیدائش باب ۱۲، آیت ۷۔۸ اور باب ۱۳، آیت ۱۸، باب ۲۶ آیت ۲۵ باب ۲۸ آیت ۱۹۔۱۰، ۲۲ کتاب خروج باب ۲۰، آیت ۲۵، باب ۲۴ آیت ۴) حجر اسود کو بوسہ دینے کا اس جگہ سر ولیم میور نے جو ذکر کیا ہے، اس سے ایک عام مقصد بیان کرنا معلوم ہوتا ہے، یعنی پتھر کی تعظیم، مگر انھوں نے پتھروں کی اس تعظیم کو فراموش کر دیا جو ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام کرتے تھے، یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے، خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب علیہ السلام نے اس پر تیل ڈالا، (دیکھو بائبل کی کتاب پیدائش باب ۲۸، آیت ۱۹) یہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انتہائی تعظیم تھی، یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی، (پیدائش باب ۲۸، آیت ۲۲) خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تا کہ تمھاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے (خروج باب ۲۰، آیت ۲۶) اب کون سا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے جو

اس قسم کے پتھروں کی نسبت اولاد ابراہیم علیہ السلام میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ ہو بھی) اولاد ابراہیم علیہ السلام کی رسم جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔

ایک گھر خدا کے لیے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسا کہ کعبہ ہے، اگر ابراہیم علیہ السلام کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ علیہ السلام) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا، (خروج باب ۲۰ آیت ۲۴، کتاب اول تاریخ الایام باب ۳۱ آیت ۲۹) اور وہ کون تھا (یعنی داؤد علیہ السلام) جنھوں نے خرمن گاہ اور ارنان بیوسی کو خدا کا گھر بنانے کے لیے مول لیا اور پتھر، لکڑی، لوہا اور پیتل اس کے بنانے کے لیے جمع کیا، کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۲) اور وہ کون تھا (یعنی سلیمان علیہ السلام) جس نے بعد کو خرمن گاہ ارنان بیوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا (کتاب دوم، تاریخ ایام، باب ۴) ان شواہد کی روشنی میں کعبہ کی تعمیر اور اس کا گھر قرار دینے کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب نہ کرنا، بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے، سر ولیم میور کے لیے اس رسم کے بارے میں ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا جب کہ وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے پہلے یہ ثابت کر لیتے کہ ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام نے جو مذبح یا بیت اللہ بنایا تھا ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے، کیونکہ توریت سے موسیٰ علیہ السلام سے پیشتر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لیے ان گھروں کا بنانا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا یہی طریقہ تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے، ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ حج خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا، (اس کے ارد گرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے مقصود خدا کی ذات ہوتی ہے، نہ کہ کعبہ کی عمارت) پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ (کی عمارت) کا حج ہوتا ہے۔

عرفات کی رسم کا بھی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے تعلق رہا ہے، ہزاروں جگہ تورات میں

آیا ہے کہ خدا ابراہیم علیہ السلام کو مرئی ہوا، (یعنی ان کو دیدار الٰہی ہوا) خدا اسحٰق علیہ السلام کو مرئی ہوا، خدا موسیٰ علیہ السلام کو مرئی ہوا، پس ٹھیک ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں، جس پہاڑ پر ( مکہ کے قریب ) خدا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو مرئی ہوا، اس سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ ایک چیز نہیں ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، یہ خاص امر ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں ملتا ہے، یہاں ہم اس بات، پر کہ خدا کیوں کر دکھائی دے سکتا ہے؟ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور ان الفاظ کے مطلب و مراد سے یہاں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات (عرفان الٰہی یا دیدار خداوندی) کا استعمال بجز، خاندان ابرہیمی کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا، اور اسی لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ابراہیم علیہ السلام سے ثابت ہوتا ہے، یہی جگہ ہے جہاں کی حاضری کو حج کہتے ہیں، پہاڑ تلے کا میدان ہے جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں، اور خدا کو یاد کرتے ہیں، اس کی تسبیح کرتے ہیں، اس قدوس کو قدوس قدوس کہہ کر یاد کرتے ہیں، اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے، اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ سینا کی کمیٹی میں سنائے تھے، پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں میں پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم علیہ السلام کے یہاں۔

منیٰ کا مقام بھی صرف قربانی کے لیے ہے، اس کے علاوہ وہاں کوئی دوسری رسم نہیں ہوتی، تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری ہوئی ہے، جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی، اور اسی قربانی کی وجہ سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا، منیٰ اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہیں، اور اسی لیے اسلام میں قربانی کہ درمیان یہ فرق ضرور ہے کہ ان کے یہاں قربانی غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے، تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں، سر ولیم میور اگر اسی وجہ سے منیٰ کی رسموں کو بت پرستی کی رسمیں تصور کرتے ہیں تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے، کیونکہ ہر ذی عقل قربانی کے مذکورۂ بالا طریقوں کے مقابلہ میں اسلام کی قربانی کے طریقے کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔

اسلام نے کسی ملک کو مقدس نہیں ٹھہرایا، البتہ اس مقدس جگہ کو خاص طور پر خدا کی پرستش کے

لیے مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی، مقدس ٹھہرایا گیا ہے، یہ بھی ابراہیم علیہ السلام ہی کا طریقہ تھا، اور ان کی اولاد میں رائج چلا آرہا تھا، جہاں انھوں نے خانہ خدا یا مذبح بنایا اس جگہ کو مقدس سمجھتے تھے" موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے سینا پہاڑ کے لیے حد ٹھہرا اور اس کو مقدس کر، (خروج باب ۱۹، آیت ۲۳) خدا کا یہ بھی حکم ہے۔

مقام مقدس مرا احترام نمائید (سفر لویان باب ۲۶، آیت ۲) اسی طرح بیت المقدس کو بھی مقدس قرار دیا گیا، اسی طرح اسلام میں بھی خانہ کعبہ کے لیے جب سے وہ بنا ایک حد مقرر کی گئی جو حرم کہلاتی ہے، اور اس کو اس مقدس نام کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی مقدس ٹھہرایا یہ بھی اس بات کا ایک نہایت واضح ثبوت ہے کہ بیت اللہ کو مقدس ٹھہرانا، خاص طور پر ابراہیم علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ بت پرستوں کی رسم سے۔ (خطبات احمدیہ: ص ۱۴۔ ۵۰۹)۔

سرسید، سرولیم میور کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کو مقدس قرار دینے کی رسم کا تعلق دور جاہلیت سے تھا، یہ حج کے مہینے تھے، اور انھوں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی، تاکہ لوگ بے خطرہ ہو کر مکہ آئیں اور حج کر سکیں مگر بقول سرسید:

> "سرولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی ان کو مقدس مانا ہے، حالانکہ مذہب اسلام نے ان کی تقدیس کو رد کر دیا ہے، اسلام نے یہ کہا ہے کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے گئے ہیں ان میں تم لڑائی کی ابتداء مت کرو، لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو، خدائے تعالیٰ سورہ توبہ میں فرماتا ہے ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ ..... كَآفَّةً﴾ کہ ان چار مہینوں کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ سال کے سب ہی ۱۲ مہینوں میں آپس میں مت لڑو، اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں، پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں، شہر حرم (۴ محترم مہینے) نہیں مانے جاتے، بلکہ بارہ مہینے ایک سے ہیں۔" (ایضاً ص ۵۱۵)

## صابی مذہب سے تعلق

سرولیم میور یہ بھی لکھتے ہیں کہ عرب کہ خاص طریقے سبیئین ازم (صابی مذہب) اور بت پرستی

اور پتھر کی پرستش تھی، اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا، لیکن اس اعتراض کے جواب میں سرسید یہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں رائج تھے، ان میں بہت کچھ رسمیں بت پرستی کی شامل تھیں، مثلاً صابئین کا مذہب، اس میں کفر و شرک اور کواکب کی پرستش داخل ہوگئی تھی، مگر جو خاص باتیں ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کی ان میں پائی جاتی تھیں ان کو بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب فرماتے ہیں، یہی ان کی غلطی ہے خانہ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسماعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں سبئین ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا، پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور عرب کا دستور بیان کرتے ہیں (حالانکہ وہ پرستش نہیں بلکہ تعظیم ہے، اور گزشتہ صفحات میں بائبل سے اس کی نظیریں بھی پیش کی جا چکی ہیں) خاص ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا، یہ طریقہ خاص ابراہیم علیہ السلام سے پیدا ہوا، اور یعقوب و اسحاق اور اسماعیل و موسیٰ علیہم السلام کا طریقہ تھا، یہ طریقہ خاص ابراہیم علیہ السلام سے پیدا ہوا، اور یعقوب و اسحاق اور اسماعیل و موسیٰ علیہم السلام نے اس کی پیروی کی، جو بن گھڑے اور ننگے پتھروں کو (موجودہ بائبل کی پیش کردہ شہادتوں کے مطابق) ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے، اور ان پر تیل چڑھاتے تھے، خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے، (جس کی ذمہ داری موجودہ بائبل پر ہے، اور اس کی روشنی میں جو کچھ چاہو ان کی نسبت کہو، مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا، بلکہ خاص عرب کے بت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔''

سرسید نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے مکہ کی تاریخ اور نسب نامہ نبوی ﷺ پر بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے، اور اس بارے میں سر ولیم میور کے طویل بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

''ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سرولیم میور نے مکہ کی ابتداء اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے، اور ہر ایک بات کو بے دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد...... اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں، مگر وہ باتیں واقعات ہیں، نہ عرب کی مقامی روایتیں اور نہ کتاب مقدس (بائبل) کی سچی باتیں، بلکہ صرف سرولیم میور کے عجیب وغریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں، اس وجہ سے ہم ان کو ذکر کرنا بے فائدہ سمجھتے ہیں۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۵۲۷)

## نسب نامہ نبوی ﷺ

نسب نامہ نبوی ﷺ پر سرسید احمد خاں کی تحقیق یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام (بن ابراہیم علیہ السلام) ۱۹۱۰ء قبل مسیح پیدا ہوئے، اور محمد ﷺ ۵۸۰ء بعد مسیح پیدا ہوئے، دونوں میں ۲۴۷۶ برس کا فاصلہ ہے، اور اسماعیل علیہ السلام سے آنحضرت ﷺ تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گزری ہیں جو علوم طبیعی کی تحقیقات کی روشنی میں ازروے حساب بالکل صحیح ہے یعنی ایک صدی میں تقریباً تین پشتیں، آنحضرت ﷺ کے ایک جد بعید عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان بیہقی نے بیس، ابن ہشام نے ایک نسخہ کے مطابق نو اور ایک اور نسخہ کے مطابق گیارہ پشتیں اور ابن الاعرابی نے نو پشتوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ اور عدنان کے درمیان سرولیم میور کے مطابق اٹھارہ پشتیں گزری ہیں، (دیکھئے، لائف آف محمد ج ۱، ص ۱۹۴) مگر سرسید نے اس بارے میں اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے کہ:

''سرولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے شبہ پڑا ہے، (مگر) عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں،...... عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا، مگر پہلے معد کا، نہ کہ دوسرے معد کا، جیسا کہ سرولیم میور نے تصور کیا ہے...... یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محمد ﷺ سے عدنان ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہے، جو عموماً تسلیم کیا گیا ہے، مگر عدنان سے آگے مورخوں میں اختلاف ہے، (جس کی بنیاد مذہبی نہیں، بلکہ تاریخی ہے)......

سرولیم میور کا یہ کہنا کہ ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۶۸۔۵۶۰)

مگر مورخوں نے عدنان سے اوپر شجرہ کی نسب کی جستجو میں اگر یہود کی تاریخی روایتوں کی طرف رجوع کر لیا تو اس میں مذہب اسلام کے لیے عیب کی کیا بات پیدا ہو گئی، سرسید فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے، خدا تعالیٰ کے اُس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیا کہ ''میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل علیہ السلام میں سے موسیٰ علیہ السلام کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا (تورات) کچھ اُس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسماعیل کی نسلیں محمد ﷺ سے لے کر اسماعیل علیہ السلام تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں، اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ (شجرہ نسب) ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں، یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی اور میانبی کی تحریروں سے، وہ تو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد ﷺ کی نسبت پورا ہوا، تمام عرب اور یہود اور عرب کے قریب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے، مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے، بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد ﷺ بنی ہاشم، قریش، اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ''اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْم'' (تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام ہیں) جس کو سب نے تسلیم کیا، اور کون ایسا شخص ہے جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔'' (خطبات احمدیہ: ص ۵۷۰)

## معراج جسمانی پر اعتراضات کا دفاع

سرسید احمد خاں اگرچہ معراج بصورت رویا کے قائل ہیں، جیسا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور

بعد کے علماء وہ اہل تحقیق میں سے ایک طبقہ کی رائے ہے، مگر وہ مستشرقین کی طرف سے معراج جسمانی پر کیے جانے والے اعتراضات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اب ہم بغرض اتمام حجت (معراج جسمانی کو) نہ واقعی تسلیم کرتے ہیں، اور یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے یہاں ایک خاص امر دینی ہے، اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا پر مذہب اسلام پر طعن کرتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر شور مچاتے ہیں جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں، کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے، کہ حضرت الیاس علیہ السلام آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھے بغیر ایک آتشیں گاڑی میں ایک آندھی کے ذریعہ اٹھائے گئے ہیں، اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے یعنی خود اپنے ہی دست راست کی طرف، کیونکہ وہ خود تھے، (متی باب ۲۸، آیت ۷، مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹) اس لیے ہم تمام عیسائیوں کو درج ذیل احکام کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ "تو اس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے، اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا، تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے جب کہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں سے شہتیر تو نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں ذرہ نکالنے کے لیے صاف نظر آنے لگے گا۔" (لوقا: باب ۶، آیت ۴۲۔۴۱)

ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر چلے جانے کے قصے کو نہایت شاعرانہ رنگین بیانی سے نظم کیا ہے، جس کا ترجمہ سرسید کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی، اور اس کے پیچھے دس ہزار چنگوں کی سریلی آوازیں تھی، جو زمزمہ ہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں، زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی، تمام افلاک و بروج سے صدائے باز

گشت آ رہی تھی، سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے، جب کہ یہ نورانی جلوس شادکامی کے طنطنہ کے ساتھ عالم بالا کو روانہ ہوا، انھوں نے یہ نغمہ گایا: اے لازوال دروازہ کھل جاؤ! اے آسمانوں اپنے دروازوں کو بند کرو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہنچا کر شان وشوکت کے ساتھ آتا ہے اندر لے لو، اور اب خدا تعالیٰ کی نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ فرمائے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولی والاجنحہ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔'' (خطبات احمدیہ: ص۳۷۔۱۷۶)

سرسید کی طرف سے اس جواب کی روشنی میں معراج جسمانی مذہبی نقطہ نظر سے اہل مذاہب کے لیے قابل فہم ہے اور واقعات معراج میں کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں وہ اپنے مذہبی اعتقاد وتصور کو برقرار رکھتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ وہ ناممکن ہے یا عالم واقعات میں ایسا نہیں ہوسکتا۔

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے متعلق کچھ روایتیں تو وہ ہیں جو قابل اعتماد نہیں اور نہ وہ مذہبی روایتیں سمجھی جاسکتی ہیں، آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی، اور مسلمانوں کو نمایاں فتوحات حاصل ہوتی گئیں، اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی، اور وہاں کے قدیم آتش کدے برباد ہوگئے، اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آ گیا، ان واقعات کو جو بعد میں پیش آئے، آنحضرت ﷺ کی ولادت کے دن سے منسوب کردیا گیا، ان کے علاوہ وہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے بارے میں اور بھی روایتیں سیر میں مذکور ہیں اگرچہ سرسید کے بقولاً ان کی صحت کے لیے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے، مگر ان کے غلط ہونے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے'' مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی، عبدالمطلب فوراً وہاں آئے اور آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کعبہ میں لے گئے، اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے طرز کے مطابق ہے اور اس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے، مگر جیسا

کہ سرسید نے لکھا ہے کہ:

''ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مسلمانوں کے طرز پر بھی کچھ تعجب نہیں، کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بزرگوں میں خدا پرستی بالکل ختم نہیں ہوگئی تھی، اس بات کا ایک بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت ﷺ کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے۔'' (خطبات ص ۲۱۸)

## حضرت حلیمہ کی تربیت اور قرآن کی زبان

شرفائے مکہ کا دستور تھا، کہ آب وہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے، اپنے بچوں کو جب وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کرکے باہر بھیج دیا کرتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا، وہ اپنے گھر لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لاکر آپ کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں، دو برس بعد آپ کا دودھ چھڑایا گیا، اور حضرت حلیمہ آپ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی (گرم) آب وہوا آپ کو موافق نہ ہوگی، پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کردیا، اور وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لاکر آپ کو ملا جاتی تھیں جب آنحضرت ﷺ کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا، اس لیے حضرت حلیمہ آنحضرت ﷺ کی دودھ پلائی ماں اور ان کے خاوند حارث، دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ، انیسہ اور خزیمہ عرف عثمان دودھ شریک بھائی بہن ہوئے عربوں میں قریش اور خصوصاً یہ شاخ جو بنی سعد کی کہلاتی تھی عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لیے مشہور تھی، اور اسی سبب سے جناب پیغمبر ﷺ بھی نہایت زبردست اور موثر ترین فصیح وبلیغ تھے، عرب فصاحت وبلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے، اور جو شخص فصیح وبلیغ نہ ہوتا، اس کو نظر حقارت سے دیکھتے، اور ذلیل سمجھتے، خواہ وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

مگر بنی سعد میں چار برس تک کی آنحضرت ﷺ کی پرورش کو، سر ولیم میور قرآن مجید کی

فصاحت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''اس سبب سے آنحضرت ﷺ کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوش نما زبان کے خالص ترین نمونہ کے مطابق بن گئی تھی...... جب ان کی فصاحت وبلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی، تو ایک خالص زبان اور ایک دل فریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا، (یعنی آپ قرآن مجید جیسی فصیح وبلیغ چیز پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے) مگر کیا قرآن مجید جیسا کلام رسول اللہ ﷺ کی بنی سعد میں پرورش کا نتیجہ ہے؟ اور کیا رسول اللہ ﷺ کا کلام، اس انداز کا ہوتا تھا جیسا کہ ہم قرآن مجید کی سورتوں میں دیکھتے ہیں؟ سرسید نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا جو کہ:

''ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی، جب آنحضرت ﷺ کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں، جس میں یقین کیا جاتا ہے کہ خاص آنحضرت ﷺ کے الفاظ محفوظ ہیں، جیسے دعائیں وغیرہ، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز کلام اپنی بلندی اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے باوصف فصحائے عرب کے طرز کلام جیسا ہے لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے، اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے، اور ہم دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے، اور دوسرے کلام ربانی۔'' (خطبات ص ۱۲۷)

## عہد طفولیت کے واقعات

آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی، حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لیے مدینہ لے گئیں، کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں، اور پھر مکہ معظّمہ کو واپس ہوئی، مگر راستہ میں اہواز کے مقام پر وفات پائی، آنحضرت ﷺ مکہ پہنچے تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی، اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے، اس دوران میں اور دادا کے انتقال کے بعد بارہ برس کی عمر تک آنحضرت ﷺ کے چند واقعات کو، سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں قابل اعتراض ٹھہرایا ہیں مثلاً مدینہ کی چھوٹی بچیوں کے ساتھ

ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، دودھ شریک بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا، سر ولیم میور نے جس مقصد سے یہ واقعات بیان کیے ہیں، ان پر سرسید نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اگرچہ ان باتوں کی اور اس قسم کی دوسری باتوں کو جو سر ولیم میور نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے، لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں، تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں کہ جو بچپن میں انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی ہیں، آنحضرت ﷺ نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے اپنے کو صرف یہ کہا کہ: ''اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَـــــيَّ'' پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتیں۔'' (ایضاً ص ۲۲۷)

آنحضرت ﷺ کی عمر کے آٹھویں برس آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ ''جب آنحضرت جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے، تو لوگوں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا'' لیکن بقول سرسید:

''یہ ایک ایسی بات ہے جس سے سر ولیم میور کی خواہش کے برخلاف ہمیں کچھ تعجب نہیں، بلکہ اگر نہ روتے تو ہمیں نہایت تعجب ہوتا، آنحضرت ﷺ اس وقت کم عمر تھے، اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا اور رنج کے وقت دل میں نرمی اور گداز کا ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ ہے، پس آنحضرت ﷺ نے بھی اس فطرت کی پیروی کی تھی، جو خدا نے انسان میں پیدا کی ہے۔'' (خطبات ص ۲۲۷)

## سر ولیم میور اور مولود ناموں کی روایات

بعض مولود ناموں میں (جن کے لکھنے والے بھی زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں، فکر و تخیل سے کام لے کر محض خوش گمانی سے شاعرانہ انداز میں جو کہانیاں لکھ دی گئی ہیں، سر ولیم میور

نے ان کا بھی سہارا لے کر اسلام پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں فرماتے ہیں ''آنحضرت ﷺ کے زمانہ ولادت میں حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نا معلوم آواز کو سن کر ڈر جانا، یا ایک سفید مرغ کا اچانک نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کو اپنے اضطراب میں تسکین پانا یا حضرت آمنہ کے لیے ایک خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نا معلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا فرشتوں کی آواز آنی یا بغیر اس کے کسی شخص کا دکھائی دینا، یا اُس کے چلنے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا یا آنحضرت ﷺ کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لیے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا بہشت کے پرندوں کا چہچہانا، بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا، یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں، جو غالباً سر ولیم میور نے کسی مولود نامہ سے اخذ کیے ہیں، اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا، سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے خیالات ہیں جو انھوں نے اپنے مضامین کو آراستہ کرنے اور آنحضرت ﷺ کی تاریخ کی رونق بڑھانے کے لیے بیان کی ہیں، جیسا کہ اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں شاعروں کا خصوصاً مشرقی شاعروں میں دستور ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اس قسم کے خیالات نظم میں بیان کیے ہیں، چنانچہ ملٹن کی پریڈائز لاسٹ انھی خیالات سے جڑی ہوئی ہے، اس لیے نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے یہاں کے اسی قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے، اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو ذہنی روایتوں کی حیثیت دے کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ سب راویوں کی ایجاد ہیں۔

''شاعروں نے اپنی محبت کے جوش میں اور عقیدت کے طور پر اپنے شاعرانہ انداز میں اور بھی واقعات بیان کیے ہیں، مثلاً آنحضرت ﷺ نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا، اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی، کلمہ پڑھا، تین نورانی فرشتے آسمان سے اترے ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن، اور تیسرے کے پاس رومال تھا، انھوں نے آنحضرت ﷺ کو سات مرتبہ غسل دیا، اور آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا، آنحضرت ﷺ کے بچپن کے یہ واقعات شاعرانہ اظہار خیال کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور نے ان کو بھی مذہبی روایات

کے طور پر بیان کیا ہے، جو کہ نہایت ہی غلط بات ہے۔" (ایضاً ص ۲۷۔۴۲۶)

## ایک بے جا تنقید

سر ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کے مختون پیدا ہونے کو بھی راویوں کی ایجاد قرار دیا ہے، جس کو وہ عجیب وغریب بعید از قیاس اور قانون فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں" اس اعتراض پر سرسید احمد خاں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"یہ بات نہ معجزہ سے تعلق رکھتی ہے نہ عجائبات سے بلکہ اس کا تعلق فطرت کی نیرنگیوں سے ہے جس کی اور بھی نظریں بتلائی جا سکتی ہیں، مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں تذکیر وتانیث دونوں کی علامتیں ہوں، ایسے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کی طرف سے کہیں کہیں دوسرے طریق اپنانے میں کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں اس لیے معجزہ یا عجائبات کا نام لیے بغیر بھی آنحضرت ﷺ کا مختون پیدا ہونا قابل فہم اور قرین قیاس ہے اس کا ثبوت اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ختنہ کی رسم بڑی پابندی سے جاری تھی، اور ضروری قرار پا گئی تھی، اور عرب دور جاہلیت میں بھی اس کے ترک کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے مگر آنحضرت ﷺ کے ختنہ کی رسم کا ہونا ضعیف ترین روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا، (جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ پیدائشی طور پر آپ کے مختون ہونے کی روایت درست ہے، اس کو راویوں کی ایجاد کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" (خطبات ص ۴۲۸)

## مہر نبوت

مہر نبوت کے بارے میں سر ولیم میور کہتے ہیں کہ:

"صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی۔"

لیکن سرسید کے خیال میں "تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود سا

تھا، اور اس پر بال تھے، آنحضرت ﷺ کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی، اس لیے اس کو مہر نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہوگا بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے، تمام علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے، پس کیا ایک عیسائی عالم کے لیے یہ بات نازیبا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار کرتے ہوں، شمائل ترمذی کے حاشیہ باجوری میں لکھا ہے کہ "یہ جو روایت ہے کہ اس پر پچھنے کے جیسے نشان تھے، یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند، یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا، اور اس پر محمد رسول اللہ ﷺ لکھا ہوا تھا، یا یہ لکھا ہوا تھا اے متصور" (انك منصور) ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ عسقلانی نے کہا ہے، اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر محمد رسول اللہ ﷺ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، اس کو ہاتھ کی مہر اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے، دھوکا ہوگیا ہے، کیونکہ وہ عبارت ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی نہ کہ پشت کے غدود پر" اس لیے باجوری اور عسقلانی کی تحقیق کے مطابق یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ جو روایتیں سر ولیم میور نے بیان کی ہیں علمائے اسلام نے ان کو رد کیا ہے، شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا ﷺ کے پاس گئے ان کے باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا ﷺ کی پیٹھ پر تھی، اور کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس کا علاج کردوں، کیونکہ میں طبیب ہوں، رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ تم رفیق ہو، اور اللہ طبیب ہے" اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے، وہ کیا چیز تھی، اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت ﷺ کے اصحاب تھے، اس کو کیا سمجھتے تھے، پس سر ولیم میور نے جو اس کو عجائبات اسلام کے طور پر بیان کیا ہے، یہ محض ایک بیجا امر ہے۔

(ایضاً ص ۴۳۸)

### چند اور واقعات

سر ولیم میور نے اور روایتیں بھی درج کی ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے، اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی لیکن

جیسا کہ سرسید احمد خاں نے وضاحت کی ہے کہ:

''اس طرح کی باتوں کو خود علمائے اسلام نے غیر صحیح اور نا معتبر قرار دیا ہے، سر ولیم میور ان کو مذہبی روایتیں کہہ کر بیان کرتے ہیں، تو دراصل وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام کی بے وقعتی ظاہر کریں۔''

لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہیے، کہ عام بے پڑھے لوگوں میں جو باتیں مشہور ہو جاتی ہیں وہ مذہب نہیں بن جاتیں، بلکہ بے سند ہونے کی وجہ سے وہ نا معتبر ٹھہرائی جایا کرتی ہیں۔

وہ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا، لیکن شرح السنہ میں بیان کی ہوئی یہ روایت اس طرح نہیں ہے جس طرح کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، شرح السنہ میں عریاض بن ساریہ سے منقول ہے کہ:

''رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیم علیہ السلام کی، بشارت ہوں عیسیٰ علیہ السلام کی اور اپنی ماں کا خواب ہو (رویا امی) انھوں نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا کہ ان سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔''

پس جو روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور پیدا ہونے کا ذکر ہے ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تو تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ ہی فطرت انسانی سے بعید۔ (خطبات ص ۲۳۲)

## فرشتہ کے ذریعہ ''احمد'' نام کی تلقین

سر ولیم میور نے واقدی کا ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا'' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ احمد کے مادے سے جو نام مشتق ہوتے ہیں وہ عرب میں رائج تھے، مگر ''احمد'' نام عرب میں بہت کم ہوتا تھا، اور آنحضرت ﷺ کے سوا پانچ آدمی اور بھی گزرے ہیں جن کا نام محمد تھا، واقدی کے حوالہ سے وہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے، جنھوں نے یہود، نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا

کہ عن قریب عرب میں ایک نبی اس نام کا ہونے والا ہے، اور اکثر لوگ اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھا کرتے تھے، اور ہر ایک امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخرالزماں ہونے کی عزت حاصل کرے گا" مگر سرسید کا خیال یہ ہے کہ:

"اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے یہ کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سرولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے؟ اگر توریت مقدس کی یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے، اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل رکھنا، (پیدائش باب ۱۶ آیت ۴) اور یہ آیت "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بے شک ایک لڑکا پیدا ہوگا، اور اس کا نام اسحاق رکھنا، (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹) اور انجیل کی یہ آیت اور اس کے (مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا، اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھ، کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا، (متی باب ۱ آیت ۳۰) صحیح ہے کہ وہ عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو وہ کس بنا پر اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور اس نے اس لڑکے کا جو پیدا ہونے والا تھا احمد نام رکھنے کے لیے کہا۔"

"اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ (بائبل کے) عہد عتیق میں آنحضرت ﷺ کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے، اور انجیل میں احمد کے نام سے، اس لیے ان بشارتوں کے پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا، جس کو اہل عرب کبھی نہیں، یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔" (خطبات ص ۳۴۷)

سرولیم میور کے خیال میں "انجیل یوحنا کے یونانی ترجمہ میں پیریکلی ٹوس تھا، جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں، لیکن کسی جاہل یا متقی راہب نے اس کو پیریکلیوٹوس" کر دیا ہے، جس کے معنی "احمد" (تعریف کیا ہوا) ہیں، مگر بقول سرسید انجیل کا صحیح لفظ پیریکلیوٹوس" ہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ

مسلمانوں میں اس کی عربی شکل فارقلیط پائی جاتی ہے، (اصل یونانی نسخہ کی عدم موجودگی میں، ظاہر ہے کہ عربوں کی روایت ہی قابل ترجیح ہوگی جو فارقلیط کا لفظ استعمال کرتے تھے جو پیریکلیٹوس کی عربی شکل ہے، اور اس لفظ کے بارے میں تاریخ کی یہ قدیم ترین شہادت بتلاتی ہے کہ یونانی نسخہ میں پیریکلی ٹوس نہ تھا، جس کا ترجمہ تسلی دہندہ کیا جاتا ہے۔)

سرولیم میور کا یہ دعویٰ کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گزرے ہیں، سرسید کے نزدیک بے فائدہ ہے، ''اس لیے کہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب میں، اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا، انھوں نے تو اس بات کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی کہ اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گزرے ہیں، مگر:

''یہ بات کس طرح (بائبل کے) عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی'' کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام دیں، لڑکے کے نبی ہونے کے لالچ میں کیوں نہ رکھا ہو، مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدائے تعالیٰ کو نبی آخرالزماں بنانا منظور تھا، ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے، جب ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت ﷺ سے ظہور میں آئے تھے، اور وہ ایسے کام ہیں، جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جب ہم اس روحانی کیف وسرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے، اور جس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات میں عام کیا تھا، اور جو آئندہ نسلوں میں اپنے ورثہ کے طور پر آپ نے پیدا کیا، اور جب ہم اس سچائی اور پاک بازی پر نظر ڈالتے ہیں، جس کو آنحضرت ﷺ نے رائج کیا اور جو زمانہ کی گردشوں کے بعد بھی کامل اور بے عیب رہی ہیں اور ابدالآباد تک اصلی حالت پر اسی طرح رہیں گی، تو ہم کو اس بات کا کامل یقین ہوجاتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے، جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، ﷺ۔ (خطبات ص ۲۳۶)

## اسپرنگر کی عجیب وغریب دریافت

مستشرقین نے ہر جگہ ''عیب'' کی دریافت کی ہے، چنانچہ حضرت آمنہ کا خواب میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا، ان کے نزدیک صرع یعنی مرگی جیسے مرض کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے، جب کہ فرشتوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنا، سرسید کے نزدیک ''کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف اس واقعہ سے تو مزید اس بات کی تائید ہو جاتی ہے، کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے خواب میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا، سرسید فرماتے ہیں کہ:

> ''اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمان داری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کو ضعیف دماغ اور صرع کی بیماری تھی، جب کہ حضرت سارہ اور حضرت مریم جو (بائبل کی تصریح کے مطابق) فرشتوں کو دیکھا تھا، اس کو سرع کی بیماری نہیں قرار دیتے۔'' (خطبات ص ۳۶ ۷)

## حضرت حلیمہ کے گھر میں برکت

حضرت حلیمہ، رسول اللہ ﷺ کو بچپن میں اپنے گھر پرورش کے لیے لے گئیں، تو کئی طرح سے برکتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اب بچہ کو خوب سیر ہو کر دودھ پلا سکتی ہیں، بلکہ اس قدر کہ وہ ان کے اپنے بچہ کے لیے بھی کافی ہو جائے گا، اور مویشی بھی فربہ ہوتے چلے گئے، اور کثرت سے دودھ دینے لگے، سرولیم میور نے یہ اور اس طرح کے کئی واقعات غالباً تعجب انگیز سمجھ کر نقل کیے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ''یہ سب باتیں ایسی ہیں، جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے، لیکن ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے۔'' وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ایسی باتوں کو عیسائی عالم بطور از قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو وہ بلاشبہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا، کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے'' (پیدائش باب ۳۰، آیت ۲۰) اور

عیسائی عالم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہوگیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے (پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۰) آیت ۳۶ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر خدا نے حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت دی ہے تو اس کو دور از قیاس قرار دے کر تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے۔"

(خطبات ص ۲۳۷)

## حیاتِ رسول ﷺ میں کسی مرض کی جستجو

سر ولیم میور اور کئی دوسرے مستشرقین کی دماغی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حیرت انگیز سیرتِ طیبہ اعلیٰ کارناموں، اور عظیم صفا کی اصل وجہ اور حقیقی سرچشمہ، اس بیماری کو قرار دیتے ہیں جو صرع یعنی مرگی کے نام سے موسوم ہے اور اس طرح وہ دراصل اپنی سیاہ باطنی، اندھی عصبیت اور اپنی کوتاہ فہمی یا بد دیانتی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ابن ہشام اور دیگر متاخرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو یہ گمان ہوا کہ لڑکے کو ایک عارضہ (Fit) ہوگیا ہے، سر ولیم میور نے فٹ کا انگریزی لفظ استعمال کیا جس کے معنی ہیں لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یک بارگی حملہ کے ہیں، جس سے بدن کپکپانے لگے، اور کبھی غشی طاری ہو جائے، اس سے موصوف نے غالباً صرح (مرگی) مراد لی ہے، مگر سر سید فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے پاس سیرت ابن ہشام موجود ہے جو ڈاکٹر فرڈیننڈ وسن فیلڈ کی نگرانی میں ۱۸۵۸ء میں گاٹجن میں چھپی ہے، اس کی کتاب سے ہم وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

قالت وقال لی ابوہ یا حلیمة لقد خشیت ان یکون ھذا الغلا وقد اصیب فالحقیه باھله . یعنی حلیمہ نے کہا کہ اس کے باپ (دودھ شریک باپ اور حلیمہ کے شوہر) نے کہا کہ اے حلیمہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہوگیا ہے،

اس لیے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے، مگر جب وہ آنحضرت ﷺ کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا، اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور فرمایا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، (یعنی تمھارا یہ خیال درست نہیں ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو گمان ہو گیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔''

سر ولیم میور نے ایک غلطی تو یہ کی ہے کہ اپنی کتاب کے ص ۲۱ (حاشیہ) پر لفظ ''اصیب'' کو ''امیب'' لکھا ہے، دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس سے وہ (Fit) یعنی مرگی جیسی بیماری مراد لیتے ہیں، ایک دو کے سوا، آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری لکھنے والے تمام عیسائی مصنفین، یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو صرع (مرگی) کی بیماری لاحق تھی، بہت تلاش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خام خیالی عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوئی، ایک تو ان کے مذہبی توہمات کی وجہ سے اور دوم عربی عبارت کے لاطینی میں غلط ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے۔''

ڈاکٹر پوکاک نے تاریخ ابوالفداء کا لیٹن میں ترجمہ کیا، جو ۱۷۲۲ء میں آکسفورڈ میں شائع ہوا، اس میں فَـالْحِقِیهِ کو ''بِـالْحَقِیَّةِ'' بنا دیا گیا، اور چونکہ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکا تھا، اس لیے ترجمہ میں اس کو تو چھوڑ دیا گیا، اور اصیب جس کے معنی صرف بیماری کے ہیں، اس کے لیے لیٹن میں جو الفاظ درج ہوئے، اس میں یہ ترجمہ کر دیا گیا کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری مراد لی ہے، حالانکہ یہاں صحیح ترجمہ یہ تھا کہ ''مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے، پس اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں پہنچا دو۔''

عرب ان تمام بیماریوں کو جن کا سبب معلوم نہ ہوتا، خبیث روحوں اور شیطان کا اثر سمجھتے تھے عیسائی مصنفوں نے اپنے وہمی ذہن سے، یہ سمجھ لیا کہ یہ بیماری صرع تھی، حالانکہ عرب صرع ہی کو نہیں، بلکہ ہر ایک پیچیدہ بیماری کو شیطان کا اثر سمجھتے تھے، لیکن ایک عیسائی مورخ گبن نے

آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس بیماری سے متعلق لکھا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ پر یونانیوں کا ایک نا معقول اتہام ہے۔" سرسید احمد خاں نے صرح کے بارے میں پہلے تو طبی نقطہ نظر سے بحث کی ہے، چیمبرزان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں سانس رک جانے اور اعصاب میں تشنج پیدا ہو جانے کی وجہ سے بے اختیار ہو کر شدت سے اعصاب پھڑ کنے لگیں، اور کبھی سانس بالکل ہی بند ہو جائے اس بیماری میں مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے، اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی، مردہ دلی اسے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے، بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے، تمام جسم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایسے مریض کے ذہن میں اپنی کمزوری کا یقین جم جاتا ہے، اور اسے مشقت طلب کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے اس تفصیل کے بعد سرسید نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ:

"کوئی مؤرخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا، کہ مذکورہ بالا اثرات میں سے ایک بھی آنحضرت ﷺ میں پایا گیا تھا، بلکہ اس کے برخلاف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے، خود سرولیم میور کہتے ہیں کہ دو برس کی عمر میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھڑایا، اور ان کے گھر لے گئیں، آمنہ اپنے لڑکے کو تندرست اور قوی ہیکل دیکھ کر جو آپ سے دوگنی عمر والے لڑکے کے برابر معدوم ہوتی تھی، اس قدر خوش ہوئیں کہ "حلیمہ سے کہا کہ اس کو پھر لے جا" لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت مضبوط، تندرست اور قوی تھے بہت تیز چلا کرتے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے، تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اور ان سب کو انھوں نے کمال صبر و استقلال سے برداشت کیا، انھوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی، جس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی، علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جس کا ہم سر جہان سے معدوم ہے، انھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پر پہنچا دیا،

جس اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، ان کے ذریعہ انسانوں کی بہبود اور رفاہ کے لیے وہ ملکی و مالی، دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا، جو اپنی نوعیت کا یکتا اور بے نظیر ہے آنحضرت ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرہ عرب کو فتح کیا اور مختلف قبیلوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان مضبوط اور طاقتور قوم بنا دیا جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بڑے حصہ کو معمولی عرصہ میں مفتوح و مسخر کر لیا، کیا یہ خیال عقل وانصاف کی رو سے درست ہوگا، کہ ایسے نمایاں کارنامے ایک لاچار اور ناتواں صرع کی بیماری میں مبتلا شخص سے وجود میں آئے ہوں گے، ایسے نمایاں کارنامے اسی شخص کے ذریعہ عمل میں آسکتے ہیں، جس کی روحانی وجسمانی قوتیں صحیح وسالم ہوں، اور جس کو تائید ربانی حاصل ہو۔'' (خطبات ص ۴۵۔۲۳۸)

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرت ﷺ کے سر پر سایہ فگن دیکھ کر گھبرائیں اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لیے روانہ ہوئیں، ''تعجب کی بات یہ ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سر ولیم کو اس سے آنحضرت ﷺ کی بیماری کا خیال آ گیا، پھر آنحضرت ﷺ کے اوپر اگر کبھی بادل کا ٹکڑا سایہ دار آ گیا ہو تو یہ بات ناممکن نہیں، البتہ یہ خیال کہ آپ پر ہمیشہ بادل سایہ کیے رہتے تو اس کی کوئی سند نہیں ورنہ اکثر صحابہ اس کا ذکر کرتے، اور مستند حدیثوں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی سر ولیم میور اسے بھی ''صرع'' کی بیماری کا اثر ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جس پر سر سید احمد خاں نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

''ہم سر ولیم میور کی اس رائے کو کہ آنحضرت ﷺ کے صرعی دوروں نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا، اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا، تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر آدمی مصروع جانتا ہو،

اپنے صریح غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت کرے، اور جو شخص اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ اس بیماری سے واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود اس کے عزیز و اقارب اور عرب کے تمام بڑے بڑے لوگ اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں اور اپنے آبائی مذہب اور قدیم رسموں کو چھوڑ کر اس شخص کے قول و فعل پر کامل ایمان لے آئیں۔'' (خطبات ص ۲۴۷)

## اہل کفر کے لیے دعائے مغفرت

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے حکموں کی سختی اور شدت کی ایک عجیب مثال ہے'' مگر سرسید فرماتے ہیں کہ ''ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور انبیا پر یقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں، بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں، کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ یہ بات زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لیے ایک نہایت کار آمد اور عمدہ ذریعہ ہے، مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ سبب سے آنحضرت ﷺ کے احکام پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے، تو ''رحم دل عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے لیے جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں، کیسا نرم فیاضانہ اور رحم دلی کا سلوک کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں، بلکہ سرسید کے اپنے الفاظ میں:

''ہماری توقع کے خلاف ''رحم دل'' عیسائی مذہب میں غیر عیسائیوں کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اتھنیسین خطبہ میں جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں متعین دنوں میں پڑھا جاتا ہے، اور تمام اہل کلیسا کے اتفاق سے منظور ہوا ہے، ان سب عقیدوں کو بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر فرض ہے، صاف طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے، جس پر عقیدہ

رکھے بغیر آدمی نجات نہیں پا سکتا'' تو جب کہ ''رحم دل'' عیسوی مذہب کے مطابق ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے، اور اسی لیے کسی کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے، تو عیسوی مذہب کو اس بارے میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟''

(خطبات ص ۲۴۶۔۷)

## سامان خورد ونوش میں برکت

سر ولیم میور اپنی کتاب میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کھانے پر موجود نہ ہوتے، تو تمام خاندان کے لوگ اپنے کفایت شعار کھانے سے (فارغ ہونے پر بھی) بھوکے ہی اٹھتے تھے، لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے، تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا۔

پھر سر ولیم میور اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس بات کو عروج پذیر نبی کی بڑائی اور عظمت خیال کیا جاتا، لیکن سر ولیم میور نے اس موقع پر بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی مذہبی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ سر سید احمد فرماتے ہیں کہ:

''ہم کو تعجب ہے کہ عیسائی ایسی روایتوں کو اعتراض کی نیت سے نقل کرتے ہیں (حالانکہ) ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ وہ متی باب ۱۴، آیت ۲۰۔۱۹، کے اس بیان کو مانتے ہیں کہ ''اس نے (حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا، اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں، اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی، اور ان کو توڑا، اور اپنے حواریوں کو دیں، اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں، اور ان سب نے پیٹ بھر کے کھائیں، اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اٹھا لیا۔''

## آنحضرت ﷺ کے سفر شام سے نبوت کا تعلق

سر ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کے سفر شام سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے کہ:

''جب محمد ﷺ ملک شام کو گئے، تو بحیرا راہب نے آنحضرت ﷺ کو اور لوگوں

کے درمیان اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ آپ کے سر پر ایک بادل سایہ کیے ہوئے چلتا تھا، اور درختوں کی شاخیں آپ کے اوپر دھوپ روکنے کے لیے جھک جاتی تھیں، اور بحیرا نے محمد ﷺ سے سوالات کیے اور مہر نبوت کو معلوم کرنے کے لیے آپ کے جسم کا معائنہ کیا۔"

شام کے اس سفر میں، سر ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ:

"زمانہ سابق کی منہدم اور اجڑے ہوئے مقامات نے جن کو خیالی قصوں، عجیب و غریب بیانات اور دل کش روایتوں نے اور بھی مؤثر بنا دیا تھا اور گرجاؤں صلیبوں مورتوں، آراستہ مذہبی نشانات و آثار اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد ﷺ کے غور و فکر کرنے والے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور پائیدار اثر ڈالا تھا۔"

سر سید نے، سر ولیم میور کے جواب میں اول تو ترمذی کی یہ روایت پیش کی ہے کہ ابو طالب نے محمد ﷺ کو ابو بکر اور بلال رضی اللہ عنہما کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا" وہ یہ لکھتے ہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے، اور بلال رضی اللہ عنہ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی عمر ۱۲ سال کی تھی، اس لیے آپ کو ان دونوں حضرات کے ساتھ شام سے واپس بھیجنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، لیکن اگر اس واقعہ کو تسلیم کو کر لیا جائے تب بھی سر سید کے نزدیک یہ بات ہر گز لائق تعجب نہیں ہے کہ بحیرا راہب کو آپ کے بارے میں نبی ہونے کا گمان ہوا ہو، کیونکہ اس وقت یہود و نصاریٰ ایک مسیح اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہ ۱۲ سال کی عمر میں، آپ نے محض ایک ہی سفر میں اور معمولی سے وقت میں بحیرا راہب سے نبوت کا کامل سبق پڑھ لیا، اور تقریباً ۳۰ برس کے بعد اس کو اچانک لوگوں کے سامنے پیش فرمایا یہ بات سر ولیم میور کے شر انگیز لیکن زرخیز ذہن کی پیداوار تو ہو سکتی ہے، لیکن کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اور پھر سر ولیم میور یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ مرگی زدہ شخص تھے، اس موقع پر سر سید احمد خاں فرماتے ہیں کہ:

"ہم سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر

سکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص کے دل و دماغ میں غور وفکر کی اس قدر صلاحیت ممکن ہے اگرچہ سر ولیم میور کا یہ بیان نہایت دلچسپ ہے، مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اس لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامتوں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا تھا" بعد میں انھی چیزوں کی مخالفت کی صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا، اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہ لاشریک بتلایا، اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا، اور تمام دنیا میں اس کو رواج دیا۔

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر ڈالا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے، اور پھر وہ آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں وہ ایک دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزری تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامات تک، وہ اس قدر عقل وفہم و ذکا سے آراستہ تھے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر انھی کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود وغیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات پیش کر سکا، وہ لڑکا بلاشبہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا، جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی، اور وہی تھا، جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی، کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمھارے لیے ضرور ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس نہیں آئے گا، اور اگر میں چلا جاؤں گا اس کو تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" (خطبات احمدیہ: ص ۷۵۳)

# سیرتِ نبویؐ اور مستشرقین

## منٹگمری واٹ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

از: ڈاکٹر عماد الدین خلیل (المعہد الحضاری، الموصلی، عراق)

ترجمہ: عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان خواہ اس کی تعلیمی استعداد کچھ بھی ہو، وہ سیرتِ نبویؐ کے بارے میں اپنے نقوش و تاثرات کو ایک بدیہی حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کے ان تاثرات کا سرچشمہ وہ تاریخی روایات نہیں ہیں، جن میں سے ایک حصہ ضعیف ہے، تو دوسرا حصہ شک و ریب کی حالت میں ترتیب دیا گیا ہے، ممکن ہے مسلمانوں میں سے کسی نے سیرۃ نبویؐ پر کوئی ایک کتاب بھی باقاعدہ نہ پڑھی ہو، لیکن رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اس کے تاثرات جن ذرائع سے حاصل ہو رہے ہیں، وہ ان زمینی سرچشموں کے مانند ہیں جن سے پانی گر کر ایک دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اپنے گردوپیش قرآن و حدیث سے حاصل ہونے والی معلومات اور اپنی ایمانی زندگی کے سچے تجربات کی راہ سے وہ سیرتِ رسول ﷺ سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔ واقعات سیرت کے بارے میں اس کی واقفیت اسی اجتماعی شعور کا نتیجہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک سیرت کے واقعات کو منتقل کرتا رہا ہے۔ سیرت نبویؐ کے ساتھ گہری وابستگی اور اس کا احترام ایک مسلمان کے قلبی تاثرات کا حقیقی سرچشمہ ہے، ان تاثرات میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرتا ہے، تاہم مذکورہ بالا محرکات یکجا ہو کر ایک مسلمان کے لیے سیرت نبویؐ کے بارے میں ایک ہی نقطہ نظر پیدا کرتے ہیں، اس سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہیں جو شاذ و نادر مخصوص حالات کی بنا پر کسی بھی درجہ میں اسلام کے باغی ہوں یا انھوں نے غیر اسلامی مصادر کا مطالعہ کر کے اسلام کے برعکس دوسرے اثرات قبول کر لیے ہوں۔

احترام و پسندیدگی اور یقین ومحبت کے احساسات سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ استوار ہوتا ہے، اسی سے سیرت کے بارے میں اس کا رویہ متعین ہوتا ہے اور اسی سے سیرت کی پوری ترجمانی اور تفہیم ہو سکتی ہے لیکن جب مستشرقین کی طرف سے صاف اور صریح باتوں اور تسلیم شدہ حقیقتوں کا انکار کیا جاتا ہے، تو ایک مسلمان عام حالات میں ان سے متاثر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اندر تنفر اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سیرت کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس میں اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ وحی آسمانی ہے، آپ نے جو سوسائٹی بنائی وہ ایمان کی جیتی جاگتی تصویر اور آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ ہے، کیا اس کا بھی تحلیل و تجزیہ کیا جائے گا، جیسا کہ کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں ایٹمی ذرات اور مادی عناصر کا تجزیہ کیا جاتا ہے، یا جس طرح انجینئر کی میز پر رقبہ، زاویہ اور خطوط کے خاکوں اور نقشوں کا معائنہ ہوتا ہے۔

ان مباحث میں ہم ایک مخصوص نوعیت کے تجربہ سے دوچار ہوتے ہیں یہاں مختلف اسباب و محرکات ہمیں عقل کی حدود سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ہر مسئلہ کا معروف منطقی معیار کے مطابق تجربہ کرنا دشوار ہے غیبی حقیقتوں کو روایتی منطق کا سہارا لے کر خالص اصولوں پر جا پہنچنا ایک جرم عظیم ہے، کیوں کہ زندگی کی پیچیدگیاں اور روح کی تاثیرات ایسی نہیں جن کو انسانی جسم کی طرح جانچا پرکھا جا سکے۔

دین غیب اور روح سیرت طیبہ کے خمیر ہیں، ان کے بارے میں حواس انسانی یا عقل محض ایک حد تک ہی، اپنی رائے دے سکتے ہیں اور نہ ان کے اکثر گوشے عقل و منطق کے تجربہ اور احواس انسانی کی گرفت سے بالاتر ہیں، اس لیے یہ مستشرقین خواہ بظاہر مورخانہ اصول وضوابط کے کتنے ہی پابند ہوں مگر سیرت طیبہ کے معاملہ میں ان کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں دو نکتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے

ایک مستشرق اپنی مغربیت اور اپنے خارجی تصور کی وجہ سے سیرت کی مزاج و فطرت میں شکست وریخت کے عمل کو اپناتا ہے اور اس طرح مذہبی جذبات سے تصادم مول لے کر ثابت شدہ

حقیقتوں سے متعلق آشفتہ بیانی سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے وضع کردہ اصولوں اور عقلی ضابطوں کی روشنی میں سیرت کے جسم سے اس کی روح اور معنویت کو جدا کرنے کی بے سود کوشش کرتا ہے گویا کہ یہ بھی کوئی مادی جسم ہے، جس پر تجربات کرنے کے لیے بحث وجدال کی صلاحیتوں کو مظاہرہ کرنا ضروری ہو۔

مذکورہ بالا دونوں نکتوں کی روشنی میں کسی بھی مستشرق کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے بارے میں خالص اسلامی طرزِ عمل یا کوئی سنجیدہ موقف اختیار کر سکے۔

سیرت کے موضوع کو سنجیدگی سے سمجھنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے اس کی بنیاد تین مرحلوں پر ہے، پہلے بنیادی مرحلے میں اس غیبی سرچشمہ پر ایمان یا کم از کم اس کا احترام ضروری ہے جس سے پیام محمدی اور حقیقت وحی کا تعلق ہے۔

دوسرا مرحلہ ہے کہ موضوع کے دائرہ میں رہ کر اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے ایسا نہ ہو کہ کسی پیشگی فیصلہ یا تصور کی وجہ سے فہم کی راہ میں جو واقع پیش آئیں ان کی روشنی میں اصل موضوع ہی کہ اجزاء میں کتر بیونت ہونے لگے۔

تیسرا مرحلہ خالص اصولی طریق بحث کا ہے، جس میں تحقیق کے تمام وسائل کا احاطہ کر لیا جائے تو زبان سے واقفیت اور بنیادی مواد کی فراہمی سے تحقیق کی ابتداء ہوتی ہے، اور تقابل اور موازنہ اور تنقید اور ترکیب وغیرہ پر تحقیق اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

اہل مغرب اصول تحقیق کے تیسرے مرحلہ میں تو پختگی اور کمال کی آخری سرحدوں پر نظر آتے ہیں، لیکن وہ سیرت کے موضوع پر صحیح علمی کارنامے انجام نہیں دے سکے، وہ اس موضوع کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے کیونکہ غیبی سرچشمہ کا احترام اور موضوع کے دائرہ میں محدود رہنے کے لیے خالص عملی طرز سے ہم آہنگ ہونا ضروری تھا، اور ان کے یہاں یہی چیز مفقود ہے۔

تحقیق کے اولین مرحلہ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اہل مغرب خصوصاً نصاریٰ اور مادہ پرستوں سے ایمان راسخ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، یہ ان کے لیے ممکن نہیں لیکن چونکہ سیرت کے واقعات غیبی پس منظر رکھتے ہیں، ایک آسمانی مذہب جو بالاتر قوت سے تعلق رکھتا ہو، اور وہ

انسان کے زمینی یا مادی تجربوں کا نتیجہ نہ ہو اس کو سمجھنے کے لیے اس کے حقیقی سرچشمہ کا ادراک بھی ضروری ہے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جس میں مغربی محقق پر یہ گرفت کی جاسکتی ہے کہ وہ بار بار اپنے موضوع سے ہٹ جاتا ہے، اگر وہ اس کا پابند ہوتا، زمان ومکان، مسلک اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے اپنی عقل کو آزاد کر لیتا، ان اضافی رجحانات اور اصل موضوع میں کتر بیونت سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تو یقیناً اس کی یہ تحقیقات سیرت کی روح اور اس کے مزاج سے زیادہ قریب ہوتیں، اور ان میں پختگی بھی زیادہ پائی جاتی۔

مغربی مورخ یا مستشرق کا طرز تحقیق سیرت کے واقعات اور اس کی فطری ترتیب کو پورے طور پر سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، مستشرقین نے اگر سیرت کے موضوع پر کوئی کام کیا ہے تو اس میں ان سے تاریخی جزئیات یا عقائد کی تفصیلات پر بحث وگفتگو بے فائدہ ہے ان پر تنقید وقتی فائدہ کی حامل ہوسکتی ہے، اس لیے ان کے مقابلہ میں جزئیات کو زیر بحث لانے کے بجائے ان بنیادی امور پر گفتگو کرنی چاہیے جن سے وہ شک وریب کے خارزار تک پہنچے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایک ایسا عادلانہ طریق بحث ونظر اختیار کیا جائے جس میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہو کہ ایک نبی کی سیرت دوسرے انسانی افراد کی سوانح سے واضح طور پر مختلف اور جداگانہ چیز ہے۔

یہ مستشرقین اگر سیکولر اور مادہ پرست ہیں تو غیب پر ان کا ایمان نہیں ہے، اور اگر یہودی ہیں تو ان کو اپنی نسل سے باہر کوئی نبی تسلیم نہیں اور اگر عیسائی ہیں تو ان کو اپنے بعد کسی کی نبوت ورسالت کا یقین نہیں ہوتا۔

سیرت طیبہ نے غیب وشہود کی یکجائی کے ساتھ اسلامی عقیدہ کے اثر ونفوذ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے، اس نے تحریف شدہ مسیحیت کی راہیں مسدود کر دیں جس کی وجہ سے سیرت اور مستشرقین کے درمیان حد فاصل قائم ہوگئی، اور وہ فہم سیرت سے محروم ہوگئے وہ بار بار اپنی غیر جانب داری اور معروضیت کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر اپنے منطقی تجزیہ اور معلومات کی کثرت کے باوجود ان کی

تحقیقات کو صف اول میں جگہ نہیں دی جاسکتی، ان سے کچھ لوگوں کے کاموں کو دوسری تیسری بلکہ شاید دسویں صف میں جگہ دی جائے۔

ایک مستشرق لامانس کی طرح تعصب کا شکار ہو یا بندلی جوزی کی طرح کائنات اور زندگی کے بارے میں مادی تصورات رکھتا ہو، ان کی تحریروں کو تحقیق کا نام دیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مغرب کی تنقیدی عقل کو تجربہ کے لیے ایک میدان فراہم کر دیا جائے، کوئی سنجیدہ مسلمان اپنے عقیدہ کو ان کی زد میں لانا پسند نہیں کرے گا۔

مستشرقین کی تحقیقات شائع ہوتی رہتی ہیں، ان میں تاریخی تحقیق کے ضمن میں سیرت کے مختلف گوشوں پر بحث کی جاتی ہے، اور تحقیقی اداروں اور مختلف اکاڈمیوں میں ان کے وقار اور وزن کو محسوس کیا جاتا ہے، ان میں کچھ تحقیقات وہ ہیں جن میں فہم سیرت کے لیے جدید وسائل سے کام لیا گیا ہے، اس لیے ان میں طریق بحث معتبر اور پسندیدہ نہ ہو تب بھی مطالعہ سیرت کے وقت ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مستشرقین کی واضح یا پس پردہ غلطیوں کی نشاندہی اور ان کے منحرفانہ انداز تحقیق کو نمایاں کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ان کا تنقیدی مطالعہ کریں۔

منٹگمری واٹ نے اس بات کی بڑی حد تک کوشش کی ہے کہ وہ اپنے پیشرو اور معاصر محققین کی غلطیوں سے بچ کر ایک نئے محقق کی طرح سامنے آئے بلکہ اس نے اپنے دور کے مصنفین کے مقابلہ میں پہلی بار یہ التزام کیا ہے کہ سیرت رسول اکرم ﷺ کے واقعات وحقائق کے پس پردہ غیبی بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے احترام اور غیر جانب داری کو برقرار رکھے، چنانچہ وہ اپنی کتاب محمد ایٹ مکہ کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ:

"میں نے ان فقہی مسائل میں جو مسیحیت اور اسلام کے درمیان چھڑ گئے ہیں، ایک غیر جانبدارانہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح یہ جاننے کے لیے کہ قرآن کلام اللہ ہے یا کلام رسول نہیں ہے، میں نے ہر بار قرآن سے دلیل پیش کرتے ہوئے "ارشاد الٰہی ہے، "یا محمد ﷺ فرماتے ہیں" کے الفاظ سے احتراز کیا ہے، میں سادہ طور پر صرف اتنا کہوں گا کہ قرآن کہتا ہے"...... اور اپنے مسلمان

قارئین کے لیے ایسے ہی ملتے جلتے الفاظ ادا کروں گا۔ مغرب میں تاریخ کے جن اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، ان کی صحت اور افادیت کے حق میں مخلص ہونے کے باوجود میں نے اس پابندی کو قبول کر لیا ہے کہ امکانی حد تک کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا، جو اسلام کے بنیادی عقیدوں سے متصادم ہو۔''

مشہور برطانوی مستشرق سر ہملٹن گب نے واٹ کی کتاب پر رائے دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

''یہ کتاب اپنے قاری کے ذہن میں یہ شعور پیدا کرتی ہے کہ اس کا مؤلف ایک ایسا شخص ہے جس نے کسی بھی سابق مؤلف سے بڑھ کر اپنے فکر وخیال میں مکہ میں محمد ﷺ کے تجربہ کے ساتھ وقت گزارا ہے، مزید برآں تحقیقی معاملات میں دقیق ترتیب اور ہم آہنگی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب اصول اسلام کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک جدید اور قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب نے اقتصادی واجتماعی صورت حال اور قرآن کے مذہبی افکار سے ان کے تعلق کو خالص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے اور اسی لیے یہ توقع ہے کہ مغرب میں گزشتہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اس عظیم قائد (ﷺ) کی حق شاہی کے سلسلہ میں یہ کتاب زیادہ موثر ہوگی۔'' [1]

منٹگمری واٹ کی کتاب کو مطالعہ وتجزیہ کے لیے منتخب کرنے کی وجہ یہی ہے کہ دوسرے مستشرقین سنجیدہ تحقیق سے دور ہیں، ان کی کتابیں لائق اعتنا نہ تھیں، تاہم گزشتہ دہائیوں میں ان پر بہت زیادہ تنقیدیں کی جاچکی ہیں۔

واٹ نے سیرت پر دو کتابیں لکھیں ہیں لیکن میں نے دونوں کتابوں کو اپنے تجزیہ اور تنقید کا موضوع نہیں بنایا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس طرح بہت سی باتوں کی تکرار ہو جاتی، چونکہ دونوں کتابوں کا اندر تحقیق ایک ہے، اس طریق تحقیق کا نقص بھی ایک ہی ہے، جو دونوں کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے اس کتاب کا جائزہ لینے کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دوسری کتاب کو بھی اپنا موضوع بنایا جائے۔

---

[1] دیکھئے محمد ایٹ مکہ کے ٹائٹل پیج پر گب کی رائے۔

واٹ نے اپنی کتاب محمد ﷺ ایٹ مکہ کے مقدمہ میں جس خواہش کا اظہار کیا ہے، کیا وہ پوری ہوسکی ہے؟ اس کو جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم سیرت رسول اکرم ﷺ کے بارے میں تحریک استشراق کی تاریخ کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ مختلف مراحل میں اس کی کیا کیا خصوصیات رہی ہیں، اس کے جائزہ کے بعد ہی ہمیں صحیح طور پر یہ اندازہ ہوسکے گا کہ اس تحریک میں منٹگمری واٹ کی کیا حقیقت ہے، اور اس کا انداز تحقیق کس قدر جداگانہ ہے؟

رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اہل مغرب کے موقف کا تعین مذہبی اغراض کے لیے ہوا تھا، اس میں ان کے یہاں تعصب، کبیدگی، نفرت اور غصہ کے جذبات کارفرما تھے، ناواقفیت نے کہیں دانستہ اور کہیں نادانستہ طور پر رسول اکرم ﷺ کے اور ان کے درمیان ایسے دبیز پردے ڈال دیے تھے، جن کی وجہ سے خالص علمی وتاریخی یا معروضی تحقیقات وجود میں نہیں آسکیں، نصرانی کلیسا کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے ان کے مذہبی نمائندوں نے ایک بے پناہ سیلاب کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی، اس کے بعد یہی کام ان کے سیکولر افراد نے انجام دیا ان کا کلیسا سے کوئی تعلق نہیں، مگر نفرت اور تعصب کی گزشتہ روایت آج تک برقرار ہے۔

ان لوگوں کے خیالات ہمارے لیے خوشگوار نہیں، مگر نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہم قریبی دور کے چند لوگوں کے خیالات پیش کرتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ تو ابھی زندہ میں، لیکن ہم یہاں تنقید کی غرض سے اختصار سے کام لیں گے۔

مونیس نیور کورلی اپنی کتاب ''دین حق کی جستجو'' میں لکھتا ہے کہ:

> مشرق میں ایک نیا دشمن ظاہر ہوا یعنی اسلام جس کی بنیاد طاقت اور سخت ترین تعصب پر رکھی گئی تھی، محمد ﷺ نے اپنے پیرووں کو تلوار دی انھوں نے مقدس اخلاقی روایات کے بارے میں نرمی برتی اور اپنے متبعین کو بدی اور لوٹ کی اجازت دی، جنگ میں ہلاک ہونے والوں سے جنت میں دائمی لطف، لذت کے وعدے کیے، کچھ ہی عرصہ میں ایشائے کوچک، افریقہ، اور اسپین ان کا شکار ہوگئے، اٹلی تک کو خطرہ ہوگیا، اس آندھی نے آدھے فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شہر پر آفت آچکی تھی...... پھر دیکھو

نصرانیت نے شارل مارٹل کی تلوار کے ذریعہ بواتیہ کے نزدیک ۷۵۳ء فتوحات اسلام کی راہ روک دی، تقریباً دو صدیوں ۱۰۹۹ء۔ ۱۳۵۳ء تک مذہب کے لیے یہ صلیبی جنگ جاری رہی، یورپ مسلح ہوگیا۔ نصرانیت نجات پاگئی، اور صلیبی علم کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوگیا، انجیل کو قرآن اور اس کے عام اخلاقی اصولوں پر فتح حاصل ہوئی۔'' ❶

موسیو کیمون اپنی کتاب۔۔۔ اسلام کی میتھالوجی میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ:

''محمد ﷺ کا مذہب ایک کوڑھ ہے، جو لوگوں میں پھیلا اور ان کو تباہ کرتا چلا گیا۔ یہ خوفناک مرض، ایک عمومی فالج اور دماغی پاگل پن ہے جو انسان کو گم نامی اور سست روی پر آمادہ کرتا ہے اور ان میں صرف خون ریزی ہی کے لیے بیداری لاتا ہے مے نوشی کی عادت میں پختگی پیدا کرتا ہے اور برائیوں پر جماتا ہے، مکہ میں محمد ﷺ کی قبر؟ گویا بجلی کی ایک لہر ہے، جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پھیلاتی ہے اور ان کو ہسٹریا کے مظاہروں پر دماغی غفلت، لفظ اللہ اللہ کی تکرار اور بے شمار باتوں پر مجبور کر دیتی ہے، اسلام چند عادتوں کو فطرت ثانیہ بنا دیتا ہے جیسے خنزیر کے گوشت اور نبیذ اور موسیقی سے نفرت، طبیعتوں میں سختی اور تعیش کی زندگی میں بدی کو پیوست کر دیتا ہے۔ ❷

جو بیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں کہتا ہے کہ:

''محمد ﷺ مسلمانوں کے دین کے بانی ہیں انھوں نے اپنے پیرووں کو یہ حکم دیا کہ وہ دنیا کو فتح کریں اور تمام مذہب کی جگہ دین اسلام لے آئیں، ان میں اور بت پرستوں اور نصاریٰ میں کتنا زبردست فرق ہے، ان عربوں نے قوت کے بل پر اپنے

❶ ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی:۔ الفکر الاسلامی، الحدیث ص ۵۰۱۔ ۵۳۱۔ محمد اسد لیوپولڈ ویلس: الاسلام علی منفرق الطرق۔ ص ۱۶، عمر فروخ و مصطفیٰ خالدی۔ التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم:۔ تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلہ البلاغ کویت عدد ۵۰ ص ۱۲، مجلۃ الجمعت الاسلامی ہند عدد ۹ سال ۸۔

❷ ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۰۶۔ ۱۲۱ محمد اسد لیوپولڈ ویلس۔ الاسلام علی مفترق، الطرق ص ۱۱۶ عمر فروخ و مصطفیٰ خالدی، المتبشیر: الاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم:۔ تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلہ البلاغ کویت عدد ۵۸ ص ۱۰، مجلۃ البعث: اسلامی ہند عدد ۹ سال ۸۔

دین کو نافذ کیا اور لوگوں سے یہ کہا کہ اسلام قبول کرو ورنہ مر جاؤ، جب کہ مسیح کے خاندان والوں نے حسن سلوک اور نیکی کے ذریعہ لوگوں کو سکون بخشا، عرب ہم پر غالب آ جاتے تو دنیا کا کیا حال ہوتا؟ تب تو ہم بھی الجزائر اور مراکش والوں کی طرح کے مسلمان ہوتے۔ ❶

"محمد ﷺ کی تلوار اور قرآن، تمدن آزادی اور صداقت کے سخت ترین دشمن ہیں، اور دونوں ان تباہ کن وسائل میں سے ہیں جن سے دنیا اب تک واقف ہوئی ہے۔ قرآن سچائیوں بے سروپا باتوں مذہبیات اور بے بنیاد کہانیوں کا عجیب وغریب مجموعہ ہے اس میں غلط تاریخی واقعات اور فاسد خیالات پائے جاتے ہیں، اس میں اس قدر غموض وابہام ہے کہ کسی خاص تفسیر کے بغیر اس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے بے نیاز ہے وہ کسی کا باپ نہیں، اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے، اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ اللہ بادشاہ ہے، زبردست ہے، غالب ہے، اس کا اپنی مخلوق اور رعایا سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے، اس کے باوجود اسلام خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ❷

گلودر نے رسول اکرم ﷺ کی شخصیت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

محمد ایک مطلق العنان حاکم تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے، کہ بادشاہ کا یہ حق ہے کہ قوم اس کی خواہشوں کی تابع داری کرے، اور وہ جو چاہے کرتا رہے، ان کی طبیعت میں یہ خیالات پیوست تھے، ان کا یہ عزم تھا کہ جو ان کی مخالفت کرے اس کا سر قلم کر دیا جائے، ان کا عربی لشکر دھمکی اور زیادتی کے لیے

❶ ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۰۶۔۱۲۱ محمد لیو پولڈ ویلس۔ الاسلام علی مفترق، الطرق ص ۱۱۶ عمر فروخ ومصطفیٰ خالدی، التبشیر: الاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم: ۔تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلّہ البلاغ کویت عدد ۵۸ ص ۱۲، مجلۃ البعث: ۔اسلامی ہند عدد ۹ سال ۸۔

❷ ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی: الفکر اسلامی الحدیث، ص ۵۰۷۔۵۲۱ محمد اسد لیو پولڈ ویلس: الاسلام علی مفترق الطرق ص ۱۶، عمر فروخ ومصطفیٰ خالدی التبشیر الاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم: تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلّہ البلاغ کویت عدد ۵۸ ص ۱۲ مجلۃ البعث الاسلامی ہند عدد ۹ سال ۱۸ (۲) ایضاً۔

بے چین رہتا، رسول اکرم ﷺ نے ان کو ہدایت دی تھی کہ ہر اس آدمی کو قتل کر دیں جو ان کی بات نہ مانے یا ان سے دور رہے۔ ❶

سفاری نے ۱۷۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے، مگر اس کا خیال یہ ہے کہ محمد ﷺ نے خداوندی اقتدار کا سہارا لیا تاکہ وہ لوگوں کو اپنا مقصد بنا سکیں: چنانچہ انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو رسول اکرم ﷺ تسلیم کیا جائے، حالانکہ یہ عقیدہ ان کی عقلی ضرورت نے پیدا کیا تھا۔ ❷

مندرجہ بالا اقوال، اسلام اور صلیبی قوتوں کے درمیان تصادم کا فطری نتیجہ تھے، صلیبی جنگوں کے اثرات اہل مغرب کے لیے ہمیشہ تلخ رہے ہیں چنانچہ محمد اسد (لیو پولڈ ویلس) اس تجربہ کا ذکر کرتے ہیں، جو اہل مغرب کے انداز تحقیق میں ایک مشکل اور پیچیدہ گتھی بن کر رہ گیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسلام کے بارے میں روایتی تحقیر نے گروہی عصبیت کی شکل اختیار کر لی اور پھر دھیرے دھیرے یہ عصبیت، اہل مغرب کی علمی تحقیقات میں سرایت کر گئی صلیبی جنگوں کے وقت سے یورپ اور عالم اسلام میں تاریخی حالات نے جو خلیج پیدا کر دی ہے، اس پر کوئی پل قائم نہیں کیا جا سکا، اسلام سے نفرت، یورپی فکر کا اساسی جز ہو گئی، دراصل ابتدائی مستشرقین وہ مسیحی مبلغین تھے جو عالم اسلام میں تبلیغی مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے، اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات کی جو بگڑی ہوئی شکل انھوں نے تیار کی تھی وہ بت پرست یورپ کے موقف میں تاثیر اور قوت پیدا کرنے کے لیے تھی، ان کے یہاں یہ عقلی انحراف برقرار رہا حالانکہ استشراق بعد میں عیسائی مشنریوں سے آزاد ہو چکا تھا اور اب ان میں مذہبی جاہلیت اور اس کی حیثیت باقی نہ رہ گئی تھی، لیکن اسلام پر ان کے حملے ایک مزاجی خصوصیت اور موروثی روایت کی طرح صلیبی جنگوں کا نتیجہ تھے، جس نے اہل یورپ کے ذہنوں میں مزید نئے برگ و بار پیدا کر دیئے تھے۔ ❸

دراصل صلیبی جنگوں کے علاوہ خود اسلام بھی اہل یورپ کے لیے بقول لورلیس براؤن ایک خطرہ تھا، چنانچہ براؤن اپنی کتاب میں جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ:

---

❶ حوالہ سابق۔ ❷ ایضاً۔

❸ حوالہ سابق

اسلام کا یہ خطرہ اس کے نظام حیات میں چھپا ہوا ہے اور اس پروپیگنڈے میں کہ اس میں پھیلنے غالب آنے اور تازہ دم رہنے کی صلاحیت ہے، یورپی سامراج کے مقابلہ میں تنہا وہی ایک دیوار حائل ہے۔ ❶

مغربی دنیا پر اسلام کی طرف سے جو خوف طاری ہے، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اسلام مکہ میں ظاہر ہوا۔ تو تعداد کے اعتبار سے اس کی قوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اور اس کی اشاعت بڑھتی گئی۔ اس کا ایک رکن جہاد بھی ہے چنانچہ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم مسلمان ہونے کے بعد پھر عیسائی ہوگئی ہو، یہی بات جرمن مستشرق بیکر نے اس طرح کہی ہے کہ:

عیسائیت کو اسلام سے اس لیے عداوت ہے کہ قرون وسطیٰ میں اشاعت اسلام نے عیسائیت کی راہ روک دی، پھر اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا، جہاں کلیسا کا اثر واقتدار تھا۔ ❷

یورپ کا ایک دور تو وہ تھا، جب تعصب کے طوفان میں اسلام کی حقیقت اور رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کے بارے میں صحیح تعارف حاصل کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہ تھا، اس کے بعد یورپ کے دینی افکار میں اصلاح ہوئی، روشن خیالی کا دور آیا مذہب کو اسٹیٹ سے الگ کر دیا گیا اور بیسویں صدی کے حالات آئے، اس عرصہ میں علوم اسلامیہ اور خصوصاً سیرت رسول اکرم ﷺ پر، یورپ نے کئی نسلوں سے مسلسل کام کیا ہے، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے، ان میں سے ایک تعداد تو کلیسا سے وابستہ ہے اور مذہبی لباس پہنتی ہو۔ لیکن زیادہ تر لوگ عام شہری تھے کلیسا سے وظیفہ یاب نہ تھے، ان سے توقع تھی کہ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ان کا لب ولہجہ کچھ نرم پڑے گا، اور آپ ﷺ کی شخصیت تاریخ اور تعلیمات کے معاملہ میں ان کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئے گی، یہ تبدیلی آئی مگر صرف اس قدر کہ فحش انداز اور سب وشتم کے الفاظ ترک کر دیے گئے، کچھ تہذیب ومتانت پیدا ہوگئی، لیکن تحقیق کا معیار واسلوب اب بھی وہی رہا، جو پہلے تھا، ان کی تحقیقی خامیوں میں تین باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

---

❶ ایضاً۔
❷ حوالہ سابق۔

## مستشرقین کی پہلی غلطی

شک وشبہ پیدا کرنے میں مبالغہ سے کام لینا، بہت سی باتیں اپنی طرف سے فرض کر لینا، اپنے مخصوص ذوق اور رجحان طبع کی وجہ سے روایتوں کا انکار اور ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد مستشرقین کا یہ وہ بنیادی وصف ہے، جو ان میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ شک کی فضا پیدا کرتے ہوئے دور تک نکل جاتے ہیں، اور ایسی باتیں فرض کر لیتے ہیں جن کے لیے کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہوتی وہ اپنے مفروضہ کو بنیاد بنا کر بہت سی روایتوں کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ضعیف اور شاذ روایتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں، چنانچہ درمنگھم نے جو خود بھی ایک مستشرق ہے مستشرقین کے طرز عمل پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔

> ''واقعی یہ بات افسوس ناک ہے کہ مستشرقین میں سے کچھ ماہرین تنقید میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً مویر مارگولیتھ، نولدیکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی مارسین، گریم، گولڈزہیر، اور گولڈ فروا وغیرہ، ان کی کتابیں خاص طور پر تخریبی ہیں، مستشرقین جن نتائج تک پہنچے ہیں، وہ سلبی ہیں۔ حالانکہ سلبی انداز سے کوئی سوانح مرتب نہیں کی جاسکتی ہے، میری کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس کو سلسلہ وار متناقض بحثوں کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پادری لامانس سخت متعصب ہے۔ حالانکہ وہ دور جدید کے بہتر مستشرقین میں شمار کیا گیا ہے، اس نے اپنی بہتر تحقیقی کتابوں کو بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے نفرت کی بنا پر داغ دار کر دیا ہے اس مسیحی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے مطابق ہوتو ہو قرآن ہی سے ماخوذ سمجھی جائے گی حالانکہ دونوں کو ایک دوسرے کا مؤید بھی قرار دیا جاسکتا تھا، مگر وہ لازمی طور دونوں کے توافق کو دونوں کے ناقابل اعتبار ہونے کا ثبوت قرار دیتا ہے، اس انداز کی تحقیق سے تاریخ کی کوئی کتاب کیسے لکھی جاسکتی ہے؟ ❶

کچھ مستشرقین نے قرآن مجید کو سیرت کا ایک بنیادی ماخذ قرار دیا ہے، مگر اس طور پر کہ انھوں

❶ حیاۃ محمد ﷺ ا۔ مقدمہ ص ۸۔۱۱۔

نے قرآن کو اپنے مقاصد کے لیے دودھاری تلوار بنانے کی کوشش کی ہے، اس کا سلبی رخ تو یہ ہے کہ انھوں نے سیرت کے ان تمام واقعات کو قلم زد کر دیا ہے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ہے، گویا کہ قرآن مجید کوئی تاریخی کتاب ہے، جو رسول اکرم ﷺ کی سوانح نگاری کے لیے مرتب کی گئی ہو، ان کی مذکورۂ بالا تخریبی ذہنیت سیرت کے ہر ایسے واقعہ میں شک پیدا کرتی، یا اس کا انکار کر دیتی ہے، جس پر قرآن مجید میں کوئی تائیدی بیان نہ ہو، خاص طور پر اس وقت جب کہ اس واقعہ سے رسول اکرم ﷺ کی عظمت ثانیہ ہوتی ہو یا اس واقعہ کا انکار کر دینے سے استشراقی رجحانات کو تقویت ملے۔ مثلاً اسپرنگر کا خیال ہے کہ ''نبی ﷺ کا اسم گرامی قرآن مجید کی چار سورتوں (آل عمران، احزاب، محمد اور فتح) میں وارد ہوا ہے، اور یہ سورتیں مدنی ہیں، لہٰذا ہجرت سے پہلے رسول کے لیے محمد ﷺ کا لفظ علم کے طور پر نہیں تھا، عیسائیوں سے روابطہ پیدا ہونے اور انجیل کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے یہ نام اختیار کر لیا تھا۔ ❶ اسپرنگر سے ہمارا سوال یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے انجیل کی پیشین گوئیوں کو پڑھنے کے بعد اپنے لیے نام محمد چن لیا تو اصلی محمد جس کی عہد نامہ قدیم جدید نے بشارت دی تھی، وہ کہاں ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ یہودی قبیلہ بنو نضیر پر حملہ کی ایک وجہ عرب مؤرخین یہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ پر شب خون مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن اسرائیل ولفنسون یشیر کہتا ہے کہ مستشرقین مذکورۂ روایت کو صحیح قرار نہیں دیتے کیونکہ اس کا سورہ حشر کی ان آیتوں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، جو بنو نضیر کو جلاوطن کیے جانے کے بعد نازل ہوئی ہو۔ ❷

روایتوں میں تشکیک یا ان کو رد کر دینے کا مذکورہ عمل منٹگمری واٹ کے یہاں بھی زیر بحث آیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

> ''ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے جو ہمیں ماضی سے وراثت میں ملی ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم تمام حالات میں محمد ﷺ کی سچائی پر سختی سے قائم رہیں، جب تک کہ اس کے

---

❶ جواد علی۔ تاریخ العرب ج ۱ ص ۸۷ مع حواشی۔

❷ تاریخ الیہود فی البلاد العرب فی الجاہلیۃ وصدر اسلام ص ۱۲۵۔۱۲۷۔

خلاف کوئی دلیل قاطع نہ پائی جائے، ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ قطعی دلیل کے لیے اس کا صرف امکان ہی کافی نہیں ہے، سیرت جیسے موضوع پر اس کا حصول تو اور بھی زیادہ دشوار ہے۔ ❶

مستشرقین نے جن بے شمار واقعات کا انکار کیا ہے ہم اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتے ہیں مثلاً مدینہ پر یہود کی طرف سے مختلف عرب قبائل کو حملہ پر آمادہ کرنے کا بروکلمان نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، وہ غزوۂ خندق کے نازک حالات میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بنوقریظہ کی عہد شکنی کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے، اور صرف یہ لکھتا ہے کہ:

پھر مسلمانوں نے بنوقریظہ پر حملہ کر دیا جن کا رویہ بہر حال واضح نہ تھا۔ ❷

اس طرح اسرائیل ولفنسون نے غزوہ خندق میں نعیم بن مسعود کے کردار کا کوئی ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے مشرکوں اور یہودیوں میں بے اعتمادی پیدا ہوگئی۔ ❸ غالباً یہ یقین دلانے کے لیے کہ یہود نے دھوکہ نہیں دیا۔

مستشرقین ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد کرتے ہیں جو تنقید کی کسوٹی پر بے بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر جواد علی، ان مستشرقین نے اکثر ضعیف خبروں کو قبول کر کے ان کے مطابق فیصلے کیے ہیں، مشہور اور معروف روایتوں کے مقابلہ میں شاذ اور غریب روایتوں کو ترجیح دی ہے اس روایت کو جو متاخر ہو، یا ماہرین نقد نے اس کی غرابت کا حکم دیا، اور اس کے شذوذ کا فیصلہ کیا ہے، مگر یہ مستشرقین عملاً اسی کو اختیار کرتے ہیں، کیونکہ شبہات کی فضا پیدا کرنے میں وہی ان کا ایک تنہا وسیلہ ہیں۔ ❹

## دوسری غلطی

تاریخی واقعات پر مصنوعی سیکولر حالات اور معاصر ماحول کا عکس ڈالنے کی کوشش کی، ایمتین ڈینیہ نے صراحت کی ہے کہ ''مستشرقین کے لیے اپنے جذبات، ماحول اور مختلف رجحانات سے کنارہ کش ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہے نبی (ﷺ) اور آپ کے صحابہ کے حالات میں ان مستشرقین

---

❶ محمد ص ۹۴۔
❷ تاریخ الشعوب الاسلامیہ ص ۵۳۔۵۴۔
❸ مجلۃ العرب ص ۱۴۵۔۱۴۶۔
❹ تاریخ العرب فی الاسلام۔ ج ا ص ۱۰۸۔

نے اس قدر تحریف سے کام لیا ہے کہ ان کی حقیقی تصویر نظروں سے اوجھل ہوگئی، وہ اگرچہ تنقید کے منصفانہ اسلوب اور تحقیق کے سنجیدہ علمی اصولوں کی پیروی کا دم بھرتے ہیں، لیکن ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر مؤلف جرمن ہے۔تو محمد ﷺ جرمن اسلوب میں کلام کرتے تھے، اور مؤلف اطالوی ہے،تو آپ گویا اٹلی والوں کے طرز پر گفتگو کیا کرتے، کیونکہ ہر ایسے مقالہ نگار کی شہریت تبدیل ہونے کی وجہ سے محمد (ﷺ) کی تصویر بھی بدلتی چلی جاتی ہے، چنانچہ ان تحریروں کے آئینہ میں محمد ﷺ کی حقیقی تصویر دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس بارے میں مایوسی ہوگی، مستشرقین ہمارے سامنے خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں جنھیں حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اتنا تعلق بھی نہیں جتنا ان تاریخی کہانیوں کے کردار میں ہے جن کو والٹر اسکاٹ یا اسکندر دیماس وغیرہ نے ترتیب دیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے اپنے ہم وطنوں کے حالات تحریر کیے ہیں، جن میں صرف زمانی فرق کا لحاظ رکھنا ضروری تھا، مگر مستشرقین سیرت نبوی ﷺ کی شخصیتوں کو ان کے حقیقی رنگ میں نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے اپنے مغربی خطہ اور عصری خیالات کی روشنی ہی میں سیرت کے افراد کو پیش کیا ہے۔ ایتین ڈینیہ ایک برعکس مثال دے کر اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:

”اگر اقصائے چین کا کوئی عالم ان تضادات کا جائزہ لے جو فرانسیسی مؤرخوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں، اور مشرق بعید کے آئینہ میں ان کی چھان بین کرے اور کارڈینیل ریشلیو کی کہانی کی اُن بنیادوں کو جن سے ہم واقف ہیں ختم کردے اور ریشلیو کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرے جیسا کہ بیکن نے کیا ہے، ایک کاہن کی صفات طبیعت اور مزاج رکھنے والا ریشلیو تو یورپ والے ریشلیو کی یہ تصویر دیکھ کر کیا رائے قائم کریں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ دور جدید کے مستشرقین نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت بیان کرتے ہوئے ایسے ہی غلط نتائج اخذ کیے ہیں، ان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ محمد ﷺ مستشرقین کی تحریروں میں جرمن، انگلش یا فرنچ لب ولہجہ اور محاورات میں گفتگو کرتے رہے ہوں ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ عربی زبان کے مزاج اور محاوروں کے مطابق عربوں سے ہم کلام رہے ہوں۔“

یہ فرانسیسی مستشرق ایتین ڈینیہ جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ آخر میں لکھتا ہے کہ:

"ہمارے جلیل القدر نبی ﷺ کی شخصیت، اسلامی روایات کی رو سے نہایت ہی بلند اور رافع ہے، اس مصنوعی شخصیت کے مقابلہ میں جس کی روشنی کو اہل مغرب نے اپنی درس گاہوں میں بڑی جدوجہد کے بعد کم کر دیا ہے۔" ❶

کیتانی ان بڑے مستشرقین میں ہے جنھوں نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت پر ابتداء میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن بقول ڈاکٹر جواد علی وہ تحقیق میں مخالفانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ تاریخ عربی کے میدان میں ان جدید ماہرین فن کی طرح جو غلط بنیادوں پر اپنی تحقیق کو استوار کرتے ہیں، یہ لوگ پہلے ہی سے ایک خیال کو جنم دیتے ہیں، پھر تاریخی واقعات کی چھان بین کرتے ہیں تا کہ اپنے نظریہ کو یہ ثابت کر سکیں، اور دوسرے خیالات کو قریب بھی نہ آنے دیں۔ کیتانی نے تدوین سیرت کا کام کرنے سے پہلے ہی اپنا ایک نظریہ وخیال گھڑ لیا، اور پھر اس کی تائید کے لیے اپنی کتاب میں ایسی روایات درج کیں جن سے اس کو کچھ بھی مدد ملتی ہو، وہ روایات قوی ہوں یا ضعیف، اس کو اپنی رائے کو ثابت کرنے سے غرض تھی، نہ کہ اس بات سے کہ وہ روایت ضعیف ہے، بلکہ وہ ضعیف روایتوں کو توثیق کرتا، اور ان کو حجت قرار دیتا ہے۔ ان کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے، اہل علم کے یہاں صحیح اور غلط روایتوں کے جو سلسلے مشہور ہیں، ان کو وہ جانتا ہوگا، لیکن ضعیف روایتوں کو قبول کرتے ہوئے وہ علماء کے خیالات سے صرف نظر کر لیتا ہے، اس نے چونکہ پہلے سے ایک خیال کو اپنے دل ودماغ میں پیدا کر لیا ہے اس لیے ہر طرح اسی کو ثابت کرنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے، وہ اگر بحث کے جدید طریقوں کے مطابق ان روایتوں پر نقد وجرح سے کام لیتا تو اپنے مزعومہ خیالات کو ثابت کرنا اور انھیں درج کتاب کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔ ❷

"ڈاکٹر ہیر گرنجہ نے صحیح لکھا ہے کہ "محمد ﷺ کے جدید سوانح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تاریخی تحقیقات بے اثر اور بے نتیجہ ہیں، جن کو کسی خاص نظریہ یا پیشگی تصورات کا تابع بنا دیا جائے"، یہ بات اس زمانہ کے مستشرقین کو پیش نظر رکھنی چاہیے، تا کہ وہ

❶ محمد رسول اکرم ﷺ مقدمہ۔ ص ۳۷۔ ۳۸، ۴۳، ۴۴۔

❷ تاریخ العرب فی الاسلام، ج: ص ۹۵۔

گزشتہ طرزِ عمل کی ان بیماریوں سے محفوظ رہیں جن میں ساری توانائی صرف کرنے کے بعد بھی ان کی رسائی غلط نتائج ہی تک ہو پاتی ہے، وہ کسی خیال کی تائید کے لیے پہلے تو کچھ واقعات کی تردید کرتے ہیں، جو کہ آسان نہیں، پھر ان سے پیدا ہونے والے خلا کر پر کرنے کے لیے ایسی نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، جو ناممکن ہوں، بیسویں صدی میں دنیا کے علم کو اصل حقائق تک رسائی کے لیے چند بنیادی اسباب وعوامل سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً زمانہ، ماحول، علاقہ، رسوم وروایات، ضرورتیں، رجحانات اور حوصلہ مندانہ جذبات وغیرہ خاص طور پر ان داخلی صلاحیتوں اور قوتوں کا علم بھی ضروری ہے، جن کو منطق کے پیمانہ سے ناپا نہیں جاسکتا، مگر انھیں سے متاثر ہوکر مختلف افراد اور گروہ عمل کے میدان میں رواں دواں ہوتے ہیں۔'' ❶

مزید براں، مصنوعی سیکولر کردار اور اس مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے جس نے ہماری تاریخ کے بارے میں مغربی رویہ کو متاثر کیا ہے، مستشرقین ایک اور غلطی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بات ہرگز نہ تھی کہ رسول اکرم ﷺ کو اپنے اقدامات کے ممکن نتائج کا پہلے سے علم رہتا ہو، بلکہ وہ اپنے سامنے کے حالات، اور ان کے تقاضوں ہی کو دیکھ کر اپنی دلچسپیوں کے کاموں کا انتخاب کرلیا کرتے تھے، چنانچہ اس دعویٰ کا ایک نمایاں ثبوت غالباً وہ بحث ہے جو فلہاوزن اور اس کے رفقائے کار نے چھیڑی ہے۔ وہ مکی دور میں تحریک اسلامی کے مقامی اثرات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اسلام ابھی مدنی دور میں داخل نہیں ہوا تھا، جو اسلام کی بین الاقوامی دعوت وتحریک کا زمانہ ہے، اس لیے رسول اکرم ﷺ نے ان حالات کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا، جو ابھی تک پردہ خفا میں تھے، ان کے خیال میں رسول اکرم ﷺ نے مکی دور میں عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا تھا، لیکن جب مدینہ میں منتقل ہوکر انھوں نے حکومت قائم کرلی، اور ان کے اردگرد جنگ باز اکٹھا ہوگئے تو ان کے اسلوب میں سختی اور طاقت آگئی، فلہاوزن کا خیال یہ ہے کہ محمد ﷺ اپنے عقیدہ کے ذریعہ خونی رشتہ کے حصار سے نکل کر اپنے معتقدین کے حلقہ کو وسیع کرسکتے تھے،

❶ محمد رسول اکرم ﷺ مقدمہ ۴۳۔۴۴۔

کیونکہ خونی رشتہ عصبیت اور تنگی کا رشتہ تھا، جس میں دوسروں کے لیے کوئی کشش نہ تھی، لیکن اس رشتہ کو نظر انداز کر کے خالص دینی رشتہ کی وسعتوں کا محمد ﷺ کو اندازہ نہ تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک طبقہ جو اس رشتہ سے وابستہ نہ تھا، اس کو محمد ﷺ اپنے قریب نہ کر سکے۔ ❶

فلہاوزن کے نظریہ کو سر ٹامس آرنلڈ نے اپنی کتاب ''دعوت اسلام'' میں غلط قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

> ''یہ ایک عجیب بات ہے، کہ کچھ مورخوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ابتداء میں دین اسلام کی عالمی ہونے کا تخیل، پیغمبر اسلام کے ذہن میں نہ تھا، حالانکہ قرآن مجید کی متعدد آیات اس دعویٰ کی تردید کرتی ہیں۔ ❷

سر ولیم میور کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ نبی ﷺ کو اپنے پیغام کے بارے میں عالمی ہونے کا خیال بعد میں آیا، جب کہ بہت سی آیتوں اور حدیثوں میں یہ خیال موجود تھا، لیکن اس بارے میں محمد ﷺ نے غور نہیں کیا، اور اگر غور کیا بھی ہو تو یہ زیادہ واضح نہیں تھا، اس لیے کہ وہ جس دنیا میں رہ کر غور و فکر کرتے تھے، وہ عرب کی سرزمین تھی، اور دین جدید اسی علاقے کے لیے وضع کیا گیا تھا، محمد ﷺ نے آغاز بعثت سے اپنی وفات تک صرف عربوں ہی کو اپنا مخاطب بنایا تھا، دوسروں کو نہیں، چنانچہ ہمارا خیال یہ ہے کہ اسلام میں بین اقوامیہ کی جو بنیاد پڑی اور پھر وہ برگ و بار لائی تو یہ کسی منصوبہ کے تحت نہیں بلکہ حالات و ماحول کا نتیجہ تھا۔ ❸ سر ولیم میور کے خیال پر نقد کرتے ہوئے آرنلڈ نے یہ جواب دیا ہے کہ:

> اسلام کا پیغام عربوں تک محدود نہ تھا اس میں پوری دنیا شریک تھی صرف ایک اللہ اور ایک ہی دین کی طرف تمام لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔ ❹

---

❶ الدولۃ والعربیہ وسقوطہا، ص ۴۔

❷ آرنلڈ نے درج ذیل آیتوں سے استدلال کیا ہے۔ سورۃ ۔ ۳۶ آیت ۶۹ ۔ ۷۰ وسورہ ۲۱ آیت ۱۰۷ ۔ سورہ ۲۵ آیت ۱، سورہ ۲۴ آیت ۷ ۔ سورہ ۶۱ آیت ۹ ۔

❸ آرنلڈ ۔ الدعوۃ الی الاسلام حاشیہ نمبر ۲ ص ۴۹ ۔ ۵۰ ۔

❹ آرنلڈ، الدعوۃ فی الاسلام حاشیہ ۔

مستشرقین کی مذکورہ غلطی پر آرنلڈ کے علاوہ گولڈزہیر، نولدیکی اور سخاؤ نے بھی گرفت کی ہے سخاؤ نے اس بات پر زور دیا ہو کہ پیغام الٰہی عرب تک محدود نہ تھا، مشیت الٰہی ساری مخلوق کو محیط ہے، اس لیے ساری انسانیت کو اس کے سامنے سرنگوں رہنا تھا، اللہ کی طرف سے رسول ہونے کی بنا پر محمد ﷺ اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب تھے، ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا، انھیں جن اصولوں پر عمل کرنا تھا، وہ جزئی حیثیت سے ابتداء ہی میں منظر عام پر آ چکے تھے۔ ❶

کچھ مستشرقین اور خصوصاً سرولیم میور نے ولہاسن سے مستفید ہو کر غزوۂ بنو قریظہ کے ذکر میں یہ لکھا ہے کہ حالات ساز گار ہوتے ہی محمد ﷺ نے طاقت کا سہارا لے لیا۔ ❷ آرنلڈ نے اس خیال کی تردید تو کی ہے، مگر خود ایک غلطی کا شکار ہو گیا یہ لکھ کر کہ:

''محمد ﷺ ایک دین جدید کی تاسیس کی خواہاں تھے، جس میں وہ کامیاب ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے ایک ایسا سیاسی نظام بھی دیا جو اپنی واضح خوبیوں کی وجہ سے بالکل ہی نیا تھا۔ ابتداء میں ان کی خواہش صرف یہ تھی کہ اپنے ہم وطنوں کی توحید الٰہی کی دعوت دیں۔ ❸

## مطالعہ سیرت کے لیے بنیادی شرط

سیرت فہمی...... کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی تحریک قدم بہ قدم، اللہ تعالی کے بنائے ہوئے کامل منصوبے کے مطابق اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھتی رہی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس پروگرام کو صرف عملی شکل دی، اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں آپ ﷺ کی صلاحیتیں، آپ کے اخلاق، آپ کی ذہانت، آپ کی منصوبہ بندی اور قوت تنفید پوری طرح جلوہ گر ہوئی، قرآن مجید کی آیتیں مختلف وقتوں میں خاص خاص مقدار میں نازل ہوتی رہیں، تاکہ مختلف...... واقعات اور حالات میں ان پر عمل کیا جا سکے، مگر قرآن نظریاتی عقیدہ کی جن تفصیلات کو پیش کر رہا تھا، وہ پیشگی طور پر علم الٰہی کے موافق کامل اور متعین اصولوں پر مبنی تھیں، ان کی روشنی میں سیرت پاک کی تشکیل بھی منصوبہ الٰہی کے مطابق ہوئی اس لیے

❶ ص ۲۸۔ ❷ ایضاً حاشیہ۔

❸ الدعوۃ فی الاسلام حاشیہ، ص ۵۲۔

سیرت پر حالت اور ماحول کے اثر کا افسانہ غلط ہے، تحریک اسلامی کی رفتار اور رسول اکرم ﷺ کے اقدامات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مقصد کو اہمیت دے جس کے لیے زمانہ کے عرف اور حالات سے معرکہ آرائی اور ماحول سے کشمکش کا سامنا کرنا پڑا، یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ جاہلیت پر رسول اکرم ﷺ کا پہلا حملہ اس وقت ہوا جب آپ نے لا الہ الا اللہ کی دعوت دینی شروع کی وہ کون سے حالات تھے، جن کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے ایسا انقلابی اور مکمل نعرہ دیا جو جاہلیت کے سارے وجود کو اس کی تمام قدروں، بنیادی مقاصد، امتیازات رسوم وروایات اور اس کی معنویت ہی کو ختم کیے دے رہا تھا؟ ٹامس آرنلڈ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ یوں لکھا ہے۔

> ''یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اسلام واضح طور پر بت پرست عربی خطہ میں ایک جدید تحریک بن کر ظاہر ہوا، دونوں کی پیدا کردہ سوسائٹیوں میں اخلاقی قدروں کے درمیان کس قدر تضادات تھے، عربی معاشرہ میں اسلام کی آمد سے چند جاہلانہ رسموں ہی پر زد نہیں پڑی۔ بلکہ زندگی کی گزشتہ ساری روایتوں اور قدروں میں مکمل انقلاب آ گیا، واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی دعوت کے بنیادی مقاصد اس وقت تک عربوں کے نقطہ نظر اور طرز زندگی کے برعکس تھے، عرب اپنے نظریات اور رسوم کی تعظیم اور تقدیس کرتے تھے، اور انھیں اس بات کی اچھی طرح خبر تھی کہ پہلے وہ جن کاموں کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اسلام لانے کے بعد ان کو اب احترام کی نظر سے دیکھنا ہو گا۔'' ❶

قرآن ایک بلند اور بالاتر ہدایت نامہ ہے اس کی آیتیں ہر زمان ومکان اور نئے دور کے لیے انسانوں کی راہنمائی کا فرض انجام دیتی ہیں۔ قرآن مجید سلبی یا ایجابی طریقہ سے کسی صورت حال سے متاثر نہیں ہوتا ہے، حالانکہ مسیحی اور مادہ پرست مستشرقین کی اکثریت اسی خام خیالی میں مبتلا ہے، قرآن مجید کسی ردعمل کا آئینہ نہیں ہے وہ تو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دراصل یہی وہ پہلو ہے

❶ الدعوۃ الی الاسلام، ص ۶۲۔۶۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے گولڈ زیہر کی کتاب۔

جس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے استشراقی تحقیقات لغزشوں اور غلطیوں کے خاردار میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔

مغربی محققین سے ہمارا یہ مطالبہ نہیں ہے، کہ وہ قرآن کو کتاب اللہ اور محمد رسول اکرم ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کر کے اپنی تحقیق کا آغاز کریں، لیکن ان سے ہماری یہ خواہش ضرور ہے، کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات سے مجرد ہو کر خالص معروضی طریقہ اختیار کریں اور پھر سیرت رسول کا ایک وحدت کی صورت میں اور قرآن مجید کا ایک عقیدہ پر استوار سے ہم آہنگ پروگرام کی طرح مطالعہ کریں۔ جو وقتی حالات سے بالاتر تھا، اس میں اگرچہ زمان و مکان کے وقتی حادثات کا ذکر ہے لیکن ان کے پس منظر میں جو قدریں اور ہدایات ہیں، ان کی جامعیت اور عمومیت سے مستشرقین کو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

## مستشرقین کی تیسری غلطی

سیرت طیبہ کے افادی پہلوؤں کو مسیحی یا یہودی ماخذ کی طرف منسوب کرنا یہ تیسری غلطی بھی مستشرقین کے یہاں عام ہے، انھوں نے اپنے اسی خیال خام کی روشنی میں واقعات سیرت اور نبوت کا مطالعہ کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر جواد علی نے اس کے درج ذیل اسباب بیان کیے ہیں۔

> مسیحی مستشرقین کی اکثریت مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے یا مذہبی درس گاہوں کی تعلیم یافتہ ہے، وہ اسلام کے بنیادی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا اصل ماخذ مسیحیت کو قرار دیں، اسی طرح اسرائیلی حکومت کے قیام اور صیہونیت کے غلبہ کے بعد یہودی مستشرقین کی بھی یہی کوشش رہی کہ عربی اور اسلامی روایات و امتیازات کو یہودی الاصل ثابت کریں اپنے طرز عمل میں دونوں گروہ اپنے ذاتی رجحانات اور مذہبی جذبات کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔ ❶

## اسلام اور مسیحیت کا فرق

طیباوی نے استشراقی ذہنیت اور اس کے مذہبی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور مسیحیت میں کئی موقعوں پر

---

❶ تاریخ العرب فی الاسلام ج ۱ ص ۹۔۱۱۔

یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان بنیادی فرق واضح ہوجاتا ہے، ماضی میں عیسائی مشنریاں اور زمانہ حال میں اکاڈمیوں کی سطح پر مستشرقین نے اس یکسانیت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ محمد ﷺ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ دین دار مسلمان، مسیح کی کس قدر تعظیم کرتے ہیں ہینگن کے سلسلہ کی ایک کتاب میں ایک مستشرق نے جو پادری ہے انقلابی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ اسلام مسیحیت ہی کی صحیح یا تحریف شدہ تصویر ہے، ایک اور مذہبی شخص (ولفرڈ کنٹیول اسمتھ) نے سرسری انداز میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان یکسانیت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

''مسلمانوں اور عیسائیوں میں دوری کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے عقیدہ کو اپنے ایمان وعقیدہ کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔'' ❶

لیکن یہ تجزیہ درست نہیں، کیونکہ صدیوں سے عیسائیوں ہی نے اپنے مذہبی اصولوں کی روشنی میں اسلام کو سمجھنے یا دوسرے لفظوں میں اسے غلط طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائیت کے بارے میں مسلمانوں کا نقطہ نظر ابتدا ہی سے ایک رہا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی رائے قرآن سے ماخوذ تھی جو وحی الٰہی ہے، اس کے برعکس عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں جو تصریحات ہیں وہ ایک مسلمان کا نقطہ نظر قبول کرنے میں حائل نہیں ہیں، مگر مسیحیت یا اسلام دونوں کے بارے میں ایک مسلمان کے نقطہ نظر کو یہ مستشرقین رد کر دیتے ہیں، چنانچہ لندن یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے ایک مسیحی مبلغ انصاف اور معروضیت کے دعویٰ کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں صحیح معلومات پیش کر رہا ہے، اس کے باوجود وہ لکھتا ہے کہ:

''اس بارے میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ محمد ﷺ نے تلوار اور کئی تحریف شدہ، مصدر سے اپنے خیالات اخذ کیے ہیں، مسیحیت کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ غالباً محمد ﷺ نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔''

اس مبلغ مسیحیت کی معروضیت بے نقاب ہوجاتی ہے، اگر ہم اس کے لیکچر کا یہ اختتامی فقرہ بھی

❶ ڈاکٹر محمد البہی: الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۹۳۔۶۰۱۔

پڑھ لیں۔

''ایک تعلیم یافتہ آدمی کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کروڑوں مسلمانوں کے نقطہ نظر کے مطابق اگر دہندہ مسیح کی انجیل کو پیش کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ❶

تو کیا تبلیغی ضرورت سے انجیل میں ترمیم وتغیر کا جواز پیش کرنے والے کی حقیقت پسندی اور معروضیت کا یہی معیار ہے وہ انجیل کے ساتھ جو بھی طرز عمل اختیار کریں مگر مسلمان قرآن کو مقدس امانت الٰہی سمجھتا ہے جس میں تحریف اور ترمیم کا نہ پہلے کوئی امکان تھا، اور نہ آئندہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کرسکتا ہے۔

## استشراق کا مخالفانہ طرز عمل

استشراقی فکر جس مذہبی پیچیدگی کا شکار ہے، اس میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالف قوتوں کی ہر موقع پر ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ سے غیر جانب داری کے ساتھ صحیح فیصلہ تک پہنچنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ مارگولیتھ، ولہاسن اور بروکلمان کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً بروکلمان کہتا ہے کہ:

''کچھ ہی مدت کے بعد محمد ﷺ اور علمائے یہود کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ ان کے پاس اگرچہ اس دور دراز علاقہ میں زیادہ علم نہیں تھا، تاہم وہ رسمی علوم اور ذکاوت نبی امی سے بڑھ کر تھے۔'' ❷

احد میں محمد ﷺ کی فوجی مہارت پر ضرب پڑنے کی وجہ سے جو نقصان ہوا اس کی تلافی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے یہودیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، اور ایک معمولی سبب کی وجہ سے بنونضیر پر حملہ کردیا۔ ❸

---

❶ ڈاکٹر محمد البہی۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۶۳۔۶۰۱۔

❷ کاول بروکلمان تاریخ الشعوب اسلامیہ میں، ص ۴۷ ترجمہ فارس اور لعلبکی طبع پنجم دار العلم علماء بین قاہرہ ۱۹۶۸ء۔

❸ کاول بروکلمان تاریخ الشعوب اسلامیہ میں، ص ۴۰ ترجمہ فارس اور لعلبکی طبع پنجم دار العلم علماء بین قاہرہ ۱۹۲۸ء ص ۵۳۔

ولہاسن نے بھی یہی بات کہی ہے کہ:

"غزوۂ بدر کے بعد اسلام نے رواداری ترک کر دی۔ اور مدینہ میں اپنی دہشت پسندی کا آغاز کر دیا۔ منافقوں کا مسئلہ، سیاست میں ایک نئے موڑ کی علامت تھا، یہود کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا کہ انھوں نے عہد شکنی کی ہے، اور چند ہی سالوں میں مدینہ کے گرد و پیش مخ۔ ب بستیوں میں آباد یہودی گروہوں کو جلا وطن کر دیا گیا یا ان کو ختم کر دیا گیا، حالانکہ وہ عربی قبائل کی طرح وہاں یک جا آباد تھے، مگر ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے معمولی اسباب ہی کو کافی سمجھ لیا گیا۔" ❶

مارگولیتھ بھی یہودیوں پر مہربان ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں پر حملہ ظالمانہ کارروائی تھی اور اس کو کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا، اس کا بیان یہ ہے کہ محمد ﷺ نے ہجرت کے بعد چھ سال غارت گری میں صرف کیے، مکہ پر غارت گری کا جواز تو یہ ہے کہ وہ ان کا وطن اور جائے پیدائش تھا، وہاں ان کی املاک کو برباد کیا گیا اور ان کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ مدینہ کے یہودی قبائل کا بھی یہی معاملہ تھا کہ حقیقی یا فرضی اسباب کی وجہ سے ان سے انتقام لیا گیا، مگر خیبر مدینہ سے کافی فاصلہ پر تھا انھوں نے محمد ﷺ یا مسلمانوں کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جس کو ان سب کی طرف سے زیادتی تصور کیا جائے۔ ان میں سے کسی ایک کا محمد ﷺ کے بھیجے ہوئے قاصد کو قتل کر دینا۔ ان سب کے حق میں انتقامی کاروائی کو جائز قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، یہ کارروائی محمد ﷺ کی سیاست میں بڑی تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے، مدینہ میں تو شروع میں انھوں نے یہود کے ساتھ مسلمانوں کی طرح برتاؤ کرنے کا اعلان کیا۔ مگر جنگ کے بعد ان کا طرز عمل بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ اب کسی گروہ پر حملہ آور ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے مسلسل حملہ آور ہونے کے بارے میں محمد ﷺ کے جذبات وہی ہو گئے تھے۔ جو ہم ان سے پہلے سکندر یونانی میں یا ان کے بعد نپولین میں دیکھتے ہیں، خیبر پر محمد ﷺ کے قبضہ سے یہ بات واضح

❶ ولہاسن الدولۃ العربیہ وسقوطہا ص ۱۵۔ ۱۶ ترجمہ محمد عبدالہادی قاہرہ ۱۹۶۸ء۔

ہوگئی کہ پوری دنیا کے لیے اسلام کس حد تک خطرہ بن چکا تھا۔ ❶

یہ مستشرقین اسلام کے خلاف بت پرست عربوں کے لیے مہربانی اور شفقت کے جذبات رکھتے ہیں حالانکہ بت پرستی اول وآخر رجعت پسندی کی علامت بن گئی تھی، مگر مستشرقین کا رویہ دیکھ کر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یعنی یہود خیبر کے نقش قدم پر جمے ہوئے ہیں، انھوں نے قریش کے لیڈروں کے ساتھ مل کر یہ حلفیہ بیان دیا تھا کہ دین محمد ﷺ کے مقابلہ میں بت پرستوں کا مذہب بہتر ہے، اور وہی حق پر ہیں۔ ❷

یقیناً یہود خیبر کا موقف اور مستشرقین کا طرز عمل دونوں یکساں اور واضح ہیں۔

بروکلمان کی رائے یہ ہے کہ:

''مشرکین پر براہ راست اور مسلسل حملوں کا آغاز کرنے میں رسول اکرم ﷺ کے سامنے حالات نے چند رکاوٹیں کھڑی کر دیں، قریش کا قدیم نسبی شرف مہاجرین کو ان پر حملہ آور ہونے سے روکے ہوئے تھا، اور مدنی باشندوں کو اپنے طاقتور پڑوسیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں بدامنی اور انتشار کا خطرہ تھا۔ اس لیے ان کو بھی قریش سے جنگ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہ تھی، مگر رجب کا محترم مہینہ آیا تو رسول اکرم ﷺ نے خفیہ طور پر ہدایات دے کر غازیوں کا ایک دستہ تجارتی قافلہ کو اچانک لوٹ لینے کے لیے روانہ کیا جو فوجی دستہ اس قافلہ کے تحفظ کے لیے ساتھ تھا، وہ اس مہینہ کی حرمت کی وجہ سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا تھا، چنانچہ غازیوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور وہ اس کو لے کر مدینہ آئے قبائلی قانون کی اس خلاف ورزی پر مدینہ میں جب مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اگرچہ مذکورہ کاروائی محمد ﷺ کی خواہش پر ہوئی تھی، مگر انھوں نے اپنے پیرووں کی کارگزاری پر نکیر کی اور یہ تاثر دیا کہ انھوں نے

---

❶ محمد اینڈ دی رائزن آف اسلام ص ۳۔ ۳۶۲۔

❷ ابن ہشام: تہذیب ص، ۲۰ الواقدی المغازی ص ۴۲۔ ۲۳۱ تحقیق مارسڈن جونس آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۳ء۔

ہدایات کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا تھا۔ ❶

نولدیکی یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش عرب قبائل اپنی روایات ورسوم اور اپنی آزادی کی طرف سے دفاع کرنے کے لیے محمد ﷺ کے خلاف آپس میں کوئی اہم معاہدہ کر لیتے تو ان کے خلاف محمد ﷺ کا جہاد بے اثر ہو جاتا مگر مختلف قبیلوں کو یکجا اور متحد کرنے میں کسی بھی عرب کی ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام قبیلوں کو ایک ایک کر کے شکست دیتے اور خود فتح یاب ہونے کا موقع مل گیا، کہیں طاقت کے بل پر اور کہیں دوستی اور امن کے معاہدوں کے ذریعہ۔ ❷

چند مستشرقین نے تاریخ اسلام کے بعض مخفی گوشوں کو واضح کیا ہے، مگر چونکہ ان کا تحقیقی پس منظر صحیح نہ تھا، اس لیے ان کے تحقیقی انکشافات لغزشوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کے انبار میں ڈوب گئے ہیں مگر تمام مستشرقین یکساں نہیں ہیں، ان میں ایک تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے حق اور انصاف کی خاطر اپنی آواز بلند کی ہے، اپنے ہم پیشہ مستشرقین کا بہتر انداز میں تنقیدی جائزہ لیا، اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جیسا کہ ہم نے ڈیفیہ واٹ، درمنگھم اور آرنلڈ کے مختلف اقتباسات میں اس کی مثالیں پیش کی ہیں، مگر اس کے باوجود ان کے نقطہ نظر کو ہم پورے طور پر پاکیزہ علمی اسلوب کا نمونہ قرار نہیں دے سکتے اور ان کے لیے یہ بات ممکن بھی نہیں ہے۔

### ایک اور نقطہ نظر

موجودہ صدی کی ابتداء اور روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد رسول اکرم ﷺ اور اسلامی تاریخ کے بارے میں ایک نیا نقطہ نظر پیدا ہوا، سیرت کے واقعات کو تاریخ کی مادی تعبیر اور اس کے اصولوں کا تابع بنا دیا گیا، حالات اور واقعات ان اصولوں کے مطابق ہوئے تو ان کو قبول کر لیا گیا، اور جو واقعات متصادم معلوم ہوئے، ان کو نظر انداز کرنے یا رد کرنے کی کوشش کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ جن پہلوؤں یا واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے، وہ قابل قبول حصہ کے مقابلہ میں ۹/۱۰ سے زیادہ ہیں، واقعات سیرت کی توجیہ وتاویل اور ان کی اپنے اصولوں کے مطابق تشریح کرنے میں اگر ناکامی ہوئی

❶ تاریخ الشعوب الاسلامیہ ص ۴۳۔
❷ تاریخ العالم للمؤرخین ج ۸ ص ۱۱۔

تو انھوں نے قطع وبرید سے کام لیا، اور دور از کار تاویلات کے ذریعہ اپنی مطلب برآری کی کوشش کی، اپنے فلسفہ اور اصل واقعات کے درمیان تطبیق دینے کے لیے، انھوں نے یک طرفہ انداز میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں وہ ایک دوسرے سے بھی قطعی مختلف ہیں حالانکہ سب ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اور تاریخ کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یکساں ہونے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ جدلیاتی فلسفہ پر ایمان کی وجہ سے ان میں ہر شخص دوسرے کے برعکس رائے رکھتا ہے، وہ ایک دوسرے سے اختلاف وجدال کے بعد شاید متوقع اتحاد اور موہوم یکسانیت کی طرف رواں دواں ہیں، بہرحال اس موقع پر ہم بطور مثال سیرت رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ان کے چند اقوال پیش کر رہے ہیں۔

روسی استشراق کے کچھ نمائندوں کی رائے یہ ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں عربوں نے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا ابتدائی منظر دیکھا جو غلامی کا قائل تھا، ہیجل فسکائی کے خیال میں قرآن مجید کو اس بات کا شعور ہے کہ غلامی کے رواج کو ایک مرحلہ میں قائم رکھا جائے مگر ہجیل فسکائی آگے ذکر، بلائیف کی اس بات سے متفق ہوجاتا ہے کہ عربوں میں جاگیرداروں کا دور، دوسری قوموں سے ان کے روابط کا نتیجہ ہے، مگر بعض روسی اہل قلم یہ لکھتے ہیں کہ عملی طور اسی زمانہ میں جاگیردارانہ معاشرہ کی تشکیل ہونی شروع ہوئی یہ اہل قلم اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے انتشار کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ جس میں کلائی مورگیگ بھی شامل ہے یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ملکیت اور اور جاگیردارانہ تعیش کے ذریعہ استحصال کرنے والوں کے لیے سازگار ہے۔ ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ یہ سازگاری صرف غلامی سے انتقاع کی حد تک ہے، لیکن بلائیف وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ قرآنی اسلام حکمران طبقوں کے سیاسی اور اجتماعی مفادات کے لیے سازگار نہیں ہے، اس لیے جدید طبقاتی استحصال کو گوارا بنانے کے لیے مسلمانوں کو وضع حدیث کا سہارا لینا پڑا، روسی مستشرقین کے ایک طبقہ کے نزدیک تعیش پسندی نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عرب قبیلوں کو متحد کر دیا تھا، جب کہ ایک دوسرے طبقہ کا خیال یہ ہے کہ عربی قبائل اتحاد کے لیے جست لگانے ہی والے تھے کہ اسلام نے آکر ان کی امنگوں کو پورا کیا، اور ان کو متحد کر دیا تاریخ عالم میں زمانہ اسلام

کا ذکر آتے ہی روس کے ان مستشرقین کا رویہ پراگندہ ہو جاتا ہے، کلائی مونگ کا دعویٰ ہے کہ محمد ﷺ ان چند نبیوں میں ہیں جنھوں نے توحید کی خوش خبری دی اس توحید سے ان کا قصد قبیلوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا، دوسری طرف ٹالس ٹوف، نبی عربی ﷺ کے وجود کی نفی کرتا اور آپ کو ایک خیالی شخصیت قرار دیتا ہے دوسرے اہل قلم ظہور اسلام کے واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں، مگر کلائی مودنگ کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا بڑا حصہ بعد میں اور جاگیرداروں کے مفاد میں وجود پذیر ہوا ہے اس کے نزدیک محمد ﷺ کے معجزانہ اثرات کی وجہ سے اصول اسلام کی ترتیب عمل میں کی ہے ٹالس ٹوف کا کہنا یہ ہے کہ حکمران طبقہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے دور خلافت میں جو خیالی افسانے گھڑ لیے گئے تھے، انھیں کے تانے بانے سے اسلام کی نشوونما ہوئی، یہ خیالی افسانے گذشتہ عقیدوں سے ماخوذ تھے جن کو حقیقت کا نام دیا جاتا تھا۔ ❶

روسی استشراق کے مذکورہ بالا نمونے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک نیا مذہب ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام محمد ﷺ سے اپنی نفرت اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اصول تحقیق سے رو گردانی میں نصرانیت سے کسی طرح کم نہیں۔ تاریخ اسلام اور رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ان جدید راہبوں نے دراصل صرف اپنا چولا تبدیل کیا ہے، ورنہ وہ جدید مادی پناہ گاہوں میں بھی اسی فکر و نظر کے حامل ہیں جس نے نصرانیت کو تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔ اس نئے مادی کلیسا کا ایک فرزند بندلی جوزی ہے۔ ❷ وہ رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"مدینہ میں پہنچ کر اہل مکہ کے ساتھ نبی ﷺ کے طرز عمل میں بڑی تبدیلی آ گئی یہاں بدلے ہوئے ماحول نے نئے حالت واسباب پیدا کر دیے تھے، وہ اثر انداز ہوئے نبی کی اپنے وطن اصلی سے محبت، اس کے باشندوں سے پیار اور نئے سیاسی محرکات اور

---

❶ عبدالعزیز دوری وغیرہ: تفسیر التاریخ ص ۱۴-۱۶ مکتبۃ النہضۃ بغداد۔

❷ بندلی جوزی (۱۸۴۱-۱۹۴۳) قدس باشندہ اور عیسائی ہے، اس نے سامی زبانوں والے مشرقی علوم میں قازان (روس) سے ڈگری لی، مسیحی راہبوں کے ایک ادارہ معہد الرہبان میں اور پھر قانون یونیورسٹی اور بعد ازیں باد یونیورسٹی میں اپنی وفات تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا روسی مستشرقین اپنی تحقیقات میں اس کو اپنا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھئے نجیب عقیقی کی کتاب المستشرقون ۳/۷ ص ۹۳۱ مطبع دار المعارف القاہرہ ۱۹۶۴ء۔

نفسیاتی عوامل جن کا بدر واحد اور مدینہ کے محاصرہ کے بعد اظہار ہوا ہے۔ ان ہی کا یہ اثر تھا کہ نبی ﷺ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی کی سیاست اپنائی، دوسری طرف مکہ کے اصحاب اقتدار نے بھی معرکہ بدر اور اپنے تجارتی نقصانات کی وجہ سے یہ طے کیا کہ کعبہ، حج اور عکاظہ کے تحفظ اور ان کے بارے میں قبل اسلام کی روایتوں کو باقی رکھنے کی شرط پر بہت سے معاملات میں نبی ﷺ کے ساتھ نرمی اور درگزر کا رویہ اختیار کیا، اس طرح وہ متوقع تھے کہ نبی ﷺ بھی ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ کریں گے اور ان کو اپنے جدید منصوبوں کے فوائد میں شریک کریں گے۔ غالباً مفاہمت کی شرطوں میں یہ بات بھی رہی ہو ❶ کہ نبی مدینہ میں قیام کریں گے اور ان کے مالی امور میں چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے، اسی وجہ سے حدیبیہ میں صلح ہوئی، دل داری کی سیاست لیں دین یا باہمی مفاہمت کا نتیجہ تھی، چنانچہ لوگ دین اسلام میں فوج درفوج داخل ہوتے چلے گئے، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ دین جدید کی صحت پر یقین رکھتے تھے، جس کے بارے میں ان کی معلومات معمولی تھیں، وہ اقتدار کے جدید نمایندوں سے تقرب حاصل کرنے، اپنے قدیم مرکز کی حفاظت کرنے اور اپنی کئی کئی نسلوں کی جمع پونجی کو بچانے کے لیے دین جدید کے قریب آئے تھے، میرا گمان یہ ہے کہ حدیبیہ میں یا کسی دوسرے وقت اور کسی اور جگہ، طرفین میں جن شرطوں پر اتفاق ہوا تھا، ان میں یہ بات بھی تھی کہ محمد ﷺ سرداران مکہ پر معترض نہ ہوں گے ورنہ مرکز حجاز کے غلام اور فقراء کو ان کے خلاف جنگ چھیڑنے پر آمادہ کر دیں گے۔ میرے خیال میں مدنی سورتوں اور خصوصاً دور آخر میں نازل ہونے والی آیتوں میں اہل مکہ پر اعتراضات یا ان کے بارے میں سخت آیتوں کی عدم موجودگی کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ❷

---

❶ یہ کس مفاہمت کا ذکر ہے؟ یہ کس جگہ اور کب ہوئی؟ کس تاریخی روایت میں اس کا ذکر کیا گیا ہوا یا کس ماخذ سے اس کا اخذ ہوا ہے؟

❷ علمی تحقیق کے بنیادی تقاضوں سے روگردانی اور تاریخ کے تسلیم شدہ واقعات کے ساتھ کھلواڑ کی یہ ⇐ ⇐

اس کے علاوہ ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ مدینہ میں نبی کے اجتماعی حالات نمایاں طور پر بدل چکے تھے جن کی وجہ سے نبی کے مزاج وطبیعت میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اصل تبدیلی اور بعض ان اسباب کی وجہ سے جن میں سے چند کا ہم نے ذکر کیا اور کچھ کا م کا ہم نے تذکرہ نہیں کیا ہے؟ یہ نتیجہ نکلا کہ نبی ﷺ کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہ گئیں، اور ان میں وہ بات پیدا ہوگئی، جس کو اہل یورپ مداہنت یا ڈھیلا پن قرار دیتے ہیں۔'' ❶

بندلی جوزی یہ بھی لکھتا ہے کہ مکی دور تمہید اور تیاری کا دور تھا، قوم کے تمام طبقوں میں نئی دعوت کی نشر و اشاعت کا دور، ایک ایسا زمانہ جس میں اپنے عقیدہ پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص ایک شخص ان لوگوں سے برسر پیکار، اور کلامی نزاعات میں الجھا ہوا تھا، جنھوں نے اپنی دولت اور ملک میں اپنی قیادت کے لیے خطرہ کی بو سونگھ لی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے مزاحمت اور مقابلہ کا فیصلہ کر لیا، یہ تگ و دو اور ایسی تمناؤں کا زمانہ تھا کہ اگر وہ ہر طرح پوری ہو جاتیں، تو ملک میں ایک کامل انقلاب رونما ہو جاتا، کتنا خوبصورت اور عظیم تھا وہ زمانہ اور کس قدر شیریں تھے وہ خواب اور کس قدر خوش گوار تھی وہ جدوجہد جو ان خوابوں کی تکمیل میں صرف ہوئی، دوسرا دور عمل اور تنظیم کا اور جنگ آزمائی کا دور تھا، یہ سیاست اور حقیقت پسندی کا زمانہ تھا، جس میں طرفین نے نرمی اور مداہنت کا رویہ اپنایا اور ایسے اجتماعی انقلاب میں مداہنت کا مطلب یہ ہے کہ کچھ اغراض وعقائد سے دست برداری یا ان کے مطالبہ میں نرمی برتی جائے، کچھ خیالات سے رجوع کیا جائے یا ان کے لیے ایسا موقع ومحل متعین کر دیا جائے جس سے دونوں فریق مطمئن ہوں، چونکہ مکہ کی جمہوریہ کے صدر ابوسفیان سرداران مکہ کے نمائندے اور ایک تجربہ کار اور باخبر فرد تھے، اس لیے ان کے اور

---

⇐ ⇐ بدترین مثال ہے، اور نہ بندلی جوزی کو یہ بتانا چاہیے تھا، کہ مذکورہ بالا شرطیں کب اور کہاں طے ہوئیں، حالانکہ صلح حدیبیہ کی شرطیں اپنے اصلی لفظوں کے ساتھ، تمام مصادر ماخذ میں موجود ہیں، مؤلف کی بیان کردہ شرطیں کہاں درج کی گئی ہیں؟

❶ تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام۔ ص ۴۹۔۵۰۔

نبی عربی ﷺ کے درمیان مذکورہ بالا طریقہ پر مفاہمت ہوگئی تھی، وہ نبی کی روحانی اور عالمی سیادت کو تسلیم کر لیتے، اور بت پرستی کو چھوڑ دیتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں، اور نبی ﷺ یہ عہد کرتے ہیں کہ مکہ عرب کے دینی مرکز کی حیثیت سے برقرار رہے گا، مکہ کے سرداروں اور اس کے فکری راہنماؤں کو سلطنت یا جدید روحانی جمہوریہ کے انتظامی امور میں حصہ دیا جائے گا اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق گزر بسر اور کاروبار کی آزادی حاصل رہے گی۔ ایک تیسرا فریق غریبوں اور محتاجوں کا تھا، اور دراصل ان ہی کے لیے جنگ بھڑکی تھی، اور ان ہی کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے دعوت اسلامی کا آغاز ہوا تھا، ابتداء میں ان کو کچھ تو زکوۃ وصدقات کے ذریعہ راضی کر لیا گیا اور پھر نبی ﷺ کی وفات اور ان کے خلفاء کی رخصت کے بعد لوگ فقراء کے حق کو بھول گئے۔ یا پھر اس حق کو نظر انداز کر دیا گیا، چنانچہ ان فقراء کی حالت وہی ہوگئی جو پہلے تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر صورت پیدا ہوگئی۔ ❶

یہی بندلی جوزی ایک اور جگہ کہتا ہے کہ:

> ''یہ ایک واقعہ ہے کہ نبی عربی ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ کبھی بھی بدی کے اجتماعی اسباب اور اس کے تمام جراثیم کی بیخ کنی کا ارادہ نہیں کیا جب کہ آج کمیونسٹ پارٹیاں اپنے ناموں اور رجحانات میں فرق کے باوجود یہی کام انجام دے رہی ہیں، نبی عربی ﷺ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ بعض طبقوں کی ان مصیبتوں میں کسی قدر کمی کر دے جنھوں نے تقسیم رزق کے بعد جنم لیا ہے، یا حالات کا مقابلہ نہ کر پانے کی وجہ سے وہ غلامی اور فقر میں مبتلا ہوگئے ہیں، نبی عربی تمام اجتماعی بیماریوں کے جراثیم کا خاتمہ کرنا چاہتے تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار ہونے کے بعد مذکورہ طریقوں کے علاوہ دوسرے وسائل سے بھی کام لیتے۔''

گزشتہ تمام نبیوں کی طرح نبی عربی ﷺ نے بھی چند نادر موقعوں کے سوا تمام حالات میں ادبی وسائل کے اختیار کرنے کو ترجیح دی، ان طریقوں کو نہیں جن کے اختیار

❶ تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام ص ۵۰۔۵۲۔

کرنے پر ہمارے زمانے میں یورپ کے مصلحین اور ماہرین سیاست لینن اور مسولینی وغیرہ مجبور ہو رہے ہیں، اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد ﷺ نے عربوں کے اجتماعی امراض کی تشریح اور ان کی تعداد کے بیان کرنے میں زیادہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا ہے: ان کے علاج اور جراثیم کی بیخ کنی کے معاملہ میں یہ ثبوت نہیں دیا۔ ❶

بندلی جوزی کے علاوہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد بھی ان ہی خیالات کی علم بردار ہے ان کے بہت سے شاگرد مشرقی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کے فکر وفلسفہ کی بنیاد پر مختلف مکاتب فکر قائم ہیں، مگر سرزمین اسلام سے ناواقفیت اور تحقیق کے سچے اصولوں سے بے گانگی ان کا مشترک سرمایہ ہے یہی وجہ ہے کہ کلیسا کی پرفریب تحقیقات تاریخی مادیت یا سیکولرزم پر مبنی استشراق کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، ان کی تحقیقات کا مسلمانوں پر بھی زیادہ اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ استشراق کو اپنے قدیم رنگ وآہنگ کے نقصانات کا اندازہ ہو چکا ہے، اب وہ اپنی تحقیقی بحثوں میں اعتدال اور معروضیت کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں، اور منٹگمری واٹ اسی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

## منٹگمری واٹ کا طرز تحقیق

منٹگمری واٹ دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں اصول تحقیق کے معیار کو قائم رکھنے میں ممتاز نظر آتا ہے، اس کو تحقیق کے لازمی تقاضوں کا شعور حاصل ہے اور اس نے تنقیدی موازانہ کا بہتر اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیرت کے باب میں اس نے اپنی تحقیق کے ذریعہ کئی قابل قدر چیزیں پیش کی ہیں، لیکن اپنے پیش رو اور معاصر مستشرقین کی طرح وہ اکثر اپنے تنقیدی ذوق کی طرف واپس ہو جاتا ہے، اور سیرت پاک کی مسلمہ حقیقتوں سے بہت بڑی حد تک انکار کر بیٹھتا ہے۔

منٹگمری واٹ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں معروضیت کا پابند رہے گا لیکن وہ مخالفانہ جذبات کے دباؤ سے آزاد نہیں رہ سکا۔ اس نے بارہا اصول تحقیق سے انحراف کیا ہے تاریخ میں گروہ بندی کے اس دور میں اس کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کئی اعتبار سے دوسروں پر فائق

❶ تاریخ الحرکات سے الفکریۃ فی الاسلام ص ۴۴۔۴۵۔

ہے، اس کے یہاں دوسرے مستشرقین کے برعکس زیادہ معروضیت پائی جاتی ہے، وہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور پیشگی مفروضوں کا سہارا نہیں لیتا ہے، وہ واقعات کے تانے بانے ہی سے اپنے لیے نظیریں تلاش کرتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کرتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں ہمارا حسن ظن زیادہ دیر تک باقی رہ گیا ہے، وہ واقعات کی زبان حال سے ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو زمانہ کی عمومی روش اور اس دور کے وسیع اور عمیق مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، واٹ نے تاریخی عصریت کے حوالہ سے جن خیالات کو درج کتاب کیا ہے ان سے زمانہ کی تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقتیں بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہتی ہیں ہم اس بارے میں اپنے ذاتی رجحانات یا کسی پیشگی فیصلہ سے بچنے کے لیے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ واٹ کے تحقیقی نتائج پر مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ سیرت کے میدان میں مستشرقین کی اکثریت نے جو اصولی غلطیاں کی ہے وہ واٹ کی تحریروں میں کس حد تک پائی جاتی ہیں ہم واقعات کی جزئیات وتفصیلات پر تردید مناقشہ کے بجائے معروضیت اور اصول تحقیق سے واٹ کے انحراف کی نشاندہی کریں گے۔ اس لیے کہ یہاں ہمارا موضوع سیرت کے حقائق ❶ کی بجائے وہ طرز عمل ہے جو سیرت کے بارے میں مستشرقین نے اختیار کر رکھا ہے۔

واٹ کی کتاب ''محمد ایٹ مکہ'' میں اصول تحقیق کی دو غلطیاں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ محض ذوق تنقید سے کام لے کر مختلف روایتوں کو رد کر دیا گیا ہے، یا ان کی صورت کو مشکوک قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، اور دوسری غلطی یہ ہے کہ ماضی کے تاریخی واقعات پر آج کے نسل ونسب پر مبنی تخیلات اور معاصرانہ نقطہ نظر کی روشنی میں غور کیا گیا ہے۔ اس بارے میں واقعات کے پس پردہ اسباب کی کھوج لگانے اور ان میں باہمی وحدت کی جستجو کے لیے منطق کے وضعی اصولوں پر اعتماد ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔

واٹ کی اس کتاب میں اور بھی قابل گرفت باتیں ہیں جن کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ

❶ حقائق سیرت کے بارے میں تفصیلی بحثوں کے لیے دیکھئے دراسة فی السیرة مولفہ عماد الدین خلیل طبع پنجم موسسة الرسالة بیروت ۱۹۸۱ء۔

واقعات سیرت کا ایک حصہ یہودیت یا مسیحیت کے قدیم مذہبی مصادر سے ماخوذ ہے۔

## واٹ کی تحقیق کا پہلا نقص

بہر حال اب ہم تحقیقی مباحث میں واٹ کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیں گے، اس کی پہلی غلطی یہ ہے: تنقید میں غلو، اپنے مخصوص ذوق اور رجحان طبع کی وجہ سے روایتوں کا انکار اشتبہات کی تخم ریزی اور ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد،

## بحیرا راہب اور شق صدر کا واقعہ

رسول اکرم ﷺ کی ولادت اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے نکاح کے درمیانی عرصہ میں جو اہم واقعات رونما ہوئے واٹ نے ان کا جائزہ لیا ہے اور پھر لکھتا ہے کہ:

> ''یہ واقعات، نکاح سے پہلے محمد ﷺ کی زندگی پر اثر انداز ہوئے ہیں، ایک مورخ کے نقطہ نظر سے ان میں سے چند واقعات بحث طلب ہیں، ان کے ساتھ بڑی تعداد میں ایسی روایات بھی ہیں جن کو فقہی نوعیت کی روایتیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مورخ کے نزدیک صداقت پر مبنی نہیں ہیں ان میں جو واقعات ہیں ان کو محمد ﷺ کی زندگی کے مختلف ادوار کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، البتہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایمان دار مسلمانوں کے لیے یہ روایات محمد ﷺ کے مقصد کو پورا کرتی ہیں، اور اس طرح وہ برمحل کہی جا سکتی ہیں، وہ ان کے نبی ﷺ کی زندگی کے شایان شان ایک ضمیمہ ہو سکتی ہیں، وہ نگاہ عقیدت کی پیدا کردہ ہیں ورنہ ان واقعات کے دوسرے شواہد بھی موجود ہوتے بہر حال ہم یہاں ابن اسحاق کی روایت کے مطابق وہی واقعات ذکر کریں گے جو زیادہ مشہور ہیں۔''❶

واٹ نے ابن اسحاق کی روایت کے مطابق دو فرشتوں اور بحیرا راہب کے واقعہ کا ذکر کیا ہے، اور پھر یہ تنقید کرتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت اور نکاح کے درمیان ۲۵ سال کے عرصہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے زمانہ وقوع کے بارے میں ایک عام قاری تذبذب اور

❶ محمد ایٹ مکہ ص ۶۶ عربی از شعبان برکات مطبوعہ المکتبہ العصریہ بیروت۔

پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اگر بحیرا راہب کا واقعہ بحث طلب ہے، اور تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ہے۔ ❶ تو شق صدر کے واقعہ کا انکار بھی دشوار ہے، صرف اس لیے نہیں کہ ابن ہشام ❷ ابن سعد ❸ میں اور بلاذری، ❹ اور دوسرے ابتدائی مورخوں کے علاوہ اس کی روایتیں صحیح مسلم ❺ اور مسند احمد ❻ میں بھی موجود ہیں، بلکہ اس واقعہ کا انکار اس لیے بھی دشوار ہے کہ یہ واقعہ غیبی سرچشمہ رکھنے والے نبی کی شخصیت سے براہ راست تعلق رکھتا ہے جس کے بعد اب نبی ﷺ کی ذات تاریخ کے آئینہ میں عقلی تجزیہ کے دائرہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ یہاں نبی کی زندگی میں غیب اور شہود دونوں ایک ہو جاتے ہیں، اس لیے اب دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو ہم اس وصف کا اعتراف کر لیں جو محمد ﷺ کو ایک نبی کی حیثیت دیتا اور نفسیاتی نشو ونما کے وسائل پر نبوت کے اثرات ڈالتا ہے، اور یا سرے سے اس وصف کا انکار کر کے وحی کو ایک تجرباتی چیز قرار دیں، لیکن اگر وحی انسان کا کوئی اختیاری تجربہ نہیں ہے۔ تو پھر یقیناً اس کا رشتہ ان روایات کے ساتھ سمجھ میں آ جائے گا۔ جو فقہی نوعیت کی ہیں، اور جو ایک مورخ کی نظر میں حقیقی نہ ہوں تو ہم مسلمانوں کے نقطہ نظر سے وہ صداقت پر مبنی ایک واقعہ ہیں۔

## حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر

ایک تاریخی واقعہ کو اس کی حقیقی شکل میں نہ دیکھنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے، کہ سرے سے اس کی تاریخی حقیقت ہی کا انکار کر دیا جائے، چنانچہ محمد ﷺ نے نکاح کیا اور آپ کی بیوی حضرت

---

❶ دراسۃ فی السیرۃ ص ۲۔۲۷۱۔

❷ تہذیب سیرت ابن ہشام، ص ۳۲۔۳۱ عبدالسلام ہارون، طبع دوم، موسسۃ عربیۃ حدیثۃ، قاہرہ ۱۹۶۴ء۔

❸ طبقات کبیر لابن سعد ۱/۰/۷ ۴۰، تحقیق ایڈرو ڈسنی مطبوعہ عکسی از نسخہ اپریل ۱۹۹۴ء۔

❹ انساب لابن اشرف البلاذری ج، ص ۸۴۰۸ تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیۃ، دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

❺ صحیح مسلم ج اص ۱۰۴۔۱۰۱۔

❻ مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۱۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سات بچے ہوئے اس پر بھی واٹ اپنے مفروضہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''اگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہر سال ایک بچہ کی پیدائش ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آخری بچہ کی ولادت کے وقت وہ اڑتالیس ۴۸ برس کی ہوگئی تھیں، یہ بات ناممکن تو نہیں ہے، مگر ایسی حیرت انگیز بات ہے جس پر رائے زنی کی جاتی یہ ایسی قابل قبول بات ہے جسے بعد میں معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ❶

مذکورۂ بالا مسئلہ میں پیچیدگی کی کوئی بات نہیں ہے، اگرچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے نکاح کے وقت چالیس ۴۰ برس سے کچھ کم رہی ہوں یا چالیس برس کی ہو چکی ہوں کیونکہ پچاس برس کی عمر تک صلاحیت تولید کا پایا جانا ناممکن نہیں ہے، لیکن واٹ نے اس مسئلہ پر جو موقف اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

ہم کو اس موقع پر ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں کوئی رائے زنی نہیں ملی۔ ❷

تو کیا واٹ کے نزدیک مذکورہ مؤرخین میں تنقیدی حس موجود نہیں تھی؟ اور اسی فقرے میں اپنا موقف بدل کر یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ:

یہ ایسی قابل قبول بات ہے جسے بعد میں معجزانہ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں اور عمومی حیثیت سے مسلمان نسلوں میں یہ صلاحیت بخوبی پائی جاتی ہے کہ: ہر ایسے واقعہ کو معجزہ بنادے جو مانوس طریقہ سے وجود میں نہ آیا ہو۔

دعوت اسلامی کی ابتداء کن حالات میں ہوئی اس پر واٹ کا جائزہ بڑا دلچسپ ہے وہ کہتا ہے کہ:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی سرگرمیوں کے زمانہ کے جو حالات ہیں ان کے بارے میں بڑی بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے۔ قدیم ترین روایات کی چھان بین کرتے ہم کوئی قابل اعتماد عمومی تصویر بنا سکتے ہیں، اگرچہ مختلف تفصیلات اور خصوصاً تاریخی وسائل کمزور اور ناپختہ حالت میں ہیں۔'' ❸

---

❶ واٹ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایٹ مکہ ص ۵۷ عربی ترجمہ، شعبان برکات مطبوعہ مکتبہ عصریہ بیروت۔

❷ ایضاً۔

❸ محمد ایٹ مکہ ص ۹۳۔

## پہلی وحی

واٹ اس زمانہ کی حقیقی صورت حال کی کوئی قابل اعتماد تصویر بنا سکتا ہو تو دعوت اسلامی کے زمانہ کے تاریخی حالات کے بارے میں آغاز کار کے طور پر ہم اس کے پیش کردہ شبہات کو قبول کر سکتے ہیں ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا، مگر کیا واٹ اس زمانہ کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے، وہ سیرت کا مطالعہ کرنے والے دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں اس مہم جوئی کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اسلام کے خالص اور وسیع نقطہ نظر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ واٹ شک وریب کی جھاڑیوں ہی میں پھنس کر رہ گیا ہے، اس زمانہ کی ایک نئی تصویر اس کے ہاتھ آئی، مگر اس طرح کے اس کے حقیقی خدوخال گم ہیں اور اس کی طرف دو باتیں منسوب کر دی گئی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا، مثلاً وحی کے بارے میں واٹ لکھتا ہے:

> ''تاریخ کی روشنی میں ایک ذرا سی دشواری ہمارے سامنے یہ ہے کہ پہلی وحی کے اختتامی الفاظ ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ کا گزشتہ وحی سے تعلق ہے، مسلمانوں نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ نے انسان کو قلم کے استعمال کرنے کا حکم دیا مگر یہ تفسیر بے فائدہ ہے، کیونکہ محمد ﷺ پڑھنے لکھنے سے واقف نہیں تھے، اور جن لوگوں سے آپ وابستہ تھے، ان میں ورقہ بن نوفل مسیحیت کی مقدس کتابوں سے واقفیت کی بنا پر نمایاں ہیں، اس لیے مذکورہ وحی کے آخری لفظوں کو محمد ﷺ نے جو بار بار دہرایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ورقہ کے مرہون منت تھے، یہ سوچنا تو ایک فریب ہوگا کہ ناموس (جبرئیل آمین) کی آمد پر ورقہ نے جو رائے دی تھی وہ ممنونیت کا اصل سبب تھی، مگر ''اقرأ'' سے پہلے ایسی پیش رو وحی کا تقاضا ضرور پیدا ہوتا ہے، جس نے ورقہ کی رائے میں قوت اور زور پیدا کر دیا ہو، اس لیے یہ فرض کر لینا بہتر ہوگا کہ محمد ﷺ نے ورقہ سے بہت پہلے مسلسل تعلقات پیدا کر رکھے تھے اور اُن سے بہت سی باتیں سیکھی تھیں چنانچہ بعد کی اسلامی تعلیمات ورقہ کے افکار سے بہت کچھ متاثر ہوتی ہیں، اس بات سے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اور گزشتہ وحی کے درمیان تعلق کی گتھی دوبارہ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔''[1]

---

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۹۳۔

ورقہ سے استفادہ اور آئندہ اسلامی تعلیمات میں اس کے افکار سے اثر پذیری کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے۔ البتہ اس موقع پر ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ وحی کے ابتدائی لمحوں کے متعلق کا ابتدائی واقعہ بالکل واضح ہے، اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق درج ذیل معروف طریقہ سے پیش آیا وہ فرماتی ہیں کہ:

''(اس زمانہ میں) محمد ﷺ کو آبادی سے باہر رہنا پسند تھا، چنانچہ غار حرا میں تنہا رہتے، اور وہیں (کئی کئی رات) عبادت کرتے اور اس کے لیے اپنا توشہ ساتھ رکھتے، ختم ہو جاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر توشہ ساتھ لے جاتے یہاں تک کہ وہ غار حرا ہی میں تھے، کہ حق کی آمد ہوئی، فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ پڑھ! فرمایا: میں ان پڑھ ہوں۔ فرمایا کہ اس فرشتہ نے مجھے پکڑا اور زور سے بھینچا جس سے میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ! تو میں نے پھر کہا کہ میں ان پڑھ ہوں، اس نے مجھے پکڑ لیا، اور تیسری بار بھی مجھے زور سے دبا دیا اور چھوڑ دیا پھر اس نے کہا کہ پڑھ اپنے رب کا نام، جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ! اور تیرا رب مہربان ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا ہے اس واقعہ کے بعد رسول اکرم ﷺ واپس ہوئے۔ تو آپ کا دل دھڑک رہا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے تو فرمایا: مجھے اوڑھا دو، مجھے اوڑھا دو لوگوں نے آپ کو اوڑھا دیا تو خوف جاتا رہا، پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پورا واقعہ بتایا اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا، آپ رشتہ جوڑتے ہیں (دوسروں کا) بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلس کو دیتے ہیں، مہمان کی ضیافت کرتے اور حق پر آئی ہوئی مصیبتوں میں (دوسروں کی) مدد کرتے ہیں، پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کے لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسید بن عبدالعزیز کے پاس گئیں، وہ دور جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، اور انجیل سے عبرانی تحریریں جس قدر ہو سکتا لکھ لیا کرتے تھے، بوڑھے اور

آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا اے برادر عم زاد! اپنے بھتیجے کی بات سن لیجئے تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ اے بھتیجے، کیا بات ہے؟ آپ نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ ان کو بتلایا، تو ورقہ نے آپ سے کہا یہ تو وہ ناموس (روح مقدس یعنی جبریل) ہے جس کو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا، کاش میں اس وقت تک جوان رہتا، کاش میں زندہ رہتا، جب کہ آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی، اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے ورقہ نے کہا ہاں جس آدمی نے بھی وہ چیز پیش کی جو تم لائے ہو اس کو اذیت ہی دی گئی ہے، تمھارا وہ دن اگر مجھے ملا تو میں پوری طاقت سے تمھاری مدد کروں گا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کچھ دنوں تک نازل نہیں ہوئی۔'' ❶

واٹ نے گزشتہ وحی کا جو ذکر کیا ہے۔ مذکورہ تفصیلات میں اس کا وجود کہاں ہے؟ پھر ورقہ کے ساتھ سابق میں اور اس کے بعد مسلسل تعلقات کی بنیاد کیا ہے؟ ابتدائی وحی کے جو واقعاتی پہلوؤں پر تمام مؤرخین و محدثین کا اتفاق ہے، واٹ ان کا تو بڑی تندخوئی کے ساتھ انکار کرتا ہے، اور اپنی طرف سے مفروضوں کی بنیاد پر ایسے پہلو بیان کرتا ہے جن کا کسی مورخ یا محدث نے کوئی تذکرہ نہیں کیا، پھر اپنے شک پیدا کرنے والے تنقیدی انداز کی طرف مائل ہو جاتا ہے، یہ لکھ کر یہ سوچنا تو ایک فریب ہوگا کہ وہ مبالغہ آرائی کے ساتھ یا بڑے عمومی انداز میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ''بعد کی اسلامی تعلیمات بہت کچھ ورقہ کے افکار سے متاثر ہو گئی تھیں۔'' واٹ نہ تو ان مواقع کی وضاحت کرتا ہے، جہاں ورقہ کے افکار اثر انداز ہوئے، اور نہ ہی اس بارے میں تعین کے ساتھ اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔

## مستقبل کا اثر روایات پر

واٹ کے نزدیک روایت میں شک پیدا ہونے کی ایک وجہ مستقبل کے زمانی اثرات بھی ہیں، جو روایت کی تفصیلات اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان یکسانیت پیدا کر دیتے ہیں

❶ صحیح بخاری، تجرید ج ۱ ص ۶۔۷ مطبوعہ ۱۹۳۱ء۔

یہ ایک طرح کی مفاہمت ہے، جو عموماً وجود میں آتی ہے تاکہ کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکے، یا کسی شخص کے تقدس کا ثابت کرنے یا اس کے خیالات کو عملاً تشکیل دینے میں اس سے مدد لی جاسکے واٹ نے اس کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اسلام میں بنیادی طور پر شرافت کا معیار یہ ہے کہ امت اسلامیہ کے معاملہ میں اخلاص برتا جائے اس لیے مسلمانوں نے شرافت اور عزت کے بارے میں اپنے اجداد کے حقوق کا استحصال کیا ہے، چنانچہ ہمیں ابتدائی مسلمانوں کے حالات کی احتیاط سے چھان بین کرنی چاہیے، اگر کسی شخص کے عقیدت مند یا اس نسل کے لوگ یہ دعویٰ کریں کہ ان کا ممدوح ابتدائی دس مسلمانوں میں تھا، تو احتیاط کی وجہ سے ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ غالباً ان ابتدائی پینتیس ۳۵ مسلمانوں میں سے ایک رہا ہو، مثلاً طبری کہتا ہے، کہ مذکورہ تینوں افراد کے بعد جو سب سے پہلے اسلام سے وابستہ ہوئے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئی، جن کو ابو بکر رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے، مگر طبری کا یہ بیان مشکوک ہے کیونکہ مذکورہ افراد در حقیقت علی رضی اللہ عنہ کو ملا کر پانچ تھے۔ جو عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر مسلمانوں کے رہنما قرار پا گئے تھے۔ ان کو عمر ہی نے چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ میں انتخاب خلیفہ کے لیے نامزد کر دیا تھا یہ کہنا مشکل ہے کہ بیس ۲۰ سال پہلے ابتدائے اسلام میں یہ لوگ خود ہی یکجا ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہوں ان کے نام درج ذیل ہیں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما، زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما، طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہما۔ ❶

آئندہ خلیفہ کی نامزدگی کے لیے مذکورہ چھ افراد کے انتخاب کی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا، اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ان کا احترام تھا، اور قبول اسلام کے شرف کے علاوہ ان کو اس عرصہ میں کافی تجربہ اور علم بھی حاصل ہو چکا تھا، مگر ابتداء میں مسلمان ہونے والوں اور انتخاب خلیفہ کے لیے نامزد کیے

❶ محمد ایٹ مکہ (ترجمہ عربی) ص ۱۳۵۔۱۳۶۔

جانے والے لوگوں کا پانچ ۵ کی تعداد میں ہونا، واٹ کے نزدیک وہ یکسانیت ہے، جس کی وجہ سے وہ اس طرح کی روایتوں میں شک پیدا کرنا چاہتا ہے، جب کہ یہ دو روایتیں الگ الگ واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، اور تاریخی حیثیت سے دونوں ثابت شدہ ہیں، ان کو بے بنیاد شبہ کی وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا، کسی خاص گروہ کے نقطہ نظر کی حمایت اور اس کی شہرت یا فائدہ کے لیے، واٹ کے نزدیک کچھ روایتیں بعد میں وضع کی گئی تھیں اس لیے اور بھی روایتوں میں وہ اپنے مفروضہ قیاسات کے بل پر شک یا انکار کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر دلیل ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ ان روایتوں کو رد نہیں کرتا ہے، البتہ اُن میں شبہ پیدا کرنے کے لیے مفروضہ امکان ہی پر اپنی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

مثلاً ایک امکان یہ ہے کہ طائف سے واپسی کے بعد محمد ﷺ سے بنی نوفل سردار مطعم بن عدی کی حمایت کے بارے میں ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ چند شرطوں پر ہوئی تھی، اور ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف مصادر میں ہم کو کوئی حدیث بھی مل جائے اگر ایسا ہوا تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہوگی، کیونکہ یہ داستان قبیلہ بنو نوفل کی عظمت کو بتانے کے لیے بیان کی جاتی ہے، مگر چونکہ اس سے بنو ہاشم کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوئی تھی، اس لیے وہ روایت بعد میں نظر انداز کر دی گئی، یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ (جب کہ ابن ہشام کے یہاں وہ روایت موجود ہے۔ ❶ دوسری مثال یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں عروہ رضی اللہ عنہ اس سیاسی گروہ میں تھے۔ جو محمد ﷺ کے زمانہ میں برسر اقتدار پارٹی سے تعلق رکھتا تھا، وہ ابو بکر، عمر، اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کے اتحاد پر مشتمل تھا، پھر عروہ رضی اللہ عنہ کا سیاسی تعلق عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ، اور زبیر رضی اللہ عنہ کے گروہ سے رہا جس نے ۳۹ھ میں علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کا مقابلہ کیا، امویوں کے خلاف ۷۳۔۶۳ھ میں جو گروہ بغاوت کا ذمہ دار تھا، اُس سے عروہ کا بھی تعلق تھا۔ (یہ پارٹیاں یکساں مقاصد کی حامل نہ تھیں، تاہم اِس میں ایک طرح کا تسلسل ضرور پایا جاتا ہے) مذکورہ بالا صورت حال کی روشنی میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ عروہ کے روایت کردہ واقعات میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اموی قبیلہ کی بُری تصویر پیش کرتے ہیں، اور ان ہی کو محمد ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا ذمہ دار ثابت کرتے

---

❶ محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۲۲۔

ہیں، چنانچہ بنی عبد مناف کے رویہ پر محمد ﷺ کا تاسف، مخالفت کے بڑے رہنماؤں کا ذکر ابوجہل کی طرف سے بدکلامی اور جنگ پر آمادگی کے لیے اصرار، عروہ ہی کی بیان کردہ روایات ہیں۔ ❶

یہاں مثال کے طور ایک بات کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ مکی دور میں محمد ﷺ نے جو ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں ان کی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ عروہ کی آئندہ نسلیں جو ایک عرصہ تک ان کی ہم خیال تھیں اور جنھوں نے بعد میں عروہ کے مسلک سے علیحدگی اختیار کر لی تھی وہ محمد ﷺ کی ابتدائی کامیابیوں کا تذکرہ پسند نہیں کرتی تھیں (اس لیے کہ ان کامیابیوں میں عروہ کا بھی حصہ تھا۔ ❷ یہ بات بھی اہم ہے کہ عروہ (جو تاریخی واقعات کے بیان کرنے والوں میں خاص طور پر مشہور ہیں) زبیر کے خانوادہ سے ہیں جو اس زمانہ میں امیہ کے خانوادہ کا مخالف تھا، اس لیے عروہ پر خاندانی روایات میں اس مخالفت کا اثر پڑا۔ ان میں محمد ﷺ کے مخالفین اور قریش کی طرف سے دباؤ کا مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اموی قبیلہ محمد ﷺ کے مخالفین میں تھا۔ ❸

## حضرت عروہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض

قریش مکہ کے دباؤ اور اور زبردستی کے بارے میں واٹ کے طرز عمل کا بھی ہم جائزہ لیں گے، مگر یہاں اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا اقتباس میں واٹ کے قیاسات کا سارا دارومدار عروہ رضی اللہ عنہ پر ہے۔ اگر قریش کی زیادتیوں کے بارے میں صرف عروہ ہی نے واقعات بیان کیے ہوتے تو اس شبہ کی گنجائش تھی کہ بنو امیہ سے انتقامی جذبات نے ان کو مبالغہ آرائی پر آمادہ کیا ہو مگر یہی واقعات ان مؤرخین اور راویوں نے بھی بیان کیے ہیں، جن کا قدیم خاندانی رنجشوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

رسول اکرم ﷺ کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عقبہ کبریٰ کی بیعت کے وقت اور فتح مکہ کے موقع پر جو کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ اور معروف ہے، یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ حالت شرک میں بھی انھوں نے دعوت اسلام کا مقابلہ نہیں کیا، اور مذہبی اذیت رسانی میں حصہ لیا، حالانکہ ان کے بھائی ابولہب کی کارگزاریاں اس کے برعکس تھیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا

---

❶ محمد ایٹ مکہ۔ مکہ ص ۲۶۷۔ ❷ ایضاً۔ ص ۱۷۱۔

❸ ایضاً ص ۲۳۱۔

رویہ اس زمانہ میں ایسا تھا کہ انھیں رسول اکرم ﷺ کے دوسرے چچا ابو طالب کے انتقال کے بعد ان ہی کی طرح رسول اکرم ﷺ کے مشیروں اور حمایتیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، ایسی روایات بھی موجود ہیں (جن کی صحت کے بارے میں ہم کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دور اول ہی میں کسی وقت مسلمان ہو گئے تھے، وہ مکہ میں مقیم تھے تاکہ وہیں رہ کر اپنے خاندانی وقار کے ذریعہ دعوت اسلامی کی خدمت کرتے رہیں، ان کے قبول اسلام کا زمانہ جو بھی ہو، مگر واٹ نے بیعت عقبہ میں ان کی موجودگی تک سے قطعی انداز میں یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ:

> عباس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کو نظر انداز کر دینا ضروری ہے کیونکہ وہ بعد کے راویوں کا اضافہ ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ اس زمانہ میں بنو ہاشم کے ذریعہ محمد ﷺ کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی، اس کو نظروں سے اوجھل کر دیا جائے طائف سے واپسی کے بعد محمد ﷺ کو بنو نوفل کے سردار کی طرف سے تحفظ حاصل ہو گیا تھا، مگر بیعت عقبہ میں عباس رضی اللہ عنہ کی طرف داری اور حمایت کا واقعہ بے اصل ہے، کیونکہ ان کی ہمیں بات چیت کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس وقت تو وہ کافر تھے۔ ❶

## شرک کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش

اپنی اس تحریر میں واٹ جس نتیجہ تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے شرک پہلی صدی ہجری کے آخر میں، اپنے مخالفوں کی نظر میں ایک معمولی سا عیب سمجھا جاتا تھا، وہب بن منبہ کی طرف منسوب وہ روایت جو الھدیٰ کے اوراق میں محفوظ ہے، اس سے ہماری گزشتہ رائے کی تصدیق ہوتی ہے، اس میں یہ ہے کہ عباس محمد ﷺ کی مدح کرتے ہیں پھر محمد ﷺ مدینہ کے ایک شخص کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ عباس کی اور ان کی قابل گرفت باتوں کی تردید کر دیں کہ مدینہ کے باشندے ان سے زیادہ محمد ﷺ سے حسن ظن رکھتے ہیں، یہاں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عباسیوں کے پروپیگنڈا کے خلاف کوئی تردیدی بیان ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہو، یہ فرض کر لینا زیادہ قابل قبول اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ عقبہ ثانیہ میں عباس رضی اللہ عنہ کی شرکت ایک بے اصل داستان ہے، جس

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۲۳۲۔

سے عباسی پروپیگنڈا نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ❶

مسلمانوں پر مشرکانہ قیادت کی طرف سے جو شدید دباؤ پڑا وہ اس قدر معروف اور مشہور روایات سے ثابت ہے کہ اس کو مزید ثابت کرنے کی کوشش بے فائدہ ہوگی مگر تاریخی ماخذ میں قریش کے جس ظلم کا ذکر کیا گیا ہے، واٹ نے اس پر اپنے شک کا اظہار کیا ہے اس نے اس تشدد کا انکار کیا ہے، جس سے نسل در نسل لوگ واقف ہوتے رہے، وہ ظلم وتشدد کے واقعات کو مبالغہ آرائی قرار دے کر مذکورہ روایتوں کو مشکوک قرار دیتا ہے، اور واقعات کو ایسا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے خیال میں ایک متعدل خاکہ نظر آئے وہ لکھتا ہے کہ:

''تاریخی مصادر مسلمانوں کے ابتلا کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا اشارہ ابوجہل کی جیسی کارگزاریوں اور حالات کی طرف ہوتا ہے، مگر یہ ابتلا زیادہ سخت نہ تھا، ابن ہشام، طبری اور ابن سعد کی کتابوں کو دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ان کتابوں میں یقیناً بدترین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ساری تفصیلات کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ معمولی تھا، ممکن ہے کہ اس ظالمانہ دباؤ کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ثابت کرنا ہو کہ اس کے باوجود کسی شخص نے بھی دین اسلام کو ترک نہیں کیا۔ ابن اسحاق کے حوالہ سے جو تاریخی شواہد ہمیں مل سکے ہیں ان میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ پر سب وشتم کیا گیا، اور ان کے ساتھ معمولی طرز کے توہین آمیز واقعات پیش آئے۔ مثلاً پڑوسیوں کا کوڑا کرکٹ ان کے گھر کے سامنے ڈال دیا گیا، ابوطالب کی وفات کے بعد، غالباً زچ کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، جو ہجرت کے وقت صرف پانچ ہزار درہم رہ گئے تھے، ابن سعد کے بیان کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ (مسلمان) غلاموں کو خرید لیا کرتے تھے، مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ابوجہل کی

❶ ایضاً ص ۲۳۲۔۲۳۳۔

طرف سے اقتصادی دباؤ ہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سرمایہ میں کمی کا سبب بنا ہو کیونکہ، ایک غلام کی قیمت اس زمانہ میں تقریباً چار سو درہم سے زیادہ نہ تھی، غلاموں پر جسمانی سزاؤں کی مشہور ترین مثالیں وہ ہیں جو بلال رضی اللہ عنہ اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آئیں، عاص بن وائل نے خباب بن ارت کے قرض کی ادائیگی روک دی تھی، ظالمانہ دباؤ کی ایک چوتھی قسم کا بھی ہم ذکر کر سکتے ہیں اور یہ وہ کارروائیاں ہیں جو باپ چچا یا بھائیوں کی طرف سے خاندان یا قبیلہ کے افراد کے ساتھ کی گئیں۔'' ❶

واٹ کی ساری بحث کا خلاصہ اس کے اپنے لفظوں میں یہ ہے کہ مسلمانوں پر معمولی سا دباؤ تھا، کیونکہ مکہ میں مختلف قبیلوں کی طرف سے اپنے آدمیوں کی حمایت کا نظام ایک ایسی رکاوٹ ثابت ہوا جس کی وجہ سے ایک مسلمان کو دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کی طرف سے اذیت نہیں دی جاتی تھی ورنہ اس مسلمان کا قبیلہ ابھی مسلمان نہ ہوا تو تب بھی قبائلی حمایت کا یہ نظام اس کے حق میں حرکت میں آ جاتا، دوسروں سے اختلاف کے موقع پر اگر اپنا خاندان حمایت نہ کرے تو یہ بات قبیلہ کی عزت کو مجروح کر دیتی، اسی لیے مسلمانوں پر دباؤ کی صرف درج ذیل صورتیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔

(۱)...... جب قبائلی تعلقات متاثر نہ ہوں اور کسی مسلمان پر اسی کے قبیلہ کے لوگوں کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے یا وہ ایسا فرد ہو جس کو کسی بھی قبیلہ کی حمایت حاصل نہ ہو۔

(۲)...... ایسی کارروائیاں جو عزت اور شرف کے روایتی قانون کے ذیل میں نہ آتی ہوں مثلاً اقتصادی معاملات یا لفظی سب وشتم جس کا نشانہ کوئی خاص فرد ہو۔ اور قبیلہ اس کی زد میں نہ آتا ہو۔

مذکورہ بالا دباؤ نئے دین کی ترقی کے لیے تو کافی تھا، لیکن کسی مسلمان کو دین اسلام سے ہٹا دینا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ ❷

واٹ کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مسلمانوں پر حریفانہ دباؤ معمولی تھا، اس بارے میں ہم تفصیلی گفتگو کی بجائے صرف ان حالات کی طرف اشارہ کریں گے جو مسلمانوں اور ان کے حریفوں کے درمیان پیش آئے۔

---

❶ محمد ایٹ مکہ ص ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ❷ ایضاً ص ۱۹۲۔

ہر ایک قبیلہ اپنی حد تک ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتا جو اس سے تعلق رکھتے ہوں یہ آزاد ہوں یا غلام قبیلہ کے لوگ ان کو قید کر دیتے، مار پیٹ کرتے بھوک پیاس سے اور گرمی بڑھ جاتی تو مکہ کی سخت دھوپ میں رکھ کر ان کو اذیت دیتے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بے پناہ سختیوں کی تاب نہ لاتے اور فتنہ کا شکار ہو جاتے، اور جو ڈٹے رہتے ان کو اللہ تعالیٰ ان کی دست درازیوں سے محفوظ فرماتا، ایک راوی مجاہد کا یہ بیان ہے کہ کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا، اور ان کی تکلیف اپنی انتہا کو پہنچ جاتی۔ ❶

دوپہر میں جب دھوپ تیز ہو جاتی تو بنو مخذوم کا قبیلہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کے والدین کو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر ڈال کر تکلیف پہنچاتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرتے ہوئے یہ منظر دیکھتے، تو فرماتے کہ اے خاندان یاسر! صبر کرو، تمھارے لیے جنت کا وعدہ ہے عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ اسلام پر جمی رہیں تو ان کو قتل کر دیا گیا۔ عمار رضی اللہ عنہ کو اس قدر تکلیف دی جاتی کہ انھیں اس بات کا بھی ہوش نہ رہ جاتا کہ وہ زبان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ ❷

خباب بن ارت رضی اللہ عنہما کو پکڑ کر زمین پر گرم چٹانوں سے ان کی پشت کو لگا دیا جاتا جس سے ان کی چربی پگھل کر ختم ہو جاتی، خباب رضی اللہ عنہ کا بیان یہ ہے کہ ایک دن لوگوں نے آگ جلائی پھر اس پر مجھے ڈال دیا اور ایک آدمی نے میرے سینہ پر اپنا قدم رکھ دیا میں پشت کے بل زمین پر پڑا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تھا کہ "تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے، میں نے آپ ؐ سے یہ ارشاد نہ سنا ہوتا تو اس دن میں اللہ سے موت مانگ لیتا۔ ❸

مسلمانوں پر زیادتیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ کچھ مسلمان ان مصیبتوں سے ڈانواں ڈول ہو گئے تھے، وہ اس ظلم کے مقابلہ میں برداشت کی طاقت کھو بیٹھے یہاں تک کہ مسلمانوں سے اللہ

---

❶ البلاذری (م ۲۷۹ھ) انساب الاشراف ج ۱ ص ۱۵۸ تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیہ دار المعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

❷ ایضاً ج، ص ۱۵۸۔۱۵۹۔

❸ محمد عزت دروزہ سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (؟ مقتبۃ من القرآن الکریم، طبع دوم ج ۲، ۲۸۳۰۸۴ مطبع عیسیٰ البابی قاہرہ ۱۹۶۵ء۔

تعالیٰ نے جس مدد کا وعدہ کیا ہے، اس پر ان کے دلوں میں شک پیدا ہونے لگا انھوں نے اس کا تذکرہ کیا تو سورۂ حج کی درج ذیل آیتیں نازل ہوئیں، جن میں ایسے لوگوں پر عمومی انداز میں موثر طریقہ سے تنبیہ کی گئی ہے۔ ❶

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ (الحج : ١١)

''اور لوگوں میں سے کوئی کوئی آدمی کی عبادت کرتا ہے کنارہ رہ کر پھر اُس کو اگر کوئی فائدہ ہوا تو مطمئن رہا اور کچھ آزمائش ہوگئی تو منہ اٹھا کر چل دیا اور دنیا اور آخرت دونوں کو ہی کھو بیٹھا یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔''

سعید بن جبیر نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ کیا مشرکین، رسول اکرم ﷺ کے ساتھیوں کو اس قدر سزائیں دیتے تھے، جن پر ان مسلمانوں کو دین سے اظہار براءت پر معذور قرار دے دیا جاتا تھا؟ انھوں نے فرمایا، اللہ کی قسم! یہی بات تھی، یہ لوگ مسلمانوں کو اتنا مارتے اور بھوکا اور پیاسا رکھتے کہ وہ اس کی وجہ سے ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ❷

## ہجرت حبشہ کی وجہ؟

واٹ اپنے نقطہ نظر کے مطابق مکہ مکرمہ میں سیرت طیبہ کے ایک مشہور واقعہ کا غالبًا انکار کرنا چاہتا ہے۔ اس بات کا انکار کہ مسلمانوں نے مشرکین کے دباؤ سے مجبور ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، وہ اس ہجرت کا دوسرا سبب بیان کرتا ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور ان کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طبقہ کو ہجرت حبشہ کا حکم دیا گیا، تاکہ مسلمانوں میں باقاعدہ دو پارٹیاں وجود میں نہ آ سکیں۔

❶ البلاذری (م ۲۷۹ھ) انساب الاشراف ج ا ص ص ۱۵۸ تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیہ دارلعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء ج ا ص ۱۷۸۔

❷ ابن ہشام، تہذیب ص ۱۷۲ البلاذری انساب ج ا ص ۱۹۷۔

ہجرت حبشہ اور پھر وہاں ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے قیام کا تجزیہ کرنے میں واٹ چار اسباب کے درمیان سرگرداں اور پریشان نظر آتا ہے۔ یہ اسباب درج ذیل ہیں۔

(۱)......ظالمانہ دباؤ سے بچ نکلنے کی کوشش۔

(۲)......ارتداد کے خطرہ سے دور ہو جانے کی خواہش۔

(۳)......تجارتی دلچسپیوں کو برقرار رکھنے کا جذبہ۔

(۴)......حبشہ کے باشندوں سے جنگی امداد کے حصول کے لیے جدوجہد۔

واٹ کو مذکورۂ بالا چاروں اسباب پر اعتماد کر لینے میں کوئی افادیت نظر نہیں آتی اس لیے اور ان سے مطمئن نہیں ہے، اور ان پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''اس خیال کو رد کر دینا بڑا مشکل ہے کہ ہجرت حبشہ کی پانچویں وجہ ہی لازمی طور پر اطمینان بخش ہے یعنی یہ بات کہ اسلام کی نوخیز امت کے اندورنی معاملات میں فکری حیثیت سے بڑی تفریق پیدا ہوگئی تھی۔ ❶ (اس سے پہلے واٹ اپنا یہ خیال بھی بیان کر چکا ہے کہ: حبشہ میں خالد بن سعید کے طویل قیام سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ان کو محمد ﷺ کی سیاست سے اختلاف تھا، وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی نوعیت سے متفق نہیں تھے۔ محمد ﷺ کی نبوت کی وجہ سے وہ ان کے سیاسی کردار کی اہمیت سے بھی اختلاف رکھتے تھے، خالد رضی اللہ عنہ کو رسالت کے سیاسی پہلوؤں کا لحاظ واہتمام ہوتا تو وہ محمد ﷺ کے ساتھ اپنے اختلاف کو نظر انداز کر کے ۷ھ سے پہلے ہی مکہ واپس آ جاتے۔'' ❷

واٹ نے چند واقعات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ اختلاف خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تھا، جن کو رسول اکرم ﷺ کے یہاں طاقت ور پوزیشن حاصل تھی، واٹ کے خیال میں اس اختلاف سے پیدا ہونے والے امکانی خطروں کے بدلہ میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مخالفوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۸۲۔۱۸۹۔ ❷ محمد ﷺ ایٹ مکہ، ص ۱۶۲۔

جانے کا مشورہ دیا، مگر واٹ کی طرف سے اس بارے میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، وہ ناکافی اور کمزور ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ یا بعض اور دوسرے حضرات جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے رفقاء کار تھے، مہاجرین اولین میں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے، جو نمایاں شہرت کے مالک نہ تھے، بعد میں اور خصوصاً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی سیاسی حیثیت سے ان کا کوئی اہم حصہ نہیں تھا، اس کو اختلاف کا شاخسار قرار دینا ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی کے دوسرے مشاغل میں لگے ہوئے تھے، حقیقی صورت حال تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بڑی تعداد میں ایسے لوگوں سے بھی تعاون لیا جو فتح مکہ کے موقع پر یا اس کے بعد ایمان لائے تھے، ان لوگوں سے بھی جن کے خاندانی بزرگوں نے اسلام سے معرکہ آرائی کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی کو اس کے ماضی کی وجہ سے نظر انداز کرتے تو ان لوگوں کو یقیناً نظر انداز کر دیتے۔ ان کو فوجوں کی قیادت بھی نہ دیتے، مگر فوجی مناصب ان کو دیے گئے، اور انھوں نے یہ خدمات بحسن وخوبی انجام دیں۔

قرآنی آیات ❶ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت کی وجہ وہ شدید دباؤ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے۔ مشرکین کی طرف سے اذیت رسانی کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جن کی وجہ سے مسلمان ہجرت پر مجبور تھے، اور اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ ❷ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ہجرت پر مجبور اور آمادہ ہو چکے تھے، مگر ایک قبیلہ کے سردار نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ ❸

## مکہ میں دعوت اسلامی کا بنیادی امتیازی

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے، مگر واٹ نے ان میں بھی صداقت سے روگردانی کرکے صحیح صورت حال کا انکار کیا

---

❶ دیکھیے سورۃ العنکبوت آیت ۲۳، بروج ۱۰، قصص ۵۷، زمر ۱۰، النحل ۱۴۱۔۱۱۰۔

❷ ڈاکٹر صالح احمد علی۔ محاضرات فی تاریخ العرب ج ۱ ص ۳۶۸ مطبع الزعیم بغداد ۱۹۶۱ء۔

❸ البلاذری۔ انساب ج ۱ ص ۲۰۵۔۲۰۶۔

ہے اور شک وشبہ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تا کہ وہ اپنے مفروضہ تخیل کی مدد سے واقعات کا تجزیہ کر سکے، اس کا خیال یہ ہے کہ:

رسول اکرم ﷺ نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پر براہ راست تنقید کبھی نہیں کی البتہ مکہ کے اطراف میں جو مورتیاں نصب تھیں آپ نے ان کو نامزد کر کے تنقیدی باتیں کہیں، اس لیے مکہ میں آپ کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ مکہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر یہ اندیشہ تھا کہ اس کے نتیجہ میں گردوپیش کے عرب زیارت کعبہ کا سفر بند کر دیں گے، اور مکہ کی تجارت تباہ ہو جائے گی، مخالفت کی یہ وجہ قابل قبول نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کعبہ کے بتوں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی ہے۔ البتہ گردوپیش کے بتوں کا ذکر کیا گیا ہے، مگر ان بتوں سے دست برداری کے بعد مکہ کی تجارت کو کیا نقصان پہنچا (اس تفصیل کے بعد واٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فتح مکہ کے ذریعہ مکہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ ❶

مگر شروع میں اور پھر فتح مکہ کے موقع پر، اور بتوں کی شکست وریخت کے وقت بھی کیا رسول اکرم ﷺ کی طرف سے علی الاعلان بت پرستی کی مخالفت نہیں کی گئی، یہ بت مکہ میں ہوں یا اس کے اطراف میں، بہر حال آپ کی مخالفت واضح تھی (اور اس پر آپ نے جب عمل درآمد کیا تو اس کی وجہ سے مکہ میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان تبدیلیوں کو ثانوی حیثیت دینا کیوں کر درست ہوسکتا ہے،) واٹ نے دوسرے مستشرقین کی تقلید میں جو تجزیہ کیا ہے وہ تاریخ اور عقیدہ دونوں کے لحاظ سے ناقابل قبول ہے۔ اسلام نے توحید خالص کی دعوت دی تھی، اس نے ابتدا ہی سے شرک اور بت پرستی کا انکار کیا، قریش مکہ کی قیادت کو اس کا بخوبی احساس تھا، اور یہی وجہ ہے کہ توحید کی اس دعوت کو ترک کر دینے پر وہ آپ کے ہر ایک مطالبہ کو منظور کرنے کے لیے تیار تھے، رسول اکرم ﷺ بھی ان سے ہر معاملہ پر گفتگو کے لیے آمادہ تھے، مگر توحید الٰہی کی قیمت پر آپ کو کوئی سمجھوتہ منظور نہیں تھا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے ایک طرف تو واٹ کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف

❶ محمد ایٹ مکہ ص ۲۱۳۔۲۱۴۔

تاریخی حقائق میں بلاذری کی روایت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے قریش کے بتوں اور ان کے دوسرے معبودوں پر اپنی تنقید میں شدت پیدا کر دی، تو قریش کی طرف سے دعوت اسلامی کی مخالفت میں بھی شدت پیدا ہوگئی۔ ❶ ابن ہشام۔ ❷ اور طبری ❸ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے رسول اکرم ﷺ کی چادر پکڑ لی اور یہ پوچھا کہ کیا آپ ہی نے ہمارے دین اور معبودوں کی مذمت میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ فرمایا! ہاں! میں نے ہی یہ باتیں کہی ہیں۔ ابن ہشام نے یہ لکھا ہے کہ سرداران قریش یک جا ہوئے اور انھوں نے رسول اکرم ﷺ کو گفتگو کے لیے مدعو کیا اور آپ ﷺ سے یہ کہا واللہ! ہمارے علم کی حد تک عربوں میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس نے آپ کی طرح اپنی قوم کو آفت میں مبتلا کیا ہو، آپ نے ہمارے بزرگوں کا غلط کار بتایا، ہمارے دین کی مذمت کی، معبودوں کو بے وقار کہا، عقل مندوں کو ناسمجھ قرار دیا اور ہمارے اتحاد کو ختم کر دیا، اگر ایسی باتوں سے آپ کا مقصد حصول دولت ہے تو ہم اتنا دیں گے کہ آپ سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جائیں، اور اگر جاہ و منزلت درکار ہو تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے (ان کی ساری گفتگو سن کر) رسول اکرم ﷺ نے ان کو جواب دیا کہ جو پیغام میں نے تمھارے سامنے پیش کیا ہے، اس کا مقصد دولت، جاہ و منزلت یا بادشاہت کا حصول نہیں ہے، مجھے تمھارے پاس اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، تم میرے پیغام کو قبول کرو گے تو دنیا و آخرت میں اپنا حصہ پا جاؤ گے اور اگر اسے رد کرو گے تو میں امر الٰہی پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ اللہ، میرے اور تمھارے درمیان کوئی اور فیصلہ فرما دے۔ ❹

ابن سعد نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ سردار قریش کا ایک وفد ابو طالب کے پاس آیا اور یہ درخواست لے کر گیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو باز رکھیں انھوں نے آپ ﷺ کو طلب کیا اور کہا کہ اے

---

❶ انساب ج، ص ۱۱۵۔۱۱۰۔

❷ تہذیب ابن ہشام ص ۵۷۔۱۶۱۔

❸ طبری تاریخ الرسل الملوک، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف، قاہرہ ۶۲۔۱۵۶۱ء دیکھیے ج ۲ ص ۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔

❹ تہذیب ابن ہشام، ص ۶۴۔ ۶۸۔

برادرزادے! یہ لوگ تمھارے باپ کے بھائی بند اور قوم کے سردار ہیں، اور تم سے انصاف کے طالب ہیں، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آپ لوگ اپنی بات کہیں، میں غور کروں گا، ان لوگوں نے کہا، تم ہم کو اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دو ہم تمھیں اور تمھارے معبود کو چھوڑ دیں گے۔'' ابو طالب نے قوم کی یہ بات سنی تو آپ سے کہا اور قوم نے تم سے انصاف کی بات کہہ دی ہے، اس کو منظور کرلو۔'' رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آپ لوگوں کا کیا خیال ہے میں یہ معاہدہ کرلوں گا مگر اس کے بدلہ میں آپ سب میری ایک بات مان لیں وہ بات ایسی ہے کہ اگر آپ لوگ اس کا اقرار کرلیں گے تو سارے عرب پر آپ کی حکمرانی ہوگی، اور عجم آپ لوگوں کے سامنے سرنگوں ہوجائے گا۔'' یہ بات سن کر ابوجہل نے کہا، تمھارے باپ کی قسم یہ تو بڑے فائدہ کی بات ہے، ہم یہ بات ضرور مانیں گے بلکہ اس جیسی دس باتیں ہوں تو وہ بھی ہمیں منظور ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آپ لوگ یہ ایک بات تسلیم کرلیں، لاالٰہ الا اللّٰہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، یہ بات سنتے ہی ان کے چہرے بدل گئے اور تکدر اور ناراضگی کے ساتھ یہ کہہ کر انھوں نے مجلس برخاست کردی کہ چلو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو۔ بھلا یہ بھی کوئی مطلب کی بات ہوئی۔'' [1]

واٹ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ ''تحریک اسلامی کے ذریعہ جو مذہبی تبدیلیاں ہوئیں وہ محض سیاسی اقتصادی، یا سماجی نوعیت کی تھیں۔'' حالانکہ اس کو منطقی انداز میں یہ بتانا چاہیے تھا کہ نئی دعوت اسلامی کے ذریعہ مکہ کے حالات کے مطابق کامل تبدیلیوں کی کیا صورت ممکن تھی، جو وجود میں نہیں آئی مگر چونکہ واٹ کا رویہ تعمیری اور مثبت نہیں ہے۔ اس لیے وہ ایک ہی بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ فتح مکہ کے ذریعہ جو تبدیلیاں ہوئی وہ ثانوی درجہ کی تھیں۔'' وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں اہل مکہ کو اقتصادی نقصانات کا اندیشہ تھا۔ [2] مگر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی کے ذریعہ سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں اقتصادی ترقیاں بھی شامل ہیں، حالانکہ دونوں باتوں میں تضاد ہے۔

---

1. طبقات ابن سعد ۱/ ۱۳۵۔
2. محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۴۔

## قریش کے منصوبہ قتل کا انکار

طبری اور ابن ہشام کی ایک مشہور روایت میں یہ ہے کہ ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے مکہ میں رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اپنا آخری موقف طے کرنے کے لیے ایک مشاورتی اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں سرداران قریش یک جا تھے، واٹ نے اس روایت پر بھی اپنے شبہات کا ذکر کیا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ اس موقع پر ان لوگوں نے محمد ﷺ کو قتل کر دیے جانے سے اتفاق نہیں کیا تھا، واٹ نے اس کے بجائے حسب عادت ایک دوسرا مفروضہ پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ غالباً اس اجتماعی مشورہ کے بعد محمد ﷺ پر سنگ باری ہوئی تھی۔

''یہ ایک واقعہ ہے کہ (سرداران قریش کی طرف سے) ایک مشاورتی اجتماع ہوا تھا، اس کے شرکا نے یہ محسوس کیا کہ محمد ﷺ ان کے بارے میں مخالفانہ منصوبے بنا رہے ہیں، جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشورہ کی اس نشست میں محمد ﷺ کو قتل کر دینے کے خیال سے لوگ متفق نہیں تھے، تاریخی مصادر کی تصریحات کے برعکس یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتماعی نشستوں میں قتل کے منصوبوں پر کوئی اتفاقی فیصلہ نہیں ہوتا۔ غالباً اس خطرے کے جلد ہی پیش آ جانے کا خوف تھا جس کی وجہ سے محمد ﷺ نے سفر میں عجلت کی۔ لیکن محمد ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو جو خطرہ درپیش تھا۔ اس کی صحیح نوعیت کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا مشکل ہے ہجرت کی داستان کو آراستہ کرنے کے لیے اس میں بہت سے اضافے کر دیے گئے ہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے ابتدائی مصادر میں اضافے موجود ہیں مگر یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ مشاورتی جلسہ کے بعد سنگ باری کی گئی ہو۔

''واٹ کی کتاب کا یہ اقتباس بھی تحقیقی کاوش کے بجائے ظن اور تخیل پر مبنی ہے، ایک بات فرض کر لی گئی، اور اس کی روشنی میں تاریخی حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا، اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل وثبوت کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی، قریش کی طرف سے محمد ﷺ کی روز افزوں

مخالفت اور آپ کی طرف سے ان کے عقائد و رسوم کی علی الاعلان تردید کے بعد آپ کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا، جس کا تاریخی شواہد میں ذکر موجود ہے، قتل کا یہ منصوبہ جن لوگوں نے بنایا تھا، وہی جب بعد میں مسلمان ہو گئے تو انھوں نے بھی پچھلے منصوبوں کی تردید نہیں کی۔ بلکہ مزید تائیدی بیانات فراہم کر دیے۔ ایسی صورت میں واٹ کی طرف سے ایک ''غالباً کا سہارا'' استشراق تحقیقات کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے، اس کے ذریعہ تو خود واٹ کی نیت بے نقاب ہو جاتی ہے، مگر وہ بڑی جرأت کے ساتھ سرداران قریش کی نیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔'' ❶

## قیاس اور تخیل کی مدد سے واٹ کی واقعات فریبی

واٹ نے اپنے خیال کی مدد سے ایسے واقعات اور طے شدہ نتائج فرض کر لیے ہیں، جن کا سیرت و تاریخ کے واقعات میں کوئی وجود ہی نہیں ہے، وہ کبھی تو کسی کمزور روایت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کسی ایسی بات پر زور دیتا ہے، جو سرے سے بے اصل ہو۔ اگرچہ تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور کے عام رجحانات اور اس زمانہ کے رنگ اور مزاج سے وہ روایت ذرا بھی میل نہ کھاتی ہو۔

وہ اس روایت میں تو شک پیدا کرتا ہے، جس کے صحیح ہونے کے امکانات ہوں اور اس روایت کی تائید کرنا چاہتا ہے جس کے غلط اور دروغ ہونے کے سارے قرائن موجود ہوں، واٹ کا طرز عمل دونوں صورتوں میں ایک سکہ کی طرح ہے جس کے دو رخ ہوں، مگر دونوں ہی صورتوں میں تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔

مثلاً قرآن مجید کی جس آیت میں سجدہ تلاوت کو چھوڑ دینے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ ❷ اس پر اپنی تحریر کا آغاز واٹ نے اس فقرہ سے کیا ہے کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ''............اس فقرہ کے بعد وہ اپنا یہ مفروضہ بیان کرتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی صف

---

❶ اضافہ از مترجم۔

❷ سورہ انشقاق ﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ﴾ ان مشرکوں کے سامنے جب قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تب بھی یہ سجدہ نہیں کرتے، (شرک اور بت پرستی میں مبتلا رہتے ہیں)۔

میں رسول اکرم ﷺ کی مخالفت یا دین سے ارتداد کا ایک واقعہ ہو سکتا ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ❶ اسی طرح طائف سے واپسی کے بعد نخلہ میں رسول اکرم ﷺ کو جو ایک تجربہ ہوا، اور جس کا تذکرہ سورہ احقاف (۲۹-۳۲) میں کیا گیا ہے۔ ❷ اس واقعہ سے رسول اکرم ﷺ کو روحانی طور پر تقویت ملی تھی مگر واٹ کا خیالی مفروضہ یہ ہے "دراصل رسول اکرم ﷺ انسانی معاشرہ کے بارے میں بے اعتمادی کا شکار ہو گئے تھے، اور جب مذکورہ آیتیں نازل ہوئیں تو آپ کی اعصابی گراوٹ ختم ہوئی اور آپ مطمئن اور پرسکون ہو گئے۔ ❸ مگر رسول اکرم ﷺ کی ثابت قدمی، استقلال اور آپ کی حوصلہ مندی کی صفات اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، رسول اکرم ﷺ کو انسانی معاشرہ پر ہمیشہ اعتماد رہا، اور دعوت اسلامی کا کام کرتے ہوئے آپ کے اعصاب کبھی بھی روبہ زوال نہیں ہوئے، آپ نے طائف سے واپسی کے بعد اپنا یہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ:

ان لم یکن بك غضب علی فلاأبالی۔

"اے اللہ! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو پھر مجھے (لوگوں کی طرف سے ایسے سلوک کی) کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

رسول اکرم ﷺ کا یہ فقرہ، حالات کے مقابلہ میں آپ کے اعصابی قوت کو بتا رہا ہے، اور یہ بھی کہ آپ کو نصرت الٰہی پر کتنا اعتماد تھا، اور دعوتی سفر کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے آپ کے اندر

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۱۔

❷ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے، اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کے پاس لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے وہ قرآن سنتے ہوئے کہنے لگے کہ خاموش رہو قرآن پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس جا کر کہنے لگے کہ اے بھائیوں ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اور حق اور راہ راست کی طرف راہنمائی کرتی ہے، اے بھائیوں تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف کر دے گا، اور دردناک عذاب سے محفوظ رکھے گا، اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا وہ زمین میں کسی کو ہرا نہیں سکتا اللہ کے سوا کوئی اور اس کا حامی بھی نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

❸ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۷۔

کسی قدر صلاحیت اور قوت برداشت موجود تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد رسول اکرم ﷺ کی دوسری زوجہ محترمہ حضرت سودا رضی اللہ عنہا بنت زمعہ تھیں ان کے بارے میں میں واٹ لکھتا ہے کہ:

''محمد ﷺ کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مخدوم کے ساتھ خادمانہ نوعیت کے تھے، مگر یہ تعلقات کس طرح کے تھے، اس کو کوئی نہیں جانتا، اس مجہول تخیل کے تائیدی واقعات کیا ہیں، ان کی بھی کسی کو خبر نہیں ہے۔'' ❶

واٹ کا ایک مفروضہ خیال یہ ہے کہ ۷ھ میں رسول اکرم ﷺ نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ طیبہ میں اس لیے بلایا تھا کہ ''وہ اس چھوٹے سے گروہ کے بل پر مدینہ میں اپنی مرکزی پوزیشن کو طاقتور بنانا چاہتے تھے۔'' ❷

واٹ کے مذکورہ بالا بیانات بے اصل ہیں۔ اس نے اپنے تخیل کی مدد سے صحیح صورت حال کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے وہ واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے قیاس سے تاریخ سازی کرنے لگتا ہے، اور اس پر دلیل وثبوت کے بغیر ہی اپنی عمارت تعمیر کرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل ظن اور تخیل کے پیدا کردہ فرضی واقعات اور شاذ اور ضعیف روایتوں پر اعتماد مستشرقین کی تحقیقات کا بنیادی امتیاز ہیں، واٹ نے ایسی ہی باتوں کو اپنے پسندیدہ اسلوب میں توثیق اور اعتماد کی سند دی ہے۔ اُس پر بڑا زور صرف کیا ہے مگر جب وہ تاریخ کے ثابت شدہ حقائق کو بیان کرتا ہے تو اس کا اسلوب درماندگی کا شکار ہو جاتا ہے، تاکہ ان میں شک پیدا کرنے یا ان کا انکار کرنے میں اسے زیادہ جدوجہد نہ کرنی پڑے۔ تحریر میں زور قوت پیدا کرنے والے الفاظ کو دھیان میں رکھتے ہوئے واٹ کا درج ذیل بیان پڑھیے۔

''ہم کو دو واقعات ملتے ہیں ہم ان دونوں کو ثابت شدہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ محمد ﷺ نے کسی وقت قرآن کا جز سمجھ کر چند آیتیں پڑھ دیں جو شیطان کی طرف سے کہی گئی تھیں یہ بات ممکن نہیں ہے کہ غیر مسلموں یا بعد کے مسلمانوں نے یہ کہانی اپنی طرف سے گھڑ لی ہو، محمد ﷺ نے یہ اعلان کیا کہ ان فقروں کو قرآن کا حصہ نہ

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۷۔ ❷ ایضاً ص ۱۸۱۔

سمجھا جائے، بلکہ ان کی جگہ ایسی آیتیں پڑھی جائیں جو اپنے مفہوم میں ان سے بالکل ہی مختلف ہیں، ابتدائی روایتوں سے وہ زمانہ متعین نہیں ہوتا، جس میں ایسا واقعہ ہوا تھا، قرین قیاس یہ ہے کہ یہ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد ہوا ہوگا، یہاں ایک تیسرا واقعہ بھی ہوا اسے ہم کئی واقعات کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس کی صحت پر ہمیں اعتماد بھی ہے۔ وہ یہ کہ محمد ﷺ اور ان کے مکی معاصرین کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قرآن میں چند معبودوں کی نشاندہی کریں، لات جس کی طائف میں پوجا کی جاتی تھی، عزیٰ جس کی مکہ کے قریب بطن نخلہ میں پوجا ہوتی تھی، اور منات جس کی جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھی......تو شیطانی فقروں کا مفہوم یہ تھا، کہ مکہ کے گردو پیش عبادت خانوں میں یک جا ہونا پسندیدہ بات ہے، لیکن جو آیتیں ان مقامات میں پوجا کو ناپسندیدہ کہتی ہیں، وہ کعبہ میں پوجا کو حرام قرار نہیں دیتیں۔''

ہم کو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جن آیتوں کے ذریعہ سورۂ نجم کی تصحیح کی گئی تھی، وہ دوسرے عبادت خانوں کے بدلہ میں کعبہ (میں پوجا) کی تقدیس بیان کرتی ہیں، البتہ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس سے پہلے ایسی آیات موجود تھیں، جو کعبہ میں پوجا کو حرام قرار دے رہی تھیں، اور بعد میں انھیں قرآن سے نکال دیا گیا تب کعبہ میں پوجا کی اجازت کا ہمارا خیال درست نہیں ہوگا، لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے، جس سے ہم اس طرح کی بات کو ثابت کر سکیں، یہاں ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ محمد ﷺ کا ستارۂ اقبال بلند ہوا تو گردو پیش کے یہ عبادت خانے ڈھا دیے گئے۔

بہر حال شیطانی فقروں کی اہمیت قابل لحاظ ہے، کیا محمد ﷺ نے ان کی صحت کو اس لیے مان لیا تھا کہ وہ مدینہ، طائف اور پڑوسی قبائل میں اپنے حامیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے؟ کیا وہ اپنے پیروکاروں کی تعداد بڑھا کر قریش کے مخالف لیڈروں کے اثرات کو کم کرنا چاہتے تھے؟ مذکورۂ عبادت خانوں کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمد ﷺ کا نقطہ نظر اب وسیع ہو چلا تھا۔

اس کے بعد واٹ نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

''شیطانی فقروں کی تنسیخ کا تعلق محمد ﷺ اور سرداران قریش کے درمیان حالات کو

ہموار کرنے کی کوششوں کی ناکامی سے ہے، ہمارے لیے یہ یقین کر لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ محمد ﷺ اہل مکہ کے فریب میں آگئے تھے، البتہ ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اللہ کی ان بیٹیوں کو (تینوں مورتیاں جن کو مشرکین مکہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے) تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کو ان کے معیار پر رکھ دیا جائے، جب کہ نخلہ، طائف اور قدید کی طرح کعبہ میں بھی پوجا ہوتی تھی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ محمد ﷺ اور وہاں کے کاہنوں (پجاریوں) میں زیادہ فرق نہیں تھا، ان کے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا کہ وہ ان پجاریوں سے زیادہ اثر پیدا کر لیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے پوری توجہ سے جس اصلاح کے لیے کوشش کی تھی وہ وجود میں نہیں آسکی، محمد ﷺ نے اہل مکہ کے پیش کیے ہوئے سازوسامان کو وقتی اسباب کے بجائے خالص مذہبی وجہ سے رد کر دیا تھا، اس کی وجہ مثلاً یہ نہیں تھی کہ آپ کو ان پر اعتماد نہ رہا ہو، آپ کی ذاتی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں اب مزید کسی چیز کی کمی نہ رہ گئی ہو، ان کی پیش کش کو رد کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معبودوں کو تسلیم کر لینے سے آپ ﷺ کی مہم ناکام ہو جاتی، اور وہ کام نہ ہو پاتا جس کی ذمہ داری آپ کو اللہ کی طرف سے سپرد کی گئی تھی، اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ وحی نے ان کو اس بات سے آگاہ کیا تھا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو اسی عرصہ وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔" [1]

ٹ نے اپنی مذکورۂ بالا بحث کا خلاصہ درج ذیل لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ:

"محمد ﷺ نے سرداران قریش کے مقابلہ میں اس قدر کامیابی تو یقیناً حاصل کر لی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی بات پر فکرمند ہو گئے تھے، چنانچہ ان کی طرف سے اس بات کی کوشش ہو گئی کہ آپ ﷺ کسی بھی صورت میں پڑوسی عبادت خانوں میں پوجا کو رہنے دیں، آپ ﷺ مادی فائدوں کی وجہ سے شروع میں تو اس بات پر آمادہ تھے،

---

[1] محمد ایٹ مکہ، عربی، ص ۱۶۶۔۱۷۲۔

آپ ﷺ کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ طرزِ عمل مقصد کی تکمیل میں آسانیاں فراہم کردے گا، مگر اللہ کی طرف سے نصیحت اور تنبیہ ہونے کے بعد آپ ﷺ کو دھیرے دھیرے یہ احساس ہوگیا کہ مذکورۂ بالا طریقہ پر باہمی مفاہمت تباہ کن ہوگی، چنانچہ انھوں نے اصل حقیقت کو قائم رکھنے کے لیے وسائل کو بہتر بنانے کا منصوبہ تیار کیا، اور تب شرک سے دست برداری کا ایسے سخت لفظوں میں اعلان کیا کہ مفاہمت اور سمجھوتے کے تمام راستے بند ہوگئے۔'' ❶

دراصل یہ داستان جس کو واٹ نے امرِ واقعہ کی حیثیت دی ہے، تاریخ اسلامی میں ایک من گھڑت روایت ہے، جو مشرکین نے پھیلائی تھی، اس داستان میں جو تضاد اور انتشار پایا جاتا ہے، وہ خود اس داستان کے بے سروپا ہونے کی نشاندہی کررہا ہے، کتابوں میں اس کہانی کو قصۃ الغرانیق ❷ بھی کہا جاتا ہے اس کہانی کا مقصد مشرکین مکہ کی طرف سے یہ ثابت کرنا تھا کہ محمد ﷺ سے غلطی کا امکان ہے، یا یہ کہ آپ ﷺ غلط بات کو بھی قبول کرسکتے ہیں، اور وہ بھی اللہ کی توحید جیسے واضح اور اہم معاملہ میں، جس پر آپ ﷺ کسی مفاہمت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور شرک جیسے اہم مسئلہ میں جس کو آپ ﷺ نے قطعی انداز میں ترک کردیا تھا، اس سے پہلے واٹ نے بھی اس بات پر زور دیا تھا مگر چونکہ یہاں اسے نسخ قرآن ثابت کرنا ہے، اس لیے مذکورہ بے اصل کہانی کو غلط یا مشکوک قرار دینے کے لیے وہ تیار نہیں، جب کہ اس کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اطمینان بخش دلیل یا قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔

## واٹ کا اپنے طرزِ تحقیق کے بارے میں دعویٰ

واٹ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ''ارشادِ الٰہی ہے'' یا ''محمد ﷺ نے یہ کہا ہے'' جیسے الفاظ سے احتراز کرتے ہوئے صرف اتنا کہے گا کہ ''قرآن کہتا ہے'' مگر مذکورۂ بالا

---

❶ محمد ایٹ مکہ، عربی، ص ۱۷۶۔۱۷۷۔

❷ عربی زبان میں غرانیق خوبصورت لڑکیوں کو بھی کہا جاتا ہے، چونکہ مشرکین مکہ مذکورۂ تینوں مورتیوں کو خداوند کی بیٹیاں سمجھتے تھے، اس لیے ان کے بارے میں مذکورہ کہانی بھی قصۃ الغرانیق کے نام سے مشہور ہوئی۔ (مترجم)

اقتباسات میں وہ اپنے گذشتہ دعویٰ کے برعکس ایسی تعبیرات اور الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محمد ﷺ حالات کے مطابق قرآنی آیات ترتیب دے لیا کرتے تھے، مثلاً اس کی درج ذیل عبارتیں:

(۱)...... محمد ﷺ نے یہ اعلان کیا کہ ان آیات کو قرآن کا جزو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس مفہوم رکھنے والی دوسری آیتوں کو ان کی جگہ پڑھنا چاہیے۔

(۲)...... محمد ﷺ پر یہ لازم تھا کہ قرآن میں لات (وغیرہ) معبودوں کا ذکر کریں۔

(۳)...... شیطانی فقروں میں (مذکورہ) عبادت خانوں کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمد ﷺ کے نقطہ نظر میں اب وسعت پیدا ہو چکی تھی۔

واٹ کے یہ بیانات ایک دوسرے سے متصادم ہیں، اس لیے کہ فوراً ہی اس نے مذکورہ طرز عمل کی غلطی کو واضح کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ قصۃ الغرانیق والی روایت اسلام کے بنیادی موقف سے میل نہیں کھاتی، کیونکہ رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کی دعوت دینے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، ذاتی حیثیت سے بھی یہ کہانی محمد ﷺ کے شایان شان نہیں ہے، کیونکہ دیگر معبودان عرب کو تسلیم کر لینے کے بعد تو (واٹ کے نزدیک) محمد ﷺ نبوت کے امتیازی مقام سے نکل کر عرب کے ایک عالم پجاری (کاہن) کی طرح ہو جاتے، مگر دعوت توحید سے واضح طور پر پسپائی اختیار کر کے واٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ محمد ﷺ ان معبودوں کو تسلیم کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے، اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس طرح ان کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہو چلی تھی، وہ استشراقی مقاصد اور تاریخی حقائق کے درمیان اعتراف وانکار میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرتے ہوئے تضاد بیانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

## شیطانی فقروں کی بے اصل کہانی

شیطانی فقروں یا خداوند کی بیٹیوں سے متعلق کہانی کو ابن سعد، طبری اور چند مفسرین نے بیان کیا ہے، مگر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ صراحت کی ہے کہ یہ تمام روایتیں اپنی سند کے اعتبار سے مرسل ہیں، ان میں درمیانی راویوں کے نام گم ہیں، کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو صحیح سند کے ساتھ

چشم دید راویوں کی نشاندہی کرتی ہو، رسول اکرم ﷺ پر کم سے کم افترا پردازی اور غلط بیانی کرنے والی روایت جس میں سب سے زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں، وہ ابن ابی حاتم کی بیان کردہ ہے، اس کی سند کا حال یہ ہے کہ اس کے راویوں کی آخری کڑی ابن شہاب ہیں، اس کے بعد رسول اکرم ﷺ یا ان لوگوں کے ناموں کا کوئی ذکر نہیں جو مذکورہ واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں، اس روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ ''سورۂ نجم نازل ہوئی، مشرکین یہ کہا کرتے تھے کہ یہ (رسول اللہ ﷺ) ہمارے معبودوں کا اچھے لفظوں میں تذکرہ کر دیں تو ہم ان کو اور ان کے ساتھیوں کو رہنے دیں گے، وہ ہمارے معبودوں کا جس برے انداز میں ذکر کرتے ہیں، اس طرح وہ یہود و نصاریٰ کا ذکر نہیں کرتے، حالانکہ وہ بھی ان کے دین کے خلاف ہیں، سورۂ نجم نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کی یہ آیت پڑھی:

﴿أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ٥ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى﴾ (نجم: ۱۹۔۲۰)

''اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی لات اور عزیٰ اور تیسری منات کی حقیقت پر کچھ غور کیا ہے۔''

اس موقع پر کسی شیطان نے درج ذیل الفاظ بھی پڑھ دیے:

وَإِنَّهُنَّ لَهُنَّ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتُهُنَّ لَهِيَ الَّتِي تُرْتَجٰى.

''یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، اور ان ہی کی سفارش قبول کی جائے گی۔''

اس موقع پر مشرکوں نے یہ الفاظ سنے تو انھیں یہ بات پسند آئی، اس کا ان میں چرچا ہونے لگا، اور وہ یہ سمجھے کہ محمد ﷺ نے اپنے پہلے دین سے رجوع کر لیا ہے، اور ان کے دین میں شامل ہو گئے ہیں، رسول اکرم ﷺ نے سورۂ نجم کی آخری آیت پر سجدہ کیا اور وہاں مسلم و مشرک موجود بھی تھے سب نے سجدہ کیا، ہر فریق کو دوسرے کے سجدہ کرنے پر حیرت ہوئی، مسلمانوں کو مشرکین کے سجدہ کرنے پر تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، مسلمانوں نے وہ الفاظ بھی نہیں سنے تھے جو شیطان کی طرف سے مشرکین کو سنائی دیے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی طرف سے تلاوت آیات کے درمیان جو شیطانی فقرے مشرکوں نے سنے، ان سے مشرکوں کو بڑا سکون ملا، شیطان نے ان کے جی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیا کہ یہ الفاظ رسول اکرم ﷺ نے پڑھے ہیں، اسی لیے وہ اپنے معبودوں کی تعظیم میں سجدہ ریز ہو گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے شیطانی فقروں کی قلعی کھول:

دی، واضح آیتیں نازل کر کے دجل وفریب سے قرآن کی حفاظت کا یہ کہہ کر! اعلان کر دیا کہ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں اس امر کی مکمل وضاحت اور شیطانی فقروں کی تردید کے بعد مشرکوں کی بے راہ روی، اور مسلمانوں سے عداوت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا......

مذکورہ روایت کے مقابلہ میں کچھ دوسری روایات وہ ہیں جن میں مزید افترا پردازی کی گئی ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ وہ فقرے رسول اکرم ﷺ کی زبان سے ادا ہوئے تھے، ان روایات کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے قریش مکہ کے ساتھ مصالحت اور خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔

مذکورۂ بالا کہانی کی تمام ہی روایات سرے سے بے اصل ہیں، کیونکہ نبوت اور کلام الٰہی دونوں کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کی دست درازی اور تحریف سے محفوظ رکھا ہے، مگر ان روایتوں کے بے اصل ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ سورہ میں سیاق کلام ہی ایسا ہے جس کی روشنی میں مذکورہ کہانی بے جوڑ اور من گھڑت معلوم ہوتی ہے، ان آیتوں میں معبودان باطل اور بے حقیقت اوہام کے بارے میں دونوں شیطانی فقرے کسی طرح بھی شامل نہیں کیے جا سکتے، سیاق کلام کی روشنی میں یہ روایت بھی بے جوڑ ہے کہ شیطان کی طرف سے مسلمانوں کے بجائے مشرکین کو یہ فقرے سنائی دیے تھے، ان مشرکین کے لیے بھی غلط فہمی کی گنجائش نہ تھی، وہ عرب اور اپنی زبان کے مزاج شناس تھے، مذکورہ فقروں کے فوراً بعد ہی یہ آیتیں ہیں:

﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ

عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ (النجم: ۲۱۔۲۸)

''کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں، اور اللہ کے لیے بیٹیاں، یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی، یہ نرے نام ہی نام ہیں، جن کو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تو ان کی کوئی دلیل بھیجی نہیں، یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آ چکی ہے، کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے، دنیا آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے، اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں، ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی جب تک کہ اللہ جس کے لیے چاہیں، اجازت نہ دے دیں اور راضی ہوں، جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔''

مشرکین مکہ سیاق کلام کی ان آیتوں کو سن کر غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ اس جگہ شیطانی فقرے بے جوڑ ہیں ان کے معبودوں کی تعریف اور خداوند کے یہاں ان کی سفارش کو قبول کیے جانے کی توقع کا ذکر ہے بھی ان آیتوں کے درمیان شامل کیے جانے سے بات بے ربط ہو جاتی ہے، یہ مشرکین اس قدر نادان نہیں تھے جیسے وہ لوگ جنھوں نے یہ بے اصل داستان بنائی ہے اور جس کو لقمۂ تر سمجھ کر ان مستشرقین نے اپنی غرض مندی یا ناواقفیت کی وجہ سے قبول کر لیا ہے۔ ❶

## ابن شداد کی روایت

واٹ نے دیانت داری، معروضیت، غیر جانب داری اور خلوص کے ساتھ سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کے بلند بانگ دعویٰ کا انجام کیا ہوا، سیرت کے قطعی اور صحیح واقعات کو بیان کرتے ہوئے تو اس کا اسلوب بڑا ہی کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے مگر اپنی خام خیالی کو ثابت کرنے میں اس کے یہاں زور اور قطعیت پائی جاتی ہے، جس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے،

❶ سید قطب، فی ظلال القرآن پارہ ۲۷ ص ۶۳۳۔۶۳۶ ج ۷، طبع پنجم، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۶۷ء۔

وہ لکھتا ہے کہ "فرشتہ کی طرف سے اِقْـرَأْ (پڑھ) کہنے پر محمد ﷺ کے جوابی فقرہ مَـا اَقْـرَأ کا یہ مطلب لینا ضروری ہے کہ میں پڑھنے پر قادر نہیں ہوں، اس مفہوم کی اس روایت سے تصدیق ہوتی ہے جس میں یہ جواب نقل کیا گیا ہے کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ (میں کیا چیز پڑھوں) حالانکہ ابن ہشام میں مَا اَقْرَأُ (میں کیا پڑھوں) اور مَاذَا اَقْرَأُ (میں کیا چیز پڑھوں) کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں، مَا اَقْرَأ کے لفظ سے بھی سادہ طریقہ سے یہی دوسرا مفہوم نکلتا ہے کہ میں کیا پڑھوں؟ مگر یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے تقلیدی ذہن رکھنے والے مفسرین ان لفظوں کے سادہ مفہوم سے بچتے ہیں، تاکہ وہ اپنے اس بنیادی خیال کو قائم رکھ سکیں کہ محمد ﷺ کتابت نہیں جانتے تھے، تفسیر طبری میں ابن شداد کی روایت ہے جس میں مَا کا لفظ مَاذا کے معنی میں سمجھنا چاہیے، (یعنی نفی کے بجائے استفہام کے معنی لیے جائیں) کیونکہ اس سے پہلے معجزانہ اسلوب ومزاج کا ایک نمونہ یہ آیت بھی ہے۔ ❶

واٹ نے اس موقع پر بھی ایک شاذ روایت کا سہارا لیا ہے، حالانکہ ابن شداد کی ایک اور روایت جو ابن جریر طبری نے مذکورہ شاذ روایت سے پہلے درج کی ہے۔ ❷ وہ بخاری شریف وغیرہ کی معروف روایتوں کے مطابق ہے، پھر واٹ نے ابن شداد کی شاذ روایت میں مَا اَقْرَأ سے پہلے جو "ذ" ہے، اس پر اپنے خود ساختہ اصول کی مدد سے تحریف کی کوشش کی ہے، جب کہ عربی زبان وادب میں ایسا کوئی قاعدہ موجود نہیں ہے، کہ اگر "مَا" سے پہلے "ذ" ہو تو نفی کے بجائے استفہام مراد ہوگا، مگر واٹ نے اپنے فرضی مفہوم کو بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے، جب کہ بخاری کی روایت نے اس لفظ کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا ہے، اس میں ما انا بقارئ (میں ان پڑھ ہوں) کے الفاظ موجود ہیں، اور معروف نحویوں نے یہ تصریح کی ہے کہ "ما" کے بعد اگر حرف جر "ب" ہو تو اس سے نفی ہی کہ معنی مراد ہوں گے۔ ❸ اس لیے رسول اکرم ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں، البتہ یہاں ایک بات اور بھی کہی جاسکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اگر

---

❶ محمد ﷺ ایٹ مکہ، ص ۸۵۔۸۶۔
❷ تفسیر ابن جریر طبری، ج ۳۰، ص ۱۳۸ مطبوعہ مصر ۱۳۰۶ء۔
❸ فتح الباری ج ۱، ص ۲۲ بولاق مصر ۱۳۰۱ء۔

استفہام تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ پڑھ بھی سکتے تھے، کیونکہ تاریخی شواہد سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کو امی کہا گیا ہے، اس لیے فرشتہ کی طرف سے اَقْرَأْ (پڑھ) کے جواب کو استفہامیہ تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ کسی تحریر کو پڑھ بھی سکتے تھے، کیونکہ فرشتہ نے آپ ﷺ کے سامنے کوئی تحریر پیش نہیں کی تھی، اس نے زبانی فرمائش کی تھی، اس لیے اس کے جواب میں ''میں کیا پڑھوں'' کا مفہوم صرف یہی ہوگا کہ فرشتہ جو الفاظ پڑھوانا چاہتا تھا وہ کیا ہیں؟ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ فرشتہ نے جو الفاظ کہے وہ آپ ﷺ نے اپنی زبان سے ادا کر دیے، لہٰذا استفہام کے معنی لینے کے بعد بھی واٹ کی مراد پوری نہیں ہوتی، وہ ایک ایسی بات ثابت کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی بھی دلیل یا ثبوت موجود نہیں ہے۔ ❶

دور جاہلیت میں بعض مشرکین مکہ کو یہ وہم تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے اہل کتاب سے حصول علم کیا ہے، یا کم از کم یہ بات ضرور ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں ان کا اثر قبول کیا ہے، اور ان سے استفادہ کیا ہے، مگر مشرکین مکہ نے اس خیال کو کبھی اہمیت نہیں دی، اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی ان کے سامنے تھی، اور اہل کتاب سے استفادہ کو بے اصل بات سمجھتے تھے، مگر واٹ نے اپنے خاص انداز میں یہی بات اس طرح لکھی ہے جیسے کہ وہ کوئی ثابت شدہ واقعہ ہو، وہ لکھتا ہے کہ:

> ''اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ ورقہ بن نوفل سے (جو آخر عمر میں عیسائی ہو گئے تھے) خدیجہ رضی اللہ عنہا متاثر تھیں، اور ہو سکتا ہے کہ محمد ﷺ نے ورقہ کے جذبات وخیالات کو قبول کر لیا ہو۔'' ❷

ورقہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ایک اہم واقعہ ہے، ناموس کے لفظ کے ساتھ جو فقرہ نقل ہوا ہے، اس کی صحت کے بارے میں بھی کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، قرآنی لفظ توراۃ کے بجائے اس

---

❶ اضافہ از مترجم۔

❷ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۷۵۔

لفظ کا نقل کیا جانا روایت کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں ہے...... ورقہ بن نوفل سے محمد ﷺ کی ملاقات کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے وہ اس روایت سے زیادہ بہتر ہے جس میں دونوں کی ملاقات کا ذکر نہیں ہے...... ناموس کا لفظ یونانی زبان کے لفظ (Nomos) سے بنا ہے اس لیے اس سے شریعت یا کتب مقدسہ (بائبل) مراد ہیں، روایت میں موسیٰ کے تذکرہ سے یہ بات پوری طرح میل کھاتی ہے، محمد ﷺ وحی حاصل کرنے لگے تو ورقہ نے جو رائے دی ہے، اس کا یہی مفہوم ہے کہ محمد ﷺ پر یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ کی طرح کی چیز نازل ہوئی تھی، محمد ﷺ نے جو کچھ سنا تھا اس کی وجہ سے انھیں یہ خیال ہوا کہ وہ ایک نئی امت کے بانی اور صاحب شریعت ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے مزاج وطبیعت کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھے، اس لیے اس سے پہلے کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں کوئی بڑا تعمیری قدم اٹھاتے، ورقہ کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی کو ان کے اندرونی انقلاب میں بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ❶

## گذشتہ مذہبی کتابیں اور قرآن مجید

دو جاہلیت میں جس طرح وحی کو سمجھنے سے کچھ لوگ قاصر رہے، اسی طرح واٹ بھی حقیقت وحی سے بے خبر ہو کر مختلف باتیں فرض کرتا چلا جاتا ہے، وہ یہ تو کہتا ہے کہ اگر ہم یہ فرض کر لیں تو بہتر ہوگا کہ محمد ﷺ نے بہت پہلے سے ورقہ سے تعلقات استوار کر لیے تھے، ❷ اور پھر وہ اپنے اس مفروضہ پر کوئی دلیل بھی پیش نہیں کرتا، واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا، اس لیے کہ کسی بھی تاریخی روایت یا دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسول اکرم ﷺ اُمی نہیں تھے، دور جاہلیت کے متعلق بیان کرتے ہوئے بھی واٹ جانبدار تعصب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ تاریخی شواہد پیش کرنے کے بجائے پہلے چند مفروضات قائم کرتا ہے اور ان ہی پر اپنی عمارت تعمیر کرتا چلا جاتا ہے، رسول اکرم ﷺ کے اُمی ہونے پر قرآن مجید نے جو واضح اور قطعی انداز بیان اختیار کیا ہے اس کے خلاف مشرکین مکہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے، اس لیے قرآن ہی کا فیصلہ وہ واضح اور یقینی ثبوت ہے جو اس مسئلہ کو آخری طور پر حل کر دیتا ہے کہ آپ ﷺ نے کس سے استفادہ کیا، اور آپ ﷺ کا

❶ محمد ایٹ مکہ ص ۵۷۔ ❷ ایضاً ص ۹۳۔

ذریعہ معلومات کیا تھا، قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِىْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (النحل: ۱۰۳)

''ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمھارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو کوئی آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے، حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے، اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔''

قرآن مجید اور گذشتہ مذہبی کتابوں میں اگر کہیں کچھ مسائل کے حل کے سلسلہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حل ایک ہی سرچشمہ یعنی ذات الٰہی سے مستفاد ہے، توراۃ وانجیل کے ذریعہ جس تعمیری کام کا آغاز ہوا تھا، اس کی تکمیل کے لیے قرآن مجید نازل کیا گیا ہے۔

﴿وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (یونس: ۳۷)

''اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی وتعلیم کے بغیر تصنیف کرلیا جائے، بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب کائنات کی طرف سے ہے۔''

﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (انعام: ۹۲)

''یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی خیر وبرکت والی ہے، اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔'' [1]

اس جگہ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار آیتوں نے توراۃ وانجیل میں تحریفات کی صراحت کی ہے، بہت سی جگہ کے برعکس دوسرے احکام وواقعات دیے ہیں، یا تورات وانجیل کے بہت سے بیانات کی تردید کی ہے، کئی ایسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جن کو

[1] مزید دیکھیے سورہ بقرہ، ۸۹، ۹۱، ۹۷، ۱۰۱، آل عمران، ۳، ۳۰، ۸۱ یوسف ۱۱۱، احقاف، ۱۳، ۳۰، نساء، ۴۷، مائدہ، ۴۶، ۴۸، فاطر، ۳۱۔

تورات وانجیل نے سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔

واٹ نے سیرت نبوی ﷺ میں اپنے خیالات کی آمیزش اس طرح کی ہے کہ (پہلی نظر میں) مطالعہ کرنے والا اس سے بے خبر رہتا ہے، وہ اپنی تحریروں میں جذباتی انداز کی بجائے دقیقہ سنجی، تاثیر، اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے چونکا دینے والا انداز بیان اختیار کرتا ہے، ممکن ہے کہ اس نے ایسا عمداً نہ کیا ہو، مگر اس کا انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سیرت نبوی ﷺ کے دور رس اثرات اور امتیازی اوصاف کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نظروں میں کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے طرز بیان کے متعدد نمونے اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں، مثلاً مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر دباؤ کو کمتر ثابت کرنا، یا ہجرت حبشہ کا سبب کچھ اور ہی قرار دینا، یا مکہ میں رسول اکرم ﷺ کے بارے میں منصوبہ قتل سے انکار یا مسلمانوں کے درمیان مکہ مکرمہ ہی میں دو گروہوں کو ثابت کرنے کی کوشش، یا واٹ کی طرف سے اس بات پر اصرار کہ رسول اکرم ﷺ مکہ میں دعوت توحید کو ترک کرنے اور مشرکانہ طور وطریق اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ واٹ سیرت نبوی ﷺ کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کے بجائے اپنے محدود تصورات اور فرضی خیالات کو پیش کرنے سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، گذشتہ صفحات میں مستشرقین پر واٹ کا تبصرہ گذر چکا ہے، لامانس پر اس نے بڑی سخت تنقید کی ہے، اور یہ تک لکھ دیا ہے کہ:

> ''لامانس کا یہ شرارت انگیز فرضی خیال ہے کہ مکہ کی طاقت وقوت حبشی غلاموں کی ایک فوج کے بل بوتہ پر قائم تھی، حالانکہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔'' ❶

ٹیوڈر نولدیکی نے لامانس کے مطالعہ پر اپنے خیالات پیش کیے تو اس پر واٹ نے یہ رائے دی کہ:

> ''اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کتاب سے غلو پسند لامانس کے بہت سے خیالات میں ترمیم کر لی جائے۔'' ❷

واٹ نے کائے تانی پر بھی تنقید کی ہے، اور پھر تحقیق کے تعمیری انداز بحث پر اظہار خیال

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۹۳۔ ❷ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۹۔۱۰۔

کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''یہ بات یقینی ہے کہ جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں، ان کے مصنفین کے پاس تاریخ کا صحت مند ذخیرہ موجود تھا، جس کو انھوں نے اپنی کتابوں میں ذہانت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔'' ❶

## واٹ کے دو رخ

سیرت کے مباحث پر واٹ نے قلم اٹھایا تو وہ مستشرقین پر اپنے اعتراضات کو بھول گیا، اور ان ہی کی ڈگر پر چل پڑا، وہ سیرت طیبہ کے مکی دور کے بارے میں ہر ایک تاریخی روایت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ان کا انکار کرتا یا ان میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ان کو بیان کرتے ہوئے درمیان میں اپنے فرضی خیالات بھی شامل کر دیتا ہے، وہ اگر کسی روایت کو صحیح قرار دیتا ہے تو اس میں گومگو کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، مثلاً اس کے درج ذیل فقرے:

''یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ اسے بعد کے افکار سے ہم آہنگ بنانے کے لیے ہی (تاریخ میں) درج کیا گیا ہو۔'' ❷

''اگر ہم ان روایات کو صحیح تسلیم کر لیں تب بھی......'' ❸

''قریش کے لیڈروں کی طرف سے پیش کش کی داستانیں اگر صحیح ہیں تو......'' ❹

''ایسی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ ہم تقلیدی روایتوں کی بیان کردہ نمایاں باتوں کو قبول کر لیں۔'' ❺

''ان میں صحت کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔'' ❻

اسی طرح واٹ غالباً یہ ہے، ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ جیسے الفاظ سے اپنے خیالات پیش کرتا ہے، اور پھر بعد میں انھیں تسلیم شدہ حقائق کی طرح منوانے کی کوشش کرتا ہے، واٹ کے تحقیقی انداز

---

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۳۔
❷ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۶۳۔
❸ محمد ایٹ مکہ
❹ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۷۔
❺ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۳۲۔
❻ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۱۶۶۔

بحث کا یہ مثبت پہلو ہے، منفی پہلو کے لحاظ سے اس نے اگرچہ لامانس کی طرح سیرت طیبہ کے مکی دور کے تمام واقعات کو بعید از قیاس قرار نہیں دیا ہے، تاہم وہ اس دور میں سیرت نبوی ﷺ کے مختلف اثرات اور کئی خصوصیات کا انکار کرتا ہے، ایک مورخ اپنے ظن وقیاس کے بل پر کسی دلیل وثبوت کے بغیر اگرچہ واقعات کا انکار کرتا ہے تو وہ اس طرح پوری تاریخ ہی کو خلاف واقعہ ثابت کر سکتا ہے، اگر وہ تحقیق و بحث کے اصول کا پابند نہیں ہے تو وہ تسلیم وانکار دونوں صورتوں میں کہیں بھی رک سکتا ہے، اور کسی بھی سمت میں جا سکتا ہے۔

اس موقع پر ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ ایک مسلمان مورخ کو ہر ایک تاریخی روایت کے سامنے سرنگوں ہو جانا چاہیے، یا اسے روایتوں میں نقد وتجزیہ اور قیاس وتخیل سے ہر حال میں احتراز کرنا چاہیے، ہمارا مقصد یہ ہے کہ بحث وتحقیق کرتے ہوئے ہر ایک چیز کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جانا اور تنقیدی رجحان میں غلو سے کام لینا تاریخی صداقتوں سے روگردانی کا سبب بھی بن سکتا ہے، تاریخ کا مطالعہ یا تاریخی صداقتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم تاریخ کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھ لیں، اسی بارے میں کسی مورخ کے پابند نہ ہوں۔ [1] تاریخی روایتوں کو پرکھنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں محدثین نے ہمارے لیے قابل قدر نمونہ پیش کیا ہے، اس راہ میں ہمیں ابن خلدون جیسے صاحب نظر مورخ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جس نے گذشتہ دور کے کئی مورخوں پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ وہ ہر ایک روایت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ان روایتوں کو بھی جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔

اس لیے تاریخ کی کتابوں میں درج ہر ایک بات کو قبول کر لینا غلط ہے، مگر پوری تاریخ ہی پر شک کرنا اور ہر تاریخی روایت کو نظر انداز کر دینا بھی درست نہیں ہے، دونوں صورتوں میں ہم تاریخی صداقتوں سے محروم ہو جائیں گے، اور تاریخ کے بنیادی سرمایہ کو گم کر دیں گے۔

## سیرت طیبہ کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کا مطالعہ ضروری ہے

ایک اور بات جو سب ہی مستشرقین میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سیرت طیبہ کے واقعات

---

[1] تاریخی روایات کے بارے میں معتدل تنقیدی انداز تحقیق پر دیکھیے مولف (عمادالدین خلیل) کی کتابیں "فصول فی المنهج والتحليل" اور حول منهج التاريخ الاسلامی."

کے صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس زمانہ کے عربی ماحول سے تو صرف نظر کر لیتے ہیں، اور پھر خود اپنے ہی زمانہ کے آئینے میں، اپنے ہی رسوم وقیود سے بندھے ہوئے ماحول میں ان واقعات کو سمجھنے اور اپنے خیالات کا ان پر عکس ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، مغربی محققین نے سیرت رسول اکرم ﷺ پر جو کام کیا ہے، ان میں تحقیق کی یہ خامی ہر جگہ موجود ہے۔

ان تحقیقات میں مغرب کی ذہنی پیچیدگیاں اور ان کی تہہ میں مذہبی جذبات ایک ساتھ کارفرما ہیں، مزید برآں سیکولر رجحانات، مادہ پرست زندگی کے اصول، ان کا مصنوعی نقطہ نظر، اور ہر چیز کو اسی روشنی میں جانچنے کی خواہش، روحانی اور غیبی امور میں بھی اسی نقطہ نظر کی عکاسی اور یہ خیال کہ تجربہ اور نظر میں نہ آنے والی چیز بے اصلی اور وہم ہے، یہ باتیں استشراقی تحقیقات میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

سماجی علوم اور خصوصاً تاریخ انسانی کے بارے میں اہل مغرب احساس برتری میں مبتلا ہیں، وہ اپنی عظمت کے نشہ میں چور ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مسئلہ کو سمجھنے اور ہر گتھی کو سلجھانے پر انھیں قدرت حاصل ہے، مستشرقین کی تحقیقات میں ان کے یہ احساسات وجذبات پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔

زمان ومکان کے فرق کی وجہ سے ایک ہی بات کے اثرات یا اس کے بارے میں سوچنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے، کسی بات پر ایک ماحول میں لوگ چونک پڑتے ہیں، لیکن دوسرے ماحول میں صرف رواج کے مطابق ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی رد عمل نہیں ہوتا، ایک واقعہ جو کبھی حالات کے تقاضے کے مطابق نظر آ رہا تھا، اگر حالات بدل جائیں تو اب وہ بے موقع اور بے عمل معلوم ہوگا، بیسویں صدی میں کسی حادثہ پر کسی ماحول میں عمل اور رد عمل کا جو سلسلہ نظر آئے گا، ضروری نہیں کہ اس پر ہر زمانہ میں اور ہر ایک ماحول میں لازمی طور پر وہی رد عمل پیدا ہو، مگر یہ مستشرقین سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخ کی کتابوں میں اسی رد عمل کی تلاش وجستجو میں مصروف نظر آتے ہیں، جو مغرب میں ان کے اپنے ماحول میں ظاہر ہو سکتا تھا، اہل مغرب اپنے رد عمل کو عربوں کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں، اور اگر اس کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آ جائے تو اسی کے اردگرد پوری تاریخ کو گردش دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

## واٹ کا تضاد

واٹ نے سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اگرچہ تاریخ کے مادی نقطہ نظر کو رد کر دینے کا دعویٰ کیا ہے، مگر وہ کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور اسی راہ پر گامزن ہے جو راہ دوسرے مستشرقین نے اختیار کی ہے۔

اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات سے علیحدہ ہو کر خالص معروضی طریقہ پر بحث وتحقیق میں حصہ لے گا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "میں نے ان فقہی مسائل میں جو مسیحیت اور اسلام کے درمیان چھڑ گئے ہیں، ایک غیر جانب دارانہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح یہ جاننے کے لیے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہے یا کلام رسول نہیں ہے، میں نے ہر بار قرآن سے دلیل پیش کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے" یا "محمد ﷺ فرماتے ہیں" کے الفاظ سے احتراز کیا ہے، میں سادہ طور پر صرف اتنا کہوں گا کہ قرآن کہتا ہے" لیکن مورخ کی غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کے لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مادی نقطہ نظر کو اختیار کرنا بھی میرے لیے کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اس کے برعکس میں ایک شریعت پسند اور توحید پر ایمان رکھنے والے شخص کی طرح اظہار کروں گا۔ ❶ (اس کے بعد واٹ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ) "میرا تحقیقی کام یقیناً ایک پہلو سے ناقص رہے گا، کیونکہ اسلام کے ساتھ مسیحیت کے جو روابط ہیں ان میں عیسائیوں پر ایک فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے بارے میں وہ اپنے رویہ کو متعین کریں، اس رویہ کو فقہی مسائل کی روشنی میں طے کرنا ہوگا، لہٰذا اس پہلو سے میری کتاب میں جو کمی رہ جاتی ہے اس کا مجھے اعتراف ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کتاب میں تاریخ کا وہ ضروری حصہ یک جا کر دیا گیا ہے جس کی روشنی میں عیسائیوں کے لیے (محمد ﷺ کے بارے میں) فقہی اور قانونی رویہ متعین کرنے میں مدد ملے گی۔" ❷

> "مغرب میں تاریخ کے جن اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے ان کی صحت اور افادیت کے حق میں مخلص ہونے کے باوجود میں نے اس پابندی کو قبول کرلیا ہے کہ امکانی حد تک

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) مقدمہ ص ۵۔ ❷ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) مقدمہ ص ۵۔

کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو اسلام کے بنیادی عقیدوں سے متصادم ہو، اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مغرب کے علم اور اسلامی عقیدہ کے درمیان بڑا تفاوت ہے، اگر مغربی علماء کے کچھ خیالات مسلمانوں کے لیے نا قابل فہم ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے یہ اہل علم اپنے علمی اصولوں کے حق میں ہمیشہ مخلص نہیں رہے، دقیقہ رس تاریخی زاویہ سے ان کے خیالات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔'' ❶

مستشرقین کے بارے میں واٹ کے مذکورۂ بالا رائے قابل قدر ہے، مختلف ملکوں میں مستشرقین کی طرف سے اسلام کے خلاف کتابوں کا ایک انبار لگ گیا ہے، اگر ان میں واٹ کے نزدیک بنیادی تحقیق کے علمی اصول وضوابط کے بجائے غلطی کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان اصولوں کو اپنے مقصد کے لیے صحیح ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا۔

مذکورہ اعتراف کے باوجود واٹ مغربی ماحول کے دیگر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا ہے، وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں تو غیر جانب داری کا مدعی ہے، مگر چند ہی سطروں کے بعد مکی دور کی تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے وہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے رویہ میں دو باتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، وہ قرآن مجید کے تاریخی بیانات کے برمحل ہونے سے مطمئن نہیں ہے، اور قرآن مجید نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، واٹ ان کے اردگرد شبہات پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ مقدمہ کتاب ہی میں لکھتا ہے کہ:

''کسی وقت یہ رسمی خیال تھا کہ مکی دور کو سمجھنے کے لیے قرآن ایک اہم ماخذ ہے، اس مدت کے لیے قرآن ایک معاصر ضرور ہے، مگر جانب دارانہ حیثیت سے اس کے مختلف اجزاء کے درمیان ایک تو زمانی تسلسل کو قائم رکھنا دشوار ہے، اور اس کوشش سے جو نتائج برآمد ہوں گے، ان کے اردگرد شک منڈلاتا ہوگا، قرآن مکی دور میں محمد ﷺ یا مسلمانوں کی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کرنے میں ہمارے لیے کسی طرح بھی معاون نہیں ہے، مکی دور کی نمایاں باتوں کے متعلق سیرت میں جو خاکہ پیش کیا گیا ہے مغرب

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) مقدمہ ص:٦۔

کے سیرت نگاروں نے صرف اسے ہی تسلیم کیا ہے، اور اس کے دائرہ میں رنگ بھرنے کے لیے قرآن اور ابتدائی حدیثوں کی ماخذ کی حیثیت دی جائے، جس سے مذکورہ مدت کی تاریخ کو سمجھنے میں یہ دونوں مشترکہ طور پر ایک دوسرے کے خلاء کو پر کریں، قرآن مجید ہمیں یک جا طریقہ سے ان تبدیلیوں کے فکری پہلو سے باخبر کرتا ہے جو مکہ اور اس کے اطراف میں رونما ہوئیں، لیکن ایک موزوں خاکہ بتانے اور خود فکری پہلو کو بھی اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کو اہمیت دینا ضروری ہے۔'' ❶

قرآن مجید کو جانب دار قرار دینا، اس کے بیانات کو بے محل بتانا اور اس کے ذکر کردہ تاریخی نتائج کی صداقت میں شک کرنا، واٹ جیسے مستشرق کا کام ہوسکتا ہے، ہم اس پر فرض تو عائد نہیں کر سکتے کہ وہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب تسلیم کرے، مگر ہم مسلمانوں کی طرف سے واٹ کے اس انداز کے تبصروں کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے قرآن مجید کو ایک تاریخی ماخذ تسلیم کر لیا جائے تب بھی قرآن مجید کے بے محل بیانات یا اس کے مشکوک نتائج پر واٹ نے کوئی ایک دلیل بھی نہیں دی، اس کی کتاب اول سے آخر تک ایسی کسی مثال یا دلیل سے خالی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس لیے وہ ہر شک وریب سے بالاتر ہے، اس کی کلامی اور معنوی خوبیوں کا اعتراف کیا گیا ہے، اور وہ اپنی اعجاز بیانی میں بے مثل ہے، عہد نامہ اور قدیم وجدید جس کے مجموعہ کو کتاب مقدس اور بائبل کہا جاتا ہے، وہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے زمانوں کے بعد مختلف موقعوں پر مرتب ہوا ہے، ان کی طرح قرآن مجید کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ تاریخی تفصیلات اور روزانہ کے جزئی واقعات کو ایک تاریخ کی کتاب کی طرح تفصیل سے بیان کرے، لیکن اس کے باوجود کئی محققین نے قرآن مجید سے مکی اور مدنی دور کے بارے میں قابل قدر تاریخی حقائق مستنبط کیے ہیں، انھوں نے تاریخی انداز رکھنے والی آیتوں کو یک جا کر کے سیرت نبوی ﷺ کا ایک خاکہ ترتیب دیا ہے، یہ کتابیں دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، چنانچہ دروزہ کی کتاب ''سیرۃ الرسول ﷺ اور متقبسۃ من القرآن الکریم، صالح احمد العلی کی محاضرات فی

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۲۔۱۳۔

تاریخ العرب‘‘ اور سید قطب کی کتاب فی ظلال القرآن میں مختلف سورتوں (انفال، آل عمران، احزاب، توبہ، محمد، الفتح وغیرہ) کی تفسیریں اگر ہم مثال کے طور پر پڑھیں تو ہم کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں سے رسول اکرم ﷺ پر کس قدر اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

قرآن مجید ایک عقیدہ کی کتاب اور ایک عظیم تحریک کا لائحہ عمل ہے، اس کے بیانات میں تاریخی واقعات کے کسی پہلو سے اگر گفتگو کی گئی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ کسی زمانہ کے تمام واقعات وحالات کا مرتب اور مکمل خاکہ پیش کر دیا جائے، ان واقعات کو بیان کر کے ان پر تبصرہ کا مقصد یہ ہے کہ ایک فرماں بردار انسان یا اطاعت گزار جماعت کی روشنی میں اپنا طرز عمل درست کر سکے، قرآن تاریخی واقعہ سے تربیت کا کام لیتا ہے، اور ان موقعوں پر قرآن مجید کا اسلوب اپنی طاقت اور تاخیر میں نہایت ہی عظیم اور بلند ہو جاتا ہے، واقعات سے قرآن مجید میں استدلال کا یہ طریقہ امت اسلامیہ میں تحریکی ذہن اور متحرک اور فعال زندگی کی نشو ونما کرتا ہے، امت اسلامیہ خلاء میں رہنے والے نظریات یا بے نتیجہ لاھوتی مناظروں سے پیدا ہونے والے خیالات پر انحصار کرنے کے بجائے زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرتی ہے، زندگی کے واقعات سے استدلال کا یہ طریقہ قرآن مجید کا ایک نمایاں اور منفرد اسلوب ہے۔

## تضاد کی ایک اور مثال

واٹ نے مکہ مکرمہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بیان کرنے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ دور اول کی احادیث نبوی ﷺ پر اعتماد کو ضروری قرار دیا ہے، تاکہ مکی دور کو سمجھنے کے لیے قرآنی رہنمائی کی تکمیل کی جا سکے، وہ قرآن کے ساتھ حدیثوں کو بھی تاریخ کا اہم ماخذ سمجھتا ہے، مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کے برعکس دوسری بات کہنے لگتا ہے دلیل وثبوت کے طور پر احادیث کو قبول کرنے میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

’’غالباً اکثر موقعوں پر یہ احساس ہوگا کہ میں نے عملاً احادیث سے ان لوگوں کے مقابلہ میں کم ہی تعلق رکھا ہے، جن کو حدیثوں پر مجھ سے زیادہ شک ہے۔‘‘ ❶

❶ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۱۳۔

حالانکہ واٹ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں حدیث پر زیادہ معتدل طرز عمل کا یقین دلاتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

"جب میں محمد ﷺ کی زندگی کے پس منظر اور اس کے مکی دور پر بحث و جستجو میں مصروف تھا تو میں اس خیال کی روشنی میں آگے بڑھا کہ احادیث کو عمومی حیثیت سے قبول کر کے انھیں احتیاط کے ساتھ لینا چاہیے، خود بخود اضافہ کے پائے جانے کی وجہ سے جن امور میں ہمیں شک ہے ان میں امکانی حد تک تصحیح کی کوشش کرنی چاہیے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اگر حدیثوں میں داخلی طور پر تناقض پایا جائے تو ہم انھیں بالکل ہی نظر انداز کر دیں۔" ❶

## تدریجی ارتقاء کا نظریہ

واٹ نے تمام مغربی اسکالر کی تقلید میں مذاہب کے تدریجی ارتقاء کے جدید مغربی نظریہ کو قبول کر لیا ہے، یعنی تاریخ کے ہر ایک دور میں نبی یا رسول نے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق عمل درآمد کیا، اس لیے مذہب کے بارے میں واٹ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہب اپنے ہی زمانہ کے تقاضوں کی پیداوار ہوتا ہے، وہ ایک نبی کی حیثیت سے اس کی کارکردگی کی وسعتوں کو اور ایمان وعقیدہ کے آخری نقوش کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے، حالانکہ نبی کی آمد ایک عقیدہ وایمان کی تلقین کے لیے ہوتی ہے، مثلاً واٹ کے نزدیک محمد ﷺ مکی دور میں اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ دعوت اسلامی کی نوعیت عالمی ہے مگر اُن کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ پیغام تمام عربوں کے لیے ہے وہ وقتاً فوقتاً جیسے جیسے تاریخی حالات سے گزرتے گئے ان کی دعوت کے حدود میں توسیع اور اس کے پیغام میں عمومیت اور وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔

دین کا مذکورہ مصنوعی اور غلط مفہوم ایک ایسی مکمل پارٹی کا تصور ہے جو ابتداء میں چند مقاصد کے لیے بنی ہو مگر یہ مفہوم مذاہب کی تاریخ میں اس بڑی حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک دین پہلے ہی مرحلہ میں یک بارگی نازل نہیں ہوا، اور یہ بھی نہیں ہوا کہ پہلی باری اس کے عقیدت مندوں کو تمام فرائض اور ممنوعات کی پابندی کا حکم دے دیا گیا ہو، دین

---

❶ ایضاً ص ۱۱۔۱۲۔

تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا ہے اور تدریجی طور پر کم وبیش مدت کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے، اپنے نزول کی اس مدت میں منزل بہ منزل وہ تاریخی کروٹیں لیتا ہوا اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے، اس دوران میں ذہنی رشتوں کو استوار کرنے کے اور افہام وتفہیم کے مرحلوں سے گزرنے کی ضرورت پڑتی ہے، وہ متحرک ہو کر ایمان وعقیدہ کی تخم ریزی کرتا ہے جس سے مثبت نتائج برآمد ہوں، نئی مذہبی اور اخلاقی قدریں وجود میں آئیں اور فکر وخیال میں نئی تبدیلیاں ہوں، ظاہر ہے کہ پورے دین کے اچانک آ جانے کے صورت میں یہ مقاصد پورے نہیں ہو سکتے، اسی وجہ سے قرآن مجید بھی مرحلہ وار نازل ہوا ہے، اس میں واضح طور پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ:

﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾

(بنی اسرائیل: ۱۰٦)

''اور قرآن مجید میں ہم نے جا بجا فصل رکھا، تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو تدریجاً (تھوڑا تھوڑا) ہی نازل کیا ہے۔''

قرآن مجید کا نزول مختلف مرحلوں میں ہوتا رہا، اس عرصہ میں قدم بہ قدم اور خشت در خشت اطاعت گزار فرد اور جماعت کی تشکیل ہوتی رہتی، اور قرآن مجید زندگی کی چلتی پھرتی تصویر بن کر اپنے نصب العین کو نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دے، اس نے اپنی تعلیم وتبلیغ کے لیے فلسفیانہ اور الٰہیاتی بحثوں کا طور مار نہیں باندھا۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی راہ کے نقوش سے واقف رہتے تھے، جیسا کہ تدریجی ارتقاء کا مغربی نظریہ بتاتا ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ انبیائے کرام جس دور سے گزرتے تھے ان کو صرف اسی دور کے تقاضوں کی خبر رہتی تھی، مغربی فکر کے اس انداز بحث ونظر کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ واٹ اپنے تہذیبی ماحول ہی کا پروردہ ہے، اور مغربی نظریہ کو اپنی کتاب میں کسی جگہ استعمال کر کے وہ بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو گیا ہے، مثلاً وہ قریش کی تینوں مورتیوں (لات، عزیٰ اور منات) کو رسول اکرم ﷺ کی طرف سے تسلیم کرنے والی بے سروپا کہانی کا ذکر کرتا ہے، ہم اس سے پہلے قریش کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوششوں اور شیطانی فقروں کے بارے میں تفصیل سے

بحث کر چکے ہیں، یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، تاہم واٹ نے مغربی نظریہ کی روشنی میں اس پر جو حاشیہ آرائی کی ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے، اس کا خیال ہے کہ:

''تدریجی ارتقاء کے جدید مغربی نظریہ سے مسلمان فقہا ناواقف تھے، اس لیے ان کی رائے یہ تھی کہ محمد ﷺ اسلامی عقیدہ کے پورے مفہوم سے ابتداء ہی سے باخبر تھے ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ محمد ﷺ نے شیطانی فقروں کو (ابتداء میں) اسلامی عقیدہ کے خلاف نہیں سمجھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کا عقیدہ توحید ان کے تعلیم یافتہ معاصرین کے عقیدہ توحید کی طرح اصل میں غیر واضح تھا، انھیں اس وقت تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ خداوند کی ان مخلوقات کو تسلیم کر لینا توحید کے منافی ہوگا، وہ لات وعزیٰ اور منات کو اس وقت تک خداوند سے کم تر مگر آسمانی مخلوق سمجھتے تھے جس طرح یہودیت اور عیسائیت میں فرشتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے، قرآن نے مکی دور کے آخر میں ان کا تذکرہ ''جن'' کہہ کر کیا ہے، لیکن مدنی دور میں وہ ان کو بے حقیقت اور نام محض قرار دیتا ہے، اگر یہ سب کچھ ہوا تو پھر یہ ضروری نہیں رہ جاتا کہ ہم شیطانی فقروں کا کوئی دوسرا سبب دریافت کریں، کیونکہ یہ واقعہ توحید سے شعوری طور پر پسپائی کو ثابت نہیں کرتا بلکہ اس کے ذریعہ ان نظریات کی ترجمانی ہوتی ہے جن کی طرف سے محمد ﷺ نے ہمیشہ مدافعت کی ہے۔'' ❶

واٹ کا مذکورہ فکری انتشار بھی قابل دید ہے، اس کا طرز فکر نہ تو مادی ہے جس کی وجہ سے وہ مذہبی صداقتوں کو رد کرتا ہو اور نہ ہی وہ مومنانہ نقطۂ نظر رکھتا ہے جس کی بنا پر وہ مذہبی حقائق کو تسلیم کرتا ہو، مذہب کے بارے میں وہ دراصل پریشان خیالی میں مبتلا ہے۔

## عقیدہ توحید

دوسرے تمام نبیوں کی طرح رسول اکرم ﷺ نے ایک واضح عقیدہ پیش کیا، جو صریح اور صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، اس کو آپ نہ تو ملتوی کر سکتے تھے، اور نہ ہی اس سے دست بردار

---

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۰۷۔

ہو سکتے تھے، اس میں کسی ترمیم یا تدریجی ارتقاء کا امکان ہی نہ تھا، اور وہ دعوت اسلامی کے پہلے ہی مرحلہ میں پوری طرح پیش کر دیا گیا تھا، ایک اللہ پر ایمان اور ہر شکل میں ان ہستیوں کا انکار جن کو کارخانہ عالم میں شریک ٹھہرا لیا گیا تھا، یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے جو قرآن مجید میں ابتداء ہی سے بار بار پیش کیا گیا ہے، حضرت نوح، ہود، صالح، شعیب، موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوموں کے سامنے عقیدہ توحید کو واضح کیا۔ ❶ ہر ایک نبی رسول کا یہی پیغام تھا۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

"اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق نہیں) پس میری ہی عبادت کیا کرو۔"

دین اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے ابتدائی لمحوں ہی میں محمد ﷺ کو اپنے اقدامات کی گہرائیوں کا پورے طور پر احساس تھا، انھیں یہ خبر تھی کہ ان کے دعوتی مشن کا دنیا والوں پر کیا اثر پڑے گا، اور انھیں اپنے مقاصد کی تکمیل میں کس کشمکش اور مقابلہ سے دوچار ہونا پڑے گا، چنانچہ انھوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کی طرف سے جنگ کے چیلنج کو قبول کر لوں۔ ❷ آپ ﷺ کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی وہ واضح تھی اور شرک کی تردید کے بارے میں بھی کسی رعایت یا نرمی اور لچک کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ ❸

رسول اکرم ﷺ نے جاہلیت کے ساتھ معرکہ آرائی میں توحید الٰہی کا تحفظ کیا اور اس کے بارے میں کسی مفاہمت یا سمجھوتہ کو قبول نہیں کیا، آپ ﷺ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ توحید الٰہی سے معمولی انحراف بھی اسلامی عقیدہ کے اصل امتیاز کو ختم کر دے گا، کیونکہ نبوت کی

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھئے قرآن مجید کی درج ذیل سورتیں، اعراف ۵۹، ۶۵، ۷۱، ۷۳، ۷۵۔ ہود، ۵، ۵۴، ۶۱، ۸۴، نمل، ۹۰ تا ۹۴ نحل ۲، ۵۱۔

❷ بخاری، تجرید ج ۱، ۱۳ تا ط ۱۹۳۱ء۔

❸ مثال کے طور پر دیکھئے قرآن مجید کی درج ذیل سورتیں، توبہ ۱۲۹، رعد ۳۰، کہف ۱۱۰، انبیاء ۱۰۸، قصص ۱۸۸، ص ۲۵، محمد ۱۹، مزمل ۹، بقرہ ۱۳۳، توبہ ۳۱۔

ذمہ داریوں اور دین اسلام کے امتیازات میں عقیدہ توحید ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید کو جو آیتیں بعد میں نازل ہوئیں ان میں توحید کے اساسی عقیدہ کی وسعتوں کو بیان کیا گیا ہے، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مغرب کے تدریجی ارتقاء کے تصور کے مطابق عقیدہ میں ارتقاء یا ترمیم وتغیر اور اضافہ کا عمل ہو رہا تھا کیونکہ عقیدہ توحید کی وہی اساس آخر تک برقرار تھی جس کی ابتداء میں تعلیم دی گئی، اور رسول اکرم ﷺ اس اساس پر قائم ودائم رہے، بعد میں آپ نے اس عقیدہ کے تقاضوں اور اس کی وسعتوں ہی کو بیان کیا ہے۔

## عقیدہ اور شریعت

اس موقع پر عقیدہ اور شریعت کے درمیان فرق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، عقیدہ ہی شریعت کی بنیاد ہے، اور شریعت کے تمام احکام عقیدہ ہی کی عملی تفسیر ہیں، مگر احکام کی تفصیلات اور جزئیات سے نبی کو پیشتر آگاہی نہیں دی جاتی، بلکہ جیسے جیسے ان کا نزول ہوتا جاتا ہے نبی کو ان سے واقفیت ہوتی جاتی ہے، اس لیے شریعت کا معاملہ عقیدہ سے جداگانہ ہو، نبی کو ابتدا ہی سے عقیدہ کی گہرائیوں اور وسعتوں کا علم ہوتا ہے، عقیدہ کا تعلق کائنات، زندگی اور انجام کے بارے میں ایک کامل اور بنیادی صداقت سے ہے، اس لیے نبی کو اس کے حدود امتیازات اور بنیادی امور سے پیشگی واقفیت نہ تو وہ انسان اور دنیا کے روبرو اور عالم فطرت اور تاریخ کے سامنے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کس طرح کرے گا؟

واٹ شیطانی فقروں کا بار بار ذکر کرتا ہے، اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مشرکین مکہ کی طرف سے ایک اللہ کو تسلیم کرنے کے بدلہ میں نبی کریم ﷺ مورتیوں کو برقرار رکھنے پر آمادہ ہوگئے تھے، اگرچہ واٹ کی اس پراگندہ خیالی کا جائزہ لیا جا چکا ہے، مگر وہ دوبارہ اسی کو ثابت کرنے پر مصر ہے، اس کی یہ کوشش ناپاک عزائم کا نتیجہ ہو یا اس کے پس پردہ تدریجی ارتقاء کا مغربی نظریہ کام کر رہا ہو، بہر حال ہم تدریجی ارتقاء کی روشنی میں بھی اس کا جائزہ لینے پر مجبور ہیں، اس کا خیال یہ ہے کہ لات و عزیٰ اور منات کی دیویوں کو تسلیم کر لینے پر محمد ﷺ کے ساتھیوں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اس پر اظہار

حیرت کرتے، کیونکہ محمد ﷺ اپنے طرز عمل کو اسلامی عقیدہ کے خلاف نہیں سمجھتے تھے، اصحاب رسول ﷺ کو شروع ہی میں اس بات کا شعور حاصل ہو جانا چاہیے تھا کہ محمد ﷺ اسلامی عقیدہ کے پورے مفہوم سے اس وقت تک واقف نہیں تھے، توحید کے بارے میں آپ کے تصورات مبہم اور پیچیدہ تھے، اور مذکورۂ بالا مورتیوں کے تسلیم کر لینے کو آپ توحید کے منافی نہیں سمجھتے تھے، واٹ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ محمد ﷺ لات، عزیٰ اور منات کو اللہ سے کم تر مگر آسمانی مخلوق سمجھتے تھے۔

واٹ کو اپنی تحقیق کے مذکورۂ بالا انوکھے اور خام افکار کو پیش کرتے ہوئے یہ احساس نہیں رہا کہ یہ خیالات اسلام کی واضح تعلیمات اور دعوت توحید کی ان بنیادوں سے متصادم ہیں جن کو رسول اکرم ﷺ نے ابتداء ہی میں پیش کر دیا تھا، اور ان ہی کی پاکیزگی اور انفرادیت کو باقی رکھنے کے لیے آپ ﷺ کو جلد ہی سارے عرب سے معرکہ آرائی کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔

واٹ اسلام کی واضح اور قطعی بنیادوں کو تو رد کر دیتا ہے اور ایک ناقابل اعتبار اور عوامی روایت کو قبول کر لیتا ہے، پھر وہ حالات کا صحیح طور پر تجزیہ کرنے کے بجائے ساری بحث کو یہ کہہ کر خلط ملط کر دیتا ہے کہ:

''محمد ﷺ لات وعزیٰ اور منات کو خداوند سے کم تر مگر آسمانی مخلوق سمجھتے تھے، جس طرح یہودیت اور عیسائیت میں فرشتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔'' (۱۷۰)

مورتیوں اور فرشتوں کے درمیان باہمی رشتہ کیا ہے؟ اس جگہ یا کسی بھی دوسرے موقع پر وہ کیا ضرورت پیش آئی جس کی وجہ سے واٹ نے مورتیوں کے ساتھ فرشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے؟ وہ دونوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے، یا اس بنا پر کہ پہلی مثال تحریف دین کی ہے اور دوسری مثال ایک ایسے غیبی وجود کی ہے جس کی حقیقت قطعی اور واضح ہے، پہلی مثال معصیت الٰہی کی ہے، اور دوسری مثال ایمان واطاعت اور فرماں برداری کا نمونہ ہے۔

واٹ نے اسلامی عقیدہ کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کے سنجیدہ موقف میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ مورتیوں اور فرشتوں کے درمیان غیر منطقی رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے، اور ایک من گھڑت واقعہ کا سہارا لیتا ہے اس نے کئی بے جوڑ افسانے تراشے ہیں، اور یہ تک لکھ دیا ہے

کہ مکہ کے آخری دور میں قرآن مجید نے خداوند مخلوق یعنی مورتیوں کا ''جن'' کہہ کر تذکرہ کیا ہے، اگرچہ مدنی دور میں ان ہی کو قرآن مجید نے بے حقیقت اور نام محض قرار دیا ہے۔

مورتیوں کا قرآن مجید میں ''جن'' کے نام سے کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح ان کو خداوند مخلوق قرار دینا بھی واٹ کی ایک ایجاد ہے، جس کو ثابت کرنے کے لیے قرآن وحدیث اور تاریخ سے کوئی ثبوت پیش کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے وہ کسی دلیل وثبوت کو پیش کرنے کے بجائے اپنے بے بنیاد خیال ہی کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہے، جب کہ قرآن وحدیث نے ہر جگہ شرک کی مذمت بیان کی ہے۔ مکی دور میں اور مدینہ میں اگر ان مورتیوں کو خداوندی مخلوق قرار دیا گیا ہوتا، جیسا کہ واٹ کا دعویٰ ہے تو پھر بت پرست قیادت اور مسلمانوں کے درمیان سخت معرکہ آرائی کی وجہ کیا تھی؟ رسول اکرم ﷺ کا ایک مشہور تاریخی فقرہ ہے جس کو اگرچہ واٹ نے نظر انداز کر دیا ہے مگر وہ فقرہ آج بھی تازہ اور اپنے اسلوب وانداز کے لحاظ سے اچھوتا ہے، آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اے چچا اگر لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھ دیں (یعنی اگر ان کے اختیار میں ہو اور وہ ان دونوں کو میرے حدود سلطنت میں شامل کر سکیں) اس شرط پہ کہ میں اس بات کو چھوڑ دوں تب بھی میں اس کو ترک نہیں کروں گا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اسے غالب کر دیں، اور یا میری گردن جدا ہو جائے، اس فقرہ میں ھٰــــذا الأمــــر (اس بات) کا مفہوم بالکل واضح تھا، رسول اکرم ﷺ شرک کی ہر ایک قسم کو ترک کرنے اور توحید خالص کو اپنانے کی تعلیم دیا کرتے تھے، مگر واٹ تمام صداقتوں سے روگردانی کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ:

> ''یہ واقعہ توحید سے شعوری طور پر پسپائی کو ثابت نہیں کرتا، بلکہ اس کے ذریعہ ان نظریات کی ترجمانی ہوتی ہے جن کی طرف سے محمد ﷺ نے ہمیشہ مدافعت کی ہے۔''

مگر واٹ کے یہ پراگندہ خیالات اور اس کے خام اور ناتواں افکار حقائق کا سامنا کرتے ہی ہوا ہو جاتے ہیں، اس لیے ان کے بارے میں اب کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

## شبہات کی تخم ریزی

واقعات سیرت کو مغرب کے غلط تصورات کے آئینہ میں دیکھنے کی وجہ سے واٹ نے اپنے

خام نتائج فکر اور ناقص تجزیوں پر بھروسہ کیا ہے، اس کے یہاں اگرچہ دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں کام و دہن کی تلخی زیادہ نہیں ہے، تاہم حقائق نبوت کو اس نے بھی توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی ان کوششوں کو یا تو سادگی اور کم علمی کا نام دیا جا سکتا ہے یا انھیں بدنیتی اور عیاری پر محمول کیا جائے گا، مشرق و مغرب کے تحقیقی اداروں میں مستشرقین نے اسلام اور اس کے عقائد پر اپنے ظن و تخمین کی مدد سے جو بحثیں کی ہیں ان میں سنجیدگی کا فقدان ہے، ان میں بے مقصد کھلواڑ کے ذریعہ سچائی سے انحراف کیا گیا ہے، واٹ کا بھی یہی طرز عمل ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

''محمد ﷺ پر نزول وحی کے وقت پہلی تجربہ کی جو نازک صورت حال گزری اس کے باوجود ابتداء ہی سے ان کا یہ خیال ہو گیا تھا کہ ان پر جو الفاظ وارد ہو رہے ہیں وہ وحی الٰہی ہیں، یقین کی یہ کیفیت ان کی عمومی دعوت میں ابتداء ہی سے ظاہر ہو چکی تھی۔'' ❶

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ:

''ایک مورخ کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ محمد ﷺ اپنے اس خیال میں سچے ہیں کہ آپ کے پاس بیرونی سرچشمہ سے وحی کی آمد ہوتی تھی، اور یہ بات بھی کہ وحی کی آمد سے پہلے آپ ﷺ نے ممکن ہے کہ کچھ لوگوں سے ان واقعات کا ایک حصہ سنا ہو جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، اور تب مورخ کو یہ موضوع ماہرین فقہ کے سپرد کر دینا چاہیے جو ان دونوں باتوں میں کسی طرح تطبیق دیں۔ ❷

اسی طرح آخرت کے بارے میں محمد ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسَاهَا﴾ (یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی) تو ہمیں اس کے جواب میں شک کی علامتیں ملتی ہیں، اور قرآن اس سوال کو رد کر دیتا ہے، یا جواب سے پہلو تہی کرتا ہے، کیونکہ یہ ممکن تھا کہ اس کا جواب محمد ﷺ کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا، ان سے سوال پوچھنے کا مقصد بھی

---

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ایڈیشن) ص ۲۰۳۔
❷ محمد ایٹ مکہ (عربی ایڈیشن) ص ۲۰۵۔

یہی تھا۔'' ❶

## دین اسلام کے بارے میں محدود تصورات

واٹ کے مذکورہ خیالات تدریجی ارتقاء کے مغربی نظریہ ہی کا نتیجہ ہیں، وہ یہ سمجھتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکی دور کے آخری دنوں تک اپنے پیغام کے وسیع حدود سے ناواقف تھے، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ پیغام صرف قریش یا عربوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے، حالانکہ دوسرے مستشرقین کی طرح واٹ نے بھی قرآن مجید کی ان تصریحات سے آنکھیں چرالی ہیں جن میں مکی دور کے آغاز ہی میں قطعی انداز میں یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ دعوت اسلامی کا خطاب پوری دنیا سے ہے، انھوں نے یہ حقیقت بھی نظر انداز کردی ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام بے خبری کے ساتھ اپنے قدم نہیں اٹھاتے، وہ جس رخ پر چلتے ہیں اس میں وہ اپنے نصب العین اور اپنی راہ کے تمام فاصلوں کا پورا شعور رکھتے ہیں، روشن ہدایتوں کی موجودگی میں ان کے قدم بصیرت اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، ان کے برعکس دوسرے لیڈر اور رہنما اپنی ذہانت اور دور اندیشی ہی کا سرمایہ لے کر آگے آتے ہیں، اور اپنے ہی اندازوں کے مطابق پروگرام بناتے ہیں، ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کے یہ اندازے مستقبل میں درست ہوں، یا ان کے منصوبے مستقبل کے نقشہ میں بھی پوری طرح فٹ ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجے جانے والے انبیاء مستقبل پر نظر رکھتے ہیں، دعوت کے ابتدائی مرحلوں ہی میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رہنمائی کی وجہ سے انبیائے کرام کے ہاتھوں میں مستقبل کی باگ دوڑ ہوتی ہے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کا ہر قدم بصیرت کے ساتھ مستقبل کے حالات کے پیش نظر اٹھتا تھا، قرآن مجید کی ابتدائی آیتوں ہی میں دعوت اسلامی کی عالمی نوعیت کو واضح کر دیا گیا تھا۔ مثلاً:

﴿قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَٰلَمِينَ﴾ (الانعام : ۹۰)

''آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا، یہ تو صرف تمام جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

---

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ایڈیشن) ص ۲۰۰۔

﴿وَ مَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (یوسف : ١٠٤)

''اور آپ ان سے اس پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں، یہ تو صرف تمام دنیا جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (انبیاء : ١٠٧)

''اے نبی! ہم نے تو آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾

(الفرقان : ١)

''بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کیا کتاب اپنے بندہ خاص پر نازل فرمائی تا کہ وہ تمام دنیا جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔''

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (ص : ٨٧)

''یہ قرآن تو جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

﴿وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (قلم: ٥٢)

''حالانکہ یہ قرآن تمام جہان کے لیے نصیحت ہے۔''

﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ○ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (تکویر : ٢٦۔٢٧)

''تو تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو، یہ تو دنیا جہان والوں کے لیے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے۔''

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا : ٢٨)

''اور ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

واٹ کی تحریروں میں قطعیت اور یقین کا لب ولہجہ نہیں ملتا، تاہم اس موقع پر بڑی قطعیت کے ساتھ وہ لکھتا ہے کہ:

''ہمیں یہ یقین ہے کہ محمد ﷺ نے اسی وقت (طائف سے واپسی کے بعد) دیہاتی قبیلوں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت شروع کی، اس سرگرمی کے پس پردہ تمام

عربوں کو متحد کرنے کا مبہم خیال چھپا ہوا تھا۔'' ❶

اپنے آپ کو محمد ﷺ نے ابتداء میں قریش ہی کے لیے خاص طور پر رسول قرار دیا تھا، ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ محمد ﷺ نے ابو طالب کی وفات سے پہلے یا اس کے بعد اپنے پیغام کی حدودوں کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ اس کے دائرہ میں پورا عرب شامل ہو جاتا، صورت حال کی ابتری نے ان کو اپنی دعوت کی توسیع کے لیے مجبور کر دیا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے آخری تین سالوں میں ہم انھیں دیہاتی قبیلوں اور طائف، اور یثرب کے باشندوں سے ہی رابطہ قائم کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔'' ❷

## دین وسیاست میں فرق

واٹ نے ایک جگہ محمد ﷺ کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ دین وسیاست کے درمیان فرق سے ناواقف تھے، انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ ایسا پیغام لازمی طور پر انھیں قیادت کے مرکز تک پہنچا دے گا، وہ مغربی تصور کے مطابق خالص مذہبی کردار ادا کرنے کے علاوہ کسی اور حیثیت اور کردار کے بارے میں نہیں سوچا کرتے تھے۔

''وہ صرف ایک آگاہی دینے والے شخص تھے...... اپنی مذہبی تجویزوں کو پیش کرتے ہوئے ان پر یہ لازم تھا کہ سیاسی پہلوؤں سے بھی آگاہ کرتے۔ ❸ (اس کے ساتھ ہی واٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ) مذکورہ حالات میں پیغام نبوت اور سیاسی رہنما کی ذمہ داری کے درمیان کا فاصلہ جاری اور برقرار رہنا ممکن نہیں تھا، یعنی چونکہ عربوں کی نظر میں حکمرانی کے لیے لازمی صفات اور صلاحیتیں متعین تھیں، اس لیے ایسا طرز سیاست اختیار کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں تھا جس کی بعد میں اللہ تعالیٰ یا اس کے نبی کے ارشاد سے تردید ہو جائے، اسی طرح قریش سے سخت کشمکش کا آغاز ان کے معبودوں

---

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی) ص ۲۲۳۔ ❷ محمد ایٹ مکہ (عربی) ص ۲۱۹۔
❸ محمد ایٹ مکہ (عربی) ص ۱۷۷۔

کی طرف اشارہ کرنے پر شروع ہوگیا، جیسا کہ سورۂ کافرون اگرچہ خالص مذہبی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے، مگر اسی نے محمد ﷺ کو فتح مکہ پر آمادہ کیا۔'' ❶

''اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ کشمکش کا بنیادی سبب سرداران قریش کا یہ احساس تھا کہ محمد ﷺ کا یہ یقین کہ وہ نبی ﷺ ہیں سیاسی نتائج کا سبب ہوگا، قدیم عربی رواج یہ تھا کہ عقل وحکمت اور ہوشیاری میں جو شخص سب سے زیادہ ممتاز ہو قبیلہ میں وہی سردار بنایا جائے، مکہ کے باشندے اگر محمد ﷺ کے انداز و وعید پر ایمان لے آتے، اور ان تدبیروں کو معلوم کرتے جن کے ذریعہ ان معاملات کا انتظام کیا جاتا تھا تو (اعلان نبوت کے بعد) محمد ﷺ کے سوا ان کی خیر خواہی کا مستحق دوسرا کون ہوسکتا تھا؟'' ❷

سیاسی قیادت کے لیے قریش کے سامنے کوئی اہم رکاوٹ کھڑی نہ ہوجاتی، اگر سرداران قریش کو مذہب اور سیاست اور دعوت اسلامی اور سیاسی قیادت کے درمیانی رشتہ کا ادراک تھا تو محمد ﷺ کو اس کو شعور وادراک کیوں نہ ہوتا؟ جب کہ خود واٹ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ محمد ﷺ عقل و حکمت کے لحاظ سے قریش میں ہر ایک سے بڑھ کر تھے۔

## مکی اور مدنی میں فرق

واٹ مسلم معاشرہ کے مرحلہ وار ارتقاء کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے، حالانکہ ایک بہتر سماج کی تشکیل میں کئی مرحلوں کا وجود ایک لازمی امر ہے، مگر وہ اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک عام قاری کے ذہن میں یہ خیال پیوست کرنا چاہتا ہے کہ قرآن مجید نے قریش کے ساتھ کسی پیچیدگی یا الجھن سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں کیں، سود مکہ کی اقتصادی سرگرمیوں کا ایک اہم ستون تھا۔ قرآن مجید نے ہجرت کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک اس کی ممانعت میں تاخیر کی، اور دولت کے بارے میں قریش کے شخصی رویہ ہی پر تنقید کی، واٹ کے بقول:

''سرداران مکہ کی نگاہ اس قدر دور رس تھی کہ انھوں نے اس تناقض کو سمجھ لیا تھا، جو

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی) ص ۱۷۷۔۱۷۸۔ ❷ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۱۴۔

قرآنی تعلیمات اور اس تجارتی سرمایہ کے درمیان موجود تھا، جس پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا، اسی وجہ سے ہجرت کے طویل عرصہ کے بعد ہی سود کی ممانعت کا حکم آیا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ دولت کے بارے میں قریش کے شخصی رویہ پر تنقید ابتدا ہی سے سامنے آ چکی تھی۔'' ❶

اسلامیات کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص اس بات کو تسلیم کرنے میں دشواری محسوس کرے گا کہ واٹ جیسا باخبر مستشرق، اسلام میں عقیدہ اور شریعت کے فرق سے بے خبر ہے، اور اس بات سے بھی کہ اسلامی تاریخ میں مکی دور، مدنی دور سے مختلف تھا، پہلے دور میں تحریک اسلامی کی توجہ عقیدہ کی تشکیل اور استحکام پر مرکوز تھی جب کہ دوسرے دور میں عقیدہ کے استحکام کے ساتھ ہی قانون و شریعت کا مرحلہ درپیش تھا، ایک اسلامی حکومت وجود میں آ چکی تھی اور اس کی وجہ سے قانونی اور تنظیمی اداروں کی تشکیل کی ضرورت تھی، اس دور ثانی میں جو کچھ ہوا وہ اسلام کی بنیادوں میں ترمیم و تغیر کا معاملہ نہ تھا، بلکہ تنظیم میں بتدریج ترجیحات کا مسئلہ تھا جس کی طرف توجہ رہی، مدینہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت وجود میں آ چکی تھی، مگر واٹ اس کے باوجود یہ لکھتا ہے کہ:

''ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت کے وقت اپنے اہم خطوط کار کے لحاظ سے اسلام بدل چکا تھا، اس کے زیادہ تر ادارے ابتدائی مرحلہ میں تھے، ابھی تک نمازوں کی اور اسی طرح عبادت کی حد بندی نہیں ہو سکی تھی، اسلام کے دوسرے ارکان روزہ، زکوۃ، حج اور شہادت کا ابھی کامل ظہور نہیں ہوا تھا، اس کے باوجود اللہ، آخرت، جنت اور دوزخ اور نبیوں کی بعثت کے بنیادی افکار پوری طرح واضح تھے۔'' ❷

اسلام کے زیادہ تر ادارے وجود کے مرحلہ میں تھے یا یہ ادارے ابتدائی مرحلہ میں تھے، دونوں باتوں میں نمایاں فرق ہے، ہجرت کے وقت یہ تنظیمی ادارے وجود میں نہیں آئے تھے، مگر مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کے وجود میں آ جانے کی وجہ سے ان تنظیمی اداروں کی ضرورت پڑی، ہجرت سے قبل ان اداروں کے ابتدائی مرحلہ کا کوئی موقع ہی نہ تھا، اس

❶ محمد ایٹ مکہ ص ۲۱۵۔ ❷ ایضاً ص ۲۳۸۔۲۳۹۔

وقت تو معاشرہ کی تربیت اور اصلاح عقیدہ ہی کی طرف ساری توجہ تھی، مگر واٹ نے دونوں عہد کے بنیادی امتیازات سے صرف نظر کر کے ایسے ''الفاظ'' استعمال کیے ہیں، جو اس کے تدریجی ارتقاء کے مغربی تصور سے ہم آہنگ ہوں۔

## تاریخ اسلامی پر اقتصادی حالات کا اثر

تاریخ پر اقتصادی حالات کے اثر کا انیسویں اور بیسویں صدی میں کافی چرچا ہوا ہے، کارل مارکس اور انجلز کی وجہ سے تاریخ انسانی کے ارتقاء میں اقتصادی محرک کو اصل قرار دے دیا گیا، اور مذہب واخلاق یا فنون لطیفہ تک میں جو بھی تغیرات ہوئے ان کے پیچھے اقتصادی صورت حال کو بنیادی عنصر تسلیم کر لیا گیا، جن مورخوں نے تاریخی مادیت کے نظریہ کو قبول نہیں کیا، انھیں بھی اس بات پر اصرار تھا کہ ہر ایک تاریخی واقعہ کو اقتصادی محرک ہی کی روشنی میں دیکھا جائے، لیکن مزید تحقیقات کے نتیجہ میں تسلیم کیا جانے لگا کہ اقتصادی عنصر کے علاوہ تاریخ میں دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی تغیرات رونما ہوئے ہیں، مستشرقین نے بھی مذکورہ نظر کو قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے، یورپ کے تاریخی واقعات کے مقابلہ میں مستشرقین کو تاریخ اسلامی کا مطالعہ کرتے ہوئے شاید یہ بات زیادہ محسوس ہوئی کہ صرف تاریخی مادیت ہی کے ذریعہ ان کی توجیہ ممکن نہیں، چنانچہ واٹ ان مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے تاریخ کی مادی توجیہ کو رد کر دیا ہے۔

تاریخ انسانی پر اقتصادی حالات کا بھی اثر پڑتا ہے، مگر ان کی تاریخی تغیرات کا اصل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا، واٹ کے نزدیک تاریخ کی حرکت میں مادی حالات عمومی حیثیت سے اور اقتصادی حالات خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، چنانچہ وہ کہتا ہے:

> ''مؤرخین کا انداز تحقیق بحث موجودہ صدی کے نصف آخر میں تبدیل ہوا، انھوں نے خاص طور پر تاریخ میں پیوست مادی عوامل کو بہتر طور سمجھا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں وہ مذہبی پہلو کو نظر انداز کرنے یا اس کی اہمیت کو کم کرنے کے بجائے بہت سے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مسائل کے اثر متعین کرنے کے لیے فکر مند رہے ہیں، مجھ جیسے لوگوں نے تو یہ خیال بھی ترک کر دیا ہے کہ یہ محرکات عمومی حیثیت سے حالات

کی رفتار کی تشریح بھی کر سکتے ہیں، مؤرخین کو ان اسباب و محرکات کی اہمیت کا اعتراف بھی کرنا چاہیے مگر محمد ﷺ کی سیرت کی یہ خصوصیت نہیں ہے کہ اس کے مصادر ماخذ کا جائزہ لیا جائے جس قدر اہمیت اس بات کی ہے کہ مادی محرکات کی طرف توجہ کی جائے، اور ان کی روشنی میں ان متعدد سوالوں کا جواب دیا جائے جو ماضی میں کم ہی اٹھائے گئے ہیں۔'' ❶

واٹ نے بظاہر اپنی طرف سے محتاط رویہ اپنانے کا اعلان کیا ہے، مگر وہ اس کے باوجود تحقیق کا جو انداز اختیار کرتا ہے اس میں اقتصادی عنصر کو اہمیت ہی نہیں بلکہ بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس نے مادی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی بحث و تحقیق کی جو مثالیں پیش کی ہیں، وہ صرف اقتصادی امور سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان ہی کی روشنی میں وہ واقعات سیرت کی تشریح کرتا ہے، چنانچہ مکی دور میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے واٹ نے طبقاتی کشمکش کا سہارا لیا ہے، اس کا یہ خیال ہے کہ:

''اسلام نے اجتماعی سطح پر نچلے طبقہ سے مدد نہیں لی، بلکہ ان لوگوں سے طاقت حاصل کی، جو درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ لوگ بلند درجوں پر فائز افراد کے اور اپنے درمیان فرق کو محسوس کرتے تھے، اور یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیتے تھے کہ انھیں بلند حیثیت لوگوں سے کچھ ہی کم حیثیت حاصل ہے، چنانچہ جاگیرداروں اور تنگ دستوں کے درمیان کشمکش نہیں ہوئی بلکہ جاگیرداروں سے اس طبقہ کی کشمکش رہی جو ان سے حیثیت میں کچھ ہی کم تھا۔'' ❷

نئے دین یا جدید عقیدہ کو مسلمانوں یا غیر مسلموں نے اگر قبول کیا ہے تو اس کی وجہ کا تعین کرنے کے لیے مادی نقطہ نظر درست نہیں ہے، کیونکہ تجربات سے اس کی تردید ہوتی ہے، شکم سیری اور معدہ کی خانہ پری کے بجائے اس کی وجہ انسان کی پیچیدہ نفسیات میں چھپی ہوئی ہے، روحانی تشنگی، فکری آسودگی اور ذاتی اطمینان کی وجہ سے دین و عقیدہ کو قبول کیا جاتا ہے، یہی بنیادی محرکات ہیں ان کے

❶ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۶۔۷۔ ❷ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۱۶۰۔

علاوہ احساس وشعور پر جسمانی لذتیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں، مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

اسلامی تاریخ میں قبول اسلام کے واقعات کا جائزہ لینے سے مادی نقطہ نظر کی بالکل ہی تردید ہوجاتی ہے، دور اول کے مسلمانوں میں درمیانی حیثیت کے لوگ اور تاجر بھی تھے اور کمزور مسلمان اور دوسروں کی پناہ میں رہنے والے افراد بھی، یہ لوگ طبقاتی کشمکش میں اقتصادی اسباب کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوئے، انھیں ظلم وجور کا شکار ہونا پڑا، اور ترک اسلام کی صورت میں انھیں بہت سی چیزوں کی لالچ دی گئی، مگر وہ دین جدید پر ثابت قدم رہے، اس لیے اقتصادی امور کے بجائے ان کے لیے اسلامی عقیدہ ہی کشش کا اصل سبب تھا، ان میں سے کئی افراد کے مسلمان ہونے کی وجہ تاریخی روایات میں موجود ہے، مثلاً حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ظہور اسلام سے پہلے ہی دین حق کی جستجو کرنے والوں میں شامل تھے، حضرت سعد بن زید رضی اللہ عنہ کے والد موحد تھے، اور دین ابراہیمی کو معلوم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، خالد بن سعد بن العاص رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا جس کی وجہ تھی کہ انھوں نے خواب میں یہ دیکھا کہ وہ آتش گڑھے کے کنارہ پر ہیں، جس کی طرف ان کے باپ انھیں دھکیل رہے ہیں، مگر کوئی شخص ان کو بچانے کے لیے دوسری طرف ہٹا رہا ہے، کچھ عرصہ بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی آیتیں سنیں اور یہ دیکھا کہ اذیت رسانی کے باوجود ان کی بہن اسلام پر ثابت قدم رہیں تو وہ بھی متاثر ہوئے اور مسلمان ہوگئے، ایک بڑی تعداد قرآن مجید کی آیتیں سن کر مسلمان ہوئی، قرآن مجید کے معجزانہ طرز بیان اور اس کی موثر آیتوں کو سن کر ان کے اندرون میں ہلچل پیدا ہوگئی، ان کے ضمیر پاک ہوگئے، ان کے دلوں کی کجی دور ہوگئی، ان کے اندر بصیرت، یقین وایمان اور سلامت روی پیدا ہوگئی اور ان کے اندر جو انقلابی ہلچل پیدا ہوئی کیا وہ معدہ شکم کا خودغرضانہ طوفان تھا جو بھوک اور مفلسی نے پیدا کر دیا تھا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ہر طرح کا اعزاز ملا ہوا تھا، دولت مند تھے، با اثر تھے، اپنی قوم میں محبوب اور مقبول تھے، پر امن زندگی گزار رہے تھے، دعوت اسلامی اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی، انتہائی پیچیدہ، دشوار اور نازک مرحلہ میں انھوں نے جاہلیت کے خلاف بغاوت کی اپنی قوم اور خاندان کے مقابلہ میں راحت وتنعم اور عزت وآسودگی کو چھوڑ کر انھوں نے اس زندگی کو قبول کر لیا جس میں نفرت اور خوف اور فقرو

تکلیف کا سروسامان موجود تھا، ان کے چچا نے اپنے آبائی دین کی طرف واپس لے جانے کے لیے انھیں سزا دی کوڑوں سے ان کو مارا، مگر وہ دین اسلام پر جمے رہے، کیا وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمان اپنی گاڑھی کمائی اور نجی دولت کو اسلام کی راہ میں خرچ کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھا کہ اے ابو بکر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھ چھوڑا ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما خوش حال اور خوش لباس تھے، ان کو ان کی ماں نے رسیوں سے باندھ رکھا تھا، اور دین اسلام کو ترک کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی تھیں، مگر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے ان کو صرف یہ جواب دیا کہ ''اے میری ماں! اللہ کی قسم اگر آپ سو مرتبہ بھی مر کر جی اٹھیں تب بھی اسلام پر ثابت قدم رہوں گا۔'' ایسے واقعات اور بھی بہت سے صحابہ کرام کے ساتھ پیش آئے، مگر وہ کیوں مسلمان ہوئے تھے، اور کیوں کر اسلام پر ثابت قدم رہے؟

واٹ ہی نے یہ لکھا ہے کہ:

> ''بہترین خاندانوں کے نوجوان اسلام سے وابستہ ہو گئے تھے، خالد بن سعید رضی اللہ عنہما اس جماعت کا سب سے بہتر نمونہ ہیں، لیکن ان کے سوا اور لوگ بھی ہیں، یہ سب سے زیادہ طاقتور خاندانوں اور سب سے زیادہ مشہور قبیلوں سے نکل کر آ رہے تھے، مکہ کے صاحبان اقتدار سے ان کے رابطے بڑے گہرے اور مضبوط تھے، اور وہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں پیش پیش تھے، ہمارے لیے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ معرکہ بدر میں ایسے بھائیوں، باپوں، بیٹوں اور چچا اور بھتیجوں کی بہت سی مثالیں ہیں جو دونوں صفوں میں آمنے سامنے ایک دوسرے سے جنگ کر رہے تھے۔'' [1]

واٹ اپنے خیالات کی آپ ہی تردید کر رہا ہے، مکہ کے خوش حال دولت مند اور درمیانی طبقہ کے یہ افراد جو اقتدار اور حیثیت کے لحاظ سے مکہ کے بلند اور مشہور ترین قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۱۶۸۔

انھوں نے کس دین کو قبول کیا تھا؟ اس دین کو جس میں قرآن مجید کی ابتدائی آیتوں ہی کے ذریعہ (سورہ علق اور سورہ قلم وغیرہ ❶ میں) ان کے لیڈروں اور دولت مندوں پر بجلیاں گرائی جا رہی تھیں، ان آیتوں میں ان دولت مندوں کی مذمت کی گئی تھی جو پریشان حال اور ضرورت مند طبقوں پر خرچ کرنے سے اپنے ہاتھوں کو روکے رکھتے ہیں قرآن مجید نے انھیں خرچ کرنے کی تعلیم دی اور اس سرکش قیادت کے خلاف جنگ چھیڑ دی جو اپنی طاقت کے نشہ میں مست ہو کر حق اور صداقت سے بغاوت پر آمادہ تھی۔ ❷

واٹ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی مادی نقطہ نظر کا سہارا لیا ہے، اس کے نزدیک ان کا قبیلہ زوال اور افراتفری سے دوچار تھا اور وہ اسلام قبول کرکے اپنے قبیلے کو بلندی تک پہنچانا چاہتے تھے، ان کا قبول اسلام مفاد پرستی پر مبنی تھا، واٹ کا یہ بیان ہے کہ:

> ''ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے پس پردہ، کچھ بھی اقتصادی محرکات نظر نہیں آتے، مگر اس کے باوجود عمر رضی اللہ عنہ کو اگرچہ قبیلہ میں اپنی حیثیت پر اعتماد تھا، مگر مکہ میں اپنے قبیلہ کی حیثیت کی وجہ سے وہ تنگی محسوس کرتے تھے، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اسی احساس کی وجہ سے ان کی نفرت اپنے ان ساتھیوں کے خلاف بڑھ گئی ہو جن کے ہاتھ میں قبیلہ کا اقتدار تھا، اس اندیشہ کی وجہ سے کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہو گئے، تو قبیلہ کی عام حالت غیر متوازن ہو جائے گی۔'' ❸

## مکہ میں مسلمانوں کے بائیکاٹ کی وجہ

شعب ابو طالب میں مسلمانوں کا مشہور بائیکاٹ اور پھر اس کی ناکامی کو بھی واٹ نے

---

❶ دیکھیے سورہ زخرف ۲۲۔۲۳، ہود ۱۱۶، مزمل ۱۱۔۱۲، بنی اسرائیل، واقعہ ۴۱، حاقہ ۲۵۔۲۹، الہمزہ ۱۔۴، سبا ۳۱۔۳۷، ابراہیم ۲۱، احزاب ۶۶۔۶۷، اعراف ۳۶۔۴۰، فرقان ۲۱، انعام ۱۲۲، جاثیہ ۳۱، جن ۲۴، نازعات ۲۸۔۲۹، نبا ۲۱۔۲۲ مزید دیکھیے محاضرات صالح احمد لعلی جلد ۱ صفحہ ۳۵۷۔۲۵۹۔

❷ دروزہ، سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ج ۱ ص ۱۶۵۔ ❸ محمد ایٹ مکہ ص ۱۶۳۔۱۶۴۔

اقتصادی مفادات ہی کی روشنی میں دیکھا ہے، اس کے خیال میں:

"(بائیکاٹ کی دستاویز پر دستخط کرنے سے) عبد شمس کے علاوہ دوسرے شرکاء کی غیر حاضری کی اہمیت نہ تھی، مگر اس کی وجہ سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قبیلہ اپنے مشترکہ مفادات کی وجہ سے بنی مخزوم سے گہرے روابط استوار کرنے کے لیے کوشاں تھا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ قدیم معاہدوں کے مقابلہ میں یہ مفاد اس کی سیاست کا رخ متعین کر دے، بائیکاٹ کی کاروائی میں توقف پیدا کر دینے والے اسباب کے بارے میں اگر ہمارے لیے کوئی رائے دینا درست ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ ان کو وقت گزرنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ بڑا معاہدہ اور بائیکاٹ ان طاقتور قبیلوں کو اور زیادہ مضبوط کر دے گا، جو مکہ کی تجارت اور تمام قبیلوں کو بے حیثیت کر دینے کے کاموں پر نظر رکھتے ہیں۔" ❶

یہ بائیکاٹ جن حالات میں ختم ہوا ان کی تفصیلات معروف ہیں، ❷ دراصل ظلم کے مقابلہ میں انسانی غیرت وحمیت اور مظلوموں کے تحفظ کا جذبہ انسانی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، انسان میں اخلاقی قدروں کا احساس نہ ہو یا انسانی معاشرہ کے بجائے کیڑوں مکوڑوں کا جمگھٹ ہو تو پھر ذاتی مفادات سے ہٹ کر بلند اخلاقی قدروں کا تصور ہی ناممکن ہو جائے گا، قدیم عربوں کے اخلاقی اصول ایک اٹل اور تاریخی حیثیت رکھتے تھے، بائیکاٹ کا خاتمہ ہوا تو اس کے پس پشت انسانی ہمدردی کے جذبات کارفرما تھے، اقتصادی حالات یا مادی اسباب کا وہاں کوئی وجود ہی نہ تھا۔

واٹ نے لامانس کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اقتصادی نفع اندوزی کو دعوت اسلامی کے حامیوں کی جستجو میں قربان کر دیا تھا، مگر واٹ نے لامانس کی توجیہ کو قبول نہیں کیا، بلکہ وہ لکھتا ہے کہ:

---

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۹۶۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھئے تہذیب بن ہشام ص ۸۹۔۹۱ تاریخ طبری، ص ۳۴۱۔۳۴۳، نساب للبلاذری، ج ۱، ص ۲۳۵، طبقات ابن سعد ۱/۱/۱۴۱ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۸۷۔۹۰۔

''محمد ﷺ نے عبد یالیل اور ان کے بھائی سے رابطہ قائم کیا، یہ لوگ عمر بن عمیر کے قبیلہ سے تھے، جو قریش کے حلیف قبائل میں تھا، اس طرح یہ لوگ قریش کے حامی اور مددگار تھے، غالباً بنو مخزوم کے مالی غلبہ سے ان کو آزاد کر دینے کی لالچ دے کر محمد ﷺ کو یہ توقع ہوئی، کہ اس طرح وہ ان کو طرف مائل کر لیں گے۔'' ❶

ایک اور جگہ واٹ نے ظہور اسلام کو بدویانہ اقتصادیات سے نکال کر تجارتی اقتصادیات کے دور میں منتقل کرنے والا ایک رابطہ قرار دیا ہے، مگر اس سے پہلے اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ''تمام باتوں کی طرح اس زمانہ کی بے چینیاں بھی خالص مذہبی نوعیت کی تھیں۔'' اس کے بعد آخر میں وہ یہ سوال کرتا ہے کہ ''پھر کیا وہاں کوئی تضاد تھا یا یہ بات ہے کہ دونوں نظریے باہم یک جا ہو سکتے ہیں۔'' ❷ ایک اور موقع پر واٹ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ دونوں نظریوں کا یک جا ہونا ممکن ہے۔'' ❸

## صحیح نقطہ نظر

اسلام نے مادی اسباب اور اقتصادی محرکات کو یقیناً ایک اہم حیثیت دی ہے، سیرت کے کچھ واقعات وہ ہیں جن کو ان ہی محرکات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے، مگر اسلام انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے۔ اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا دین ہے، جو ہر طرح کے حالات اور تبدیلیوں میں اپنی افادیت اور ضرورت کو برقرار رکھے گا، وہ ایک انقلابی دعوت ہے جس کے اثرات مادی یا اقتصادی حالات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گہرے اور دور رس ہیں، عقیدہ اور تاریخ انسانی پر اسلام نے جو ہمہ گیر اثرات ڈالے ہیں، انھیں محدود اقتصادی یا مادی اصطلاحات کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ واٹ نے اقتصادی محرک پر گفتگو کرتے ہوئے زیادہ معروضیت پسندی کا ثبوت دیا ہے، وہ کبھی تو اس محرک کی اولین حیثیت کا انکار کرتا ہے اور کہیں اسلامی نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، جس میں تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کی حقیقی بنیاد مذہب کو قرار دیا گیا ہے، واٹ کا یہ تجزیہ تاریخ کے مادی تجزیہ سے بالکل ہی مختلف ہے، وہ کہتا ہے کہ:

---

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۲۲۱۔ ❷ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۳۴۔۱۳۵۔
❸ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۶۳۔

''ہم اپنے موقف کو یہ کہہ کر متعین کر سکتے ہیں کہ محمد ﷺ اگرچہ اپنے زمانہ میں اور اپنے ملک میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی امراض کا وسیع علم رکھتے تھے تاہم وہ مذہبی گوشہ کو اصل اور بنیاد قرار دیتے تھے، اس لیے اسی گوشہ پر انھوں نے اپنی توجہ مرکوز کردی، اس طرح انھوں نے نئی امت کے اخلاق کو بھی متعین کر دیا، چنانچہ ابتدائی مسلمانوں نے اپنے عقائد اور مذہبی امتیازات کی طرف سختی سے دھیان دیا، مکی دور میں خصوصاً جب کہ مخالفین کے ساتھ مقابلہ میں تیزی آ گئی اور محمد ﷺ کی نبوت اختلاف کا بنیادی موضوع بن گئی، اس وقت بھی اگر کوئی شخص سیاست کی طرف متوجہ ہوتا وہ مسلمانوں کے درمیان اطمینان سے نہ رہ پاتا، کیونکہ مسلمانوں کے خیالات کا رخ مذہب کی طرف ہوگیا تھا، اس لیے مذہب ہی کی بنیاد پر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی گئی، اسلام قبول کرنے میں بھی شعوری طور پر سیاسی اقتصادی امور کا تقریباً کوئی اثر نہیں پڑا، یہ ہماری رائے ہے، اور ہمیں یہ یقین ہے کہ محمد ﷺ اور ان کے روشن خیال متبعین کو اپنے پیغام کی سیاسی اور سماجی اہمیت کا احساس تھا، ان کے لحاظ سے یہ خیالات مسلمانوں کے معاملات کی تنظیم میں اثر انداز ہوئے۔'' ❶

تاریخ کے مادی تجزیہ نے اگرچہ جابجا واٹ کے مذکورۂ بالا نظریہ کو متاثر کیا ہے، تاہم وہ ایک اور جگہ اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''محمد ﷺ نے جس دشواری کا مقابلہ کیا اس میں سیاسی، سماجی، فکری اور اقتصادی پہلو موجود تھے، مگر ان کا پیغام بنیادی طور پر مذہبی تھا، اور وہ اس طرح کہ اس پیغام نے اصل دشواری میں پوشیدہ مذہبی اسباب کا علاج کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے نتیجہ میں دوسرے گوشوں کا حل بھی نکل آیا، اسی وجہ سے مخالفت نے مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔'' ❷

---

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ایڈیشن) ص ۱۶۴۔۱۶۵۔

❷ ایضاً ص ۲۱۶۔

یہ نقطہ نظر مادی سبب کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ اس کو مناسب اہمیت بھی دیتا ہے، چنانچہ واٹ اس نقطہ نظر پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''مادی اسباب مذہبی اسباب کی نفی نہیں کرتے، یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ مذہبی افکار کا وجود ضروری ہے، تاکہ لوگوں کو اس صورت حال کا شعور حاصل ہو، جس میں وہ زندگی گزارتے ہوں، ان مقاصد کا ادراک ہو جن کے لیے وہ جدوجہد کریں، فکر ونظر مذہبی ہو تو سیاسی، اقتصادی اور سماجی مظاہر میں بھی اس کا اثر نمایاں ہوگا، مشرق قریب میں یہی ہوا، مگر اہل مغرب کی نظروں میں یہ عجیب وغریب صورت حال تھی، ہمیں اس بارے میں بے بصر نہیں ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ نے جس تحریک کی قیادت کی اس میں مذہبی پہلو ہمیشہ نہایت ہی صحت اور مضبوطی کے ساتھ دوسرے پہلوؤں سے وابستہ رہا ہے۔'' ❶

واٹ نے یہاں اقتصادی محرکات کے بارے میں مغرب کی تقلیدی گرفت سے آزاد ہو جانے کی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ سوال کرتا ہے،

''کیا اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ حجاز میں نئے دین کا ظہور اور پھر ایران، شام اور شمالی افریقہ میں اس کی اشاعت کا کسی اہم اقتصادی تبدیلی سے تعلق تھا؟''

اس سوال کا جواب خود واٹ ہی نے دیا ہے، وہ یہ لکھتا ہے کہ ''کچھ لوگوں نے مذکورہ سوال کے جواب میں یہ نشاندہی کی ہے کہ جزیرۃ العرب کے صحرا میں قحط تھا، اور بھوک کی وجہ سے یہ عرب فتوحات کی راہ پر چل پڑے تھے، لیکن اقتصادی تغیر کے عام اصول کو یہاں وقتی طور پر چھوڑ کر ہمارے لیے یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا، کہ صحرا میں موسمی حالات کی خرابی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد ثبوت موجود نہیں ہے۔'' ❷ اس ریگستان میں زندگی گزارنا ان کو پسند تھا، محمد ﷺ کے صحابہ کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ جزیرۃ العرب کے باہر فتوحات کے دوران میں وہ صحرا میں اپنی پسندیدہ زندگی کی طرف بار بار واپس آ جایا کرتے تھے، اس سے ہم کو یہ احساس بھی ہو جاتا ہے کہ ماضی کے مقابلے میں دیہاتی عربوں کی حالت اب زیادہ خراب نہیں تھی، بلکہ مکہ کی روز

❶ محمد ایٹ مکہ (عربی ایڈیشن ص ۴۳۹۔۴۴۰۔

❷ دیکھئے آرنلڈ ٹوائن بی کی کتاب دراسۃ فی التاریخ، عربی ترجمہ، ج ۳ ص ۴۳۹۔۴۴۵، ۴۵۴۔

افزوں ترقی کی وجہ سے ان کو استفادہ کا موقع مل رہا تھا، اس لیے وہ اب زیادہ بہتر زندگی گزار رہے تھے، حجاز میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں موجود تھیں جن کا مقصد خاص طور پر دیہاتی اور شہری عربوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا، چمڑے کا سامان بھی تیار ہوتا جس کا مرکز طائف تھا، لیکن محمد ﷺ کی سیرت نگاری میں ان صنعتوں کی اہمیت اس قدر نہیں ہے کہ ہم انھیں موثر عامل تسلیم کر لیں۔'' ❶

تاریخ کی مادی تشریح کے دلدادہ ہر ایسی بات کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں جو ان کے اقتصادی نقطہ نظر کو کچھ بھی سہارا دیتی ہو، مثلاً چمڑے کی صنعت یا انگور جو سرکہ اور شراب بنانے میں کام آتا، یا اسی طرح کی دوسرے صنعتیں، یہ ماہرین اقتصادیات حقائق کو نظر انداز کر کے نبوت، شعر و شاعری اور حکمت و فلسفہ کو اپنے مادی اصولوں کی زمین میں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں، پھر وہ اپنے تجزیہ کی جاں فشانی سے حیرت انگیز نتیجے برآمد کر لیتے ہیں، واٹ نے مادی نقطہ نظر کو رد کر دیا ہے، اس نقطہ نظر کے مطابق پیش کردہ نتائج کو وہ تضادات کا مجموعہ قرار دیتا ہے، وہ اگرچہ خود بھی کئی جگہ تضادات میں مبتلا ہوا ہے مگر مادی نقطہ نظر کے بارے میں اس کے خیالات واضح ہیں، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

''کمزور اور ناتواں افراد نے زیادہ تر اپنے داخلی اور خارجی اضطراب ہی کی وجہ سے اسلام کو قبول کیا تھا، وہ اقتصادی یا سیاسی مفاد سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے،...... اگر کچھ لوگوں کو اسلام کے سیاسی و اقتصادی پہلو نے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، مگر اس کے باوجود ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔'' ❷

واٹ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں تاریخی واقعات کی تشریح میں مادی محرک کی طرف بہت زیادہ توجہ کرنے کی دعوت دی تھی، مگر اس نے اس سلسلہ میں منطقی اصولوں، تاریخی صداقتوں اور تاریخ میں انسانی کردار کی پیچیدگیوں کو نظر انداز نہیں کیا، اس نے مادی محرک کا زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیا، اس طرح اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معروضیت پسند ہے جو مادی محرکات کے فریب میں آ گئے، اور بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے، البتہ واٹ مغربی ذہنیت کے نفسیاتی اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا اس کی وجہ سے وہ اپنے توازن کو بھی قائم نہیں رکھ سکا، ہم اگرچہ یہ

---

❶ محمد ایٹ مکہ، ص ۱۹۔۲۰۔ ❷ ایضاً ص ۱۶۴۔

بات نہ بھی کہیں کہ اس نے غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے، مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ بار بار غلط فہمی کی سرحد میں داخل ہوگیا ہے۔

### عمومی تبصرہ

مستشرقین کی تحقیقات کو پرکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں، کہ ان میں سیرت طیبہ کے مقام و معیار کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، ہم اگر جذباتی انداز سے بالاتر ہوکر سوچیں تو عقلی طور پر ان کے لیے ایسا ممکن بھی نہیں ہے، وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد رہ کر اور مذہبی تعصب، تاریخی کشمکش اور اپنے مادی نظریات سے ماوراء ہوکر ہی سیرت طیبہ کا منصفانہ طور پر مطالعہ کر سکتے ہیں، اور عام حالات میں یہ ان کے لیے ممکن بھی نہیں ہے، اس لیے سیرت پاک کے امتیازات اور اس کی گہرائیوں سے وہ بے خبر رہتے ہیں، ان مستشرقین میں بھی بڑا فرق ہے، مثلاً واٹ کا لامانس یا ولہاوزن سے تقابل کریں تو ان میں سے ایک کے یہاں ہمدردانہ نقطہ نظر ملے گا، تو دوسرا مستشرق تمسخر کرنے والا معلوم ہوگا، جس کو سنجیدہ بحثوں سے کوئی مناسبت ہی نہیں، وہ سب وشتم ہی کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہے، بہر حال دونوں طرح کے مستشرقین میں مخالفانہ جذبات یا احساس غیرت میں کمی وبیشی کا فرق تو ہوسکتا ہے، لیکن ان کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے، واٹ دوسرے مستشرقین کے برعکس زیادہ غیر جانب دار ہے اس نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کے بارے میں یہی رائے دی ہے، اس کے متعلق برطانوی مستشرق گب کی رائے گزر چکی ہے، فرانسیسی مستشرق میکسم روڈنسن نے یہ لکھا ہے کہ:

> ''یہ بڑی نادر بات ہے کہ تمھارے سامنے وہ صاحب علم ہے جو صرف تحقیقی مواد کو اکٹھا کرنے ہی کا اہتمام نہیں کرتا ہے بلکہ نئے نئے سوال سامنے لاتا اور پھر علمی انداز میں ان کے جوابات بھی دیتا ہے، مزید برآں وہ سچائی کے مقابلہ میں کسی فکر حیلہ گر سے کام لینے کے بجائے علمی طور پر سخت دیانت دار ہے، کشادہ خیالی، علمی دیانت اور حقیقت کو جستجو میں مہارت واٹ کا امتیاز ہے، اور اس امتیاز نے پیغمبر اسلام کا مطالعہ کرنے کے سلسلہ میں اس کی کتاب کو ایک تاریخی واقعہ بنا دیا ہے۔'' [1]

---

[1] محمد ایٹ مدینہ (عربی ترجمہ، شعبان برکات) مکتبہ عصریہ بیروت، ٹائٹل پیج، روڈنسن کی رائے کا ایک اقتباس۔

ہم نے واٹ کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ اس کے انداز تحقیق میں چند در چند خامیاں پائی جاتی ہیں، وہ شک وشبہ کی فضا تیار کرتا ہے یہاں تک کہ بعض تسلیم شدہ حقائق اور تاریخی صداقتوں کے بارے میں بھی شبہات کی تخم ریزی کرتا ہے، وہ ان کے کیفیتوں کا انکار کر بیٹھتا ہے، جن کا تذکرہ ماحول اور مذاق طبیعت کی وجہ سے اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں کیا گیا ہے، وہ اپنے مفروضات کی روشنی میں مشتبہ اور خیالی باتوں کو ایک واقعہ کی طرح قطعی انداز میں بیان کرتا ہے، وہ اپنے ماحول کے مخصوص طرز فکر کی روشنی میں قدیم تاریخی واقعات کو جانچنے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور ان احساسات وجذبات کو بھی منطق کے اصولوں کا تابع بنانا چاہتا ہے جو منطق کی دسترس سے باہر ہیں۔

بہر حال یہ مستشرقین اپنی غیر جانب داری، معروضیت اور وسیع مطالعہ کے باوجود سیرت طیبہ پر کوئی بہتر اور معیاری تحقیق پیش نہیں کر سکے، سیرت نبوی ﷺ کی روح اور مزاج سے ناواقفیت اور مادی طرز فکر کی وجہ سے وہ واقعات سیرت کا صحیح طور پر تجزیہ بھی نہیں کر سکے، ان کی تحقیقات سے سیرت طیبہ کی اصل روح مجروح ہوئی ہے، اور دانستہ انھوں نے صداقتوں کا انکار کیا، غلط فہمیوں کی تخم ریزی کی، اور اپنے مادی طرز فکر سے نبوت کے چہرہ کو داغ دار کیا ہے۔

# علامہ شبلی نعمانی اور مستشرقین

از: پروفیسر الطاف احمد اعظمی

علامہ شبلی کی شخصیت بڑی طرح دار اور بوقلموں تھی، خالص اسلامی علوم وفنون میں سے کون سا شعبہ علم ہے جو ان کی علمی مساعی کا مرہون منت نہیں ہے، تاریخ ہو، سیرت ہو، سوانح نگاری ہو، علم کلام ہو، تصوف ہو، فارسی اردو ادبیات ہوں، ہر جگہ علامہ شبلی کا قلم علم ودانش کے گہرہائے آب دار بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے، اس پر مستزاد ان کا علمی اور تحقیقی مزاج، جس نے ان کی تحریروں کو اعتبار اور وقار عطا کیا ہے، ان کی تصنیفات میں الفاروق اور سیرت النبیؐ کا درجہ کافی بلند ہے اور ان دونوں کتابوں میں ان کا تحقیقی مزاج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

یہی تحقیقی رجحان ان تحریروں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے جن کا تعلق مستشرقین کے علمی کاموں سے ہے اور یہی علمی کام اس وقت ہمارے زیر نظر مقالے کا موضوع ہے۔

مستشرقین جن کو مغرب میں Orientalist کہا جاتا ہے، یہ وہ مغربی علما وفضلا ہیں جنھوں نے مشرقی اقوام اور ان کے علوم وفنون کو اپنی علمی تحقیقات کا موضوع بنایا، ان میں مردہ اور زندہ دونوں اقوام شامل ہیں، مردہ اقوام میں کلدانی، بابلی، اہل نینوا، مصری، سریانی، یونانی وغیرہ اور زندہ اقوام میں اہل عرب (مسلمان) ہندی اور چینی شامل ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ مستشرقین کی علمی خدمات بڑی وقیع اور مستحسن ہیں، انھوں نے ایک طرف مردہ اقوام کی گم شدہ تاریخ کے ایک ایک ورق کو اپنی سعی پیہم اور عرق ریزی سے ایک جگہ جمع کیا اور اس کو قابل مطالعہ بنایا اور دوسری طرف زندہ اقوام کے علوم وفنون کو جو مخطوطات اور دستاویزات کی صورت میں دنیا کی مختلف لائبریریوں اور اہل علم کے ذاتی ذخیروں میں محفوظ مگر طاق نسیاں بنے ہوئے تھے، باہر نکالا اور ان کو اصلاح وتہذیب کے بعد شایع کر کے تشنگان علم کی سیرابی کا

سامان بہم پہنچایا۔

علامہ شبلی کا مزاج چونکہ خالص علمی اور تحقیقی تھا، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اس لیے انھوں نے غیر مسلموں کی علمی خدمات کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور ہر جگہ انصاف و دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق ''سیرت النبیؐ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اخیر اٹھارہویں صدی وہ زمانہ ہے جب یورپ کی سیاسی قوت اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی تھی جس نے اورینٹلسٹ کی ایک کثیرالتعداد جماعت پیدا کردی جنھوں نے حکومت کے اشارے سے السنہ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی مذاہب سے پہلے ہالینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بہ مقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد تھی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم العلوم قائم کیا اور آخرکار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے ممالک یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں۔'' ❶

انھوں نے آگے مزید لکھا ہے، ''مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھی، وہ ایک باستثنائے چند اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں سے اکثر کا یوروپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، سب سے پہلے ایک (متوفی ۱۷۷۴ء) نے تاریخ ابوالفدا، مع ترجمہ لاطینی وحواشی پانچ جلدوں میں شایع کی، ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھوس نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی ترجمہ شایع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر نے کلکتہ سے محمد بن واقدی کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی کوشش سے اشاعت کی،

❶ علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۴۹ء ج ال ۸۴-۸۶۔

اس کے علاوہ اسی مستشرق نے ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل نے ابن ہشام کا جرمن ترجمہ شایع کیا، والہوس نے ۱۸۸۳ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شایع کیا، ۱۸۸۳ میں لیڈن کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی، ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادرالوجود تاریخ بارتھ نولدیکی وغیرہ نے شایع کی اور سب سے اخیر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبویؐ میں کوئی تالیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شایع ہوتی رہی۔ ❶

مؤخرالذکر کتاب کے بارے میں یہ اظہار خیال کرتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں، ''ہم نہایت فیاض دلی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جو اعتنا ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا نوادر ڈھونڈ کر پیدا کر رہا ہے ہم خود نہیں کرتے بلکہ نہیں کر سکتے، مسلمانوں کو بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون سی نایاب کتابیں اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شایع کی ہیں۔'' ❷

طب اور تاریخ کے موضاعات پر مسلم علماء کی نادر تصنیفات کی دریافت اور ان کی اشاعت کا کام بھی مغربی فضلا ہی نے انجام دیا ہے، علامہ شبلی نے اس علمی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یورپ نے ہماری یادگاروں کے زندہ کرنے میں اور جو جو کام کیے ہیں وہ کیا کم ہیں، ان ہی کی بدولت فن حرب کی وہ کتاب شایع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس فن کے علمی اصول مرتب کیے تھے اور ان کی فن جنگ موجود فن جنگ کا مکمل خاکہ تھا، یورپ کی زہراوی کی کتاب فن تشریح کے متعلق چھپ کر شایع ہوئی جس میں کئی سوالات تشریح (سرجری) کی تصویریں اور ان کے استعمال کے طریقے درج کیے ہیں، پیٹ میں مرے ہوئے بچے کے نکالنے کے بیسوں آلات کے نقشے دے کر ان کے استعمال کے طریقے بتائے ہیں، یورپ ہی کی بدولت تاریخ طبری، طبقات

❶ علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۳۹ء ج ا ل ۸۴۔۸۶۔
❷ مقالات شبلی دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۳۳ء ج ۴، ص ا۔

ابن سعد اور تاریخ الحکما وغیرہ کا پتہ لگا جو گویا دنیا سے ناپید ہو گئی تھیں۔'' ❶

ایک طرف مستشرقین ہمارے علوم وفنون کو شائع کر کے ان کو ایک نئی زندگی دے رہے تھے، دوسری طرف مسلم علماء تحقیق وتدقیق کے میدان میں جاں فشانی کرنے کے بجائے فضول علمی مشاغل میں ہمہ تن مشغول تھے، علامہ شبلی نے بڑے دردو کرب کے عالم میں لکھا ہے:

''اسلام آج دنیا کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے، کروڑوں مسلمان موجود ہیں، بڑی بڑی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہیں، عربی علوم اسی زور وشور سے پڑھے اور پڑھائے جا رہے ہیں، اس بنا پر دنیا کو ہم سے اس کام کی توقع تھی لیکن ابھی ہم کو اور ضروری کاموں سے فرصت کہاں ہے، حمد اللہ کے بعض ضروری مقامات اب تک ناحل شدہ ہیں، شرح ملا کی ایک ضمیر کا مرجع اب تک متعین نہیں ہوا ہے، میر زاہد کی بعدیت زمانی اور مکانی کا اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا ہے اور خیر یہ سب کام ہو تو اٹھائے رکھے جا سکتے ہیں لیکن شیعوں کی تکفیر تو بہر حال مقدم ہے اور گو وہابیوں کا استیصال اس قدر ضروری نہ ہو لیکن آخر اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' ❷

ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ماتم سرائی کی ہے: ''ایک طرف تو ہمارے مولوی صاحبان مسلمانوں کو کافر بنانے میں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں جو صحابہ کافروں کو مسلمان بنانے میں کرتے تھے، دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضوں کا بادل عالم پر حیات برسا رہا ہے، دنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم وفنون، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش گاہ اِن گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجا دی گئی ہے، گویا پچھلا زمانہ سرو سامان سے دوبارہ سامنے آ گیا ہے۔'' ❸

علامہ شبلی نے مستشرقین کی علمی خدمات کی تحسین کے ساتھ ان کے علمی کاموں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے، دنیا کی ہر قوم کو اپنے علوم وفنون سے جو انس اور تعلق خاطر ہوتا ہے، وہ یقیناً دوسری اقوام

❶ مقالات شبلی دار المصنفین، اعظم گڑھ، ج ۴، ص ۶۷۔
❷ مقالات شبلی دار المصنفین، اعظم گڑھ، ج ۴، ص ۶۷۔
❸ مقالات شبلی دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۵۲۔

کے علوم وفنون سے نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ یورپ کے علماء فضلا نے مسلمانوں کی علمی یادگاروں کی اشاعت میں اس قدر کوشش کیں کہ خود مسلمان نہیں کر سکتے تھے اور نہ کیا، انھوں نے یہ غیر معمولی علمی خدمت خلوص نیت کے ساتھ کی تھی، دوسرے لفظوں میں کیا ان کو اسلامی علوم سے محبت تھی اور کیا وہ فی الواقع مسلمانوں کے علمی سرمایے کو جو گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا، محفوظ متعارف کرا کے ان کی علمی عظمت رفتہ کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کے ذریعے مسلم اقوام کے اندر علمی تحقیق کے جذبہ خفتہ کو بیدار کرنے کے خواہاں تھے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا، ان کی علمی مساعی کے پیچھے اس نوع کے اعلیٰ جذبات ومحرکات کارفرمانہ تھے بلکہ اس کے مقاصد کچھ اور تھے۔

مسلمان کی علمی یادگاروں کی اشاعت کا اصلی محرک دراصل ان کا قومی اور مذہبی مفاد تھا، جس طرح عہد عباسی میں مسلمانوں نے یونانی علوم وفنون کو عربی زبان میں اس لیے منتقل نہیں کیا کہ ان کو یونانیوں کے علوم وفنون سے کوئی محبت تھی بلکہ اصلی غرض یہ تھی کہ وہ ان علوم وفنون کے سرپرست بنیں اور ان کو سیکھ کر اسلامی تہذیب کو وسیع اور بوقلموں بنائیں اور یہ کام انھوں نے شان دار طریقے سے انجام دیا، ٹھیک اسی طرح جس وقت مغربی اقوام کو دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل ہوا اور انھوں نے علوم وفنون کے میدان میں پیش قدمی شروع کی تو ان کی نظر مسلمانوں کے عظیم الشان علمی کاموں پر پڑی جو ان کے دور اقبال میں انجام پائے اور جس کی وجہ سے وہ دنیا میں سرخرو اور بلند ہوئے تھے، چنانچہ وہ ہر طرح کی مشقت اٹھا کر اس علمی گنج گراں مایہ تک پہنچے جن کا تعلق ادب، فلسفہ وسائنس اور طب جیسے علوم سے ہے، مستشرقین کی یہ علمی خدمت جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے، بلاشبہ قابل ستایش ہے، اگرچہ اس میں ان کے قومی تعصب کی بھی کارفرمائی ملتی ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے لیکن خالص اسلامی علوم، مثلاً تفسیر، سیرت رسول، تاریخ اسلام سے متعلق مسلمانوں کے قدیم علمی سرمائے کی حفاظت واشاعت کے سلسلے میں مستشرقین نے جو کوشش کی ہیں، اس کا اصلی محرک وہ بغض عناد تھا جو وہ اسلام کے خلاف رکھتے تھے، خدمت علم کی حیثیت بالکل ثانوی تھی، یورپ نے صلیبی جنگوں کے بعد خوب اچھی طرح جان لیا کہ مسلمانوں کی گزشتہ سیاسی عظمت وشوکت کا راز ان کی مذہبی

کتاب (قرآن) اور ان کے پیغمبر کی شان دار اور آفاقی سیرت میں پوشیدہ ہے، اس لیے مستقبل میں مغربی اقوام کو مسلم مجاہدوں کی تاخت سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس مذہب میں کیڑے نکالے جائیں، اس کی تعلیمات کے معنی ومفہوم میں تبدیلی کی جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے رسولؐ کی سیرت میں داغ دھبے تلاش کر کے عیب دار بنایا جائے، یہ مذموم کام اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ وہ اسلامی ماخذ تک براہ راست پہنچیں، چنانچہ مغربی فضلا نے یہ کام دل لگا کر کیا، تمام قدیم ماخذوں کو جو ہنوز مخطوطات کی صورت میں تھے شایع کیا اور پھر مذکورہ مقاصد کی خاطر مختلف اسلامی موضوعات پر انھوں نے کتابیں لکھیں، ان کتابوں میں انھوں نے اسلام کے بارے میں ہر طرح کی بدگمانیاں پیدا کیں، قرآن اور پیغمبر اسلام کو خالص طور پر اپنی افترا پردازی اور جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔

مستشرقین کے ان ناپاک عزائم سے علامہ شبلی پوری طرح باخبر تھے۔ جرمنی کے مشہور فاضل سخاؤ نے جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، ''طبقات ابن سعد'' شایع کی تو انھوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''اس جرمن فاضل کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، البیرونی کی ''کتاب الہند'' کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے لیکن اس دیباچہ میں اسلامی امور سے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خالص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا (ج ۱۶) میں قرآن مجید پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے، وہ مستشرقین جنھوں نے خالص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر اور مارگولیوس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن ان کا یہ حال ہے کہ دیکھتا سب کچھ ہے لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔''

مارگولیتھ نے مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی

تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب مذہب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ اور معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو نہیں ہوسکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنو میں آ کر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب ''الاصابہ فی احوال الصحابہ'' اول اول ان ہی نے ہی تصیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تین جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔'' ❶

مستشرقین کا سب سے زیادہ محبوب موضوع، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، پیغمبر اسلام کی ذات گرامی ہے، شاید ہی کوئی قابل ذکر مستشرق ہو جس نے اس موضوع پر تھوڑی بہت خامہ فرسائی نہ کی ہو، اس سلسلے میں مارگولیتھ، سرولیم میور ❷ اور مونٹگمری واٹ ❸ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، ان فضلائے یورپ نے نبی ﷺ کی جو سیرت لکھی ہے اس میں مذہبی تعصب، دروغ گوئی، افسانہ طرازی اور اسلام کے خلاف ان کا جذبہ عناد اپنے نقطہ عروج پر ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ہر نبی کا تعلق اپنے معاشرے کے اہل خاندان بالخصوص مذہبی خانوادے سے رہا ہے، مستشرقین اس تاریخی حقیقت سے بہ خوبی آگاہ تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے نبی ﷺ کے حسب ونسب پر سوالیہ نشان لگایا، مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ

❶ سیرت النبی، ج ۱ص ۸۹۔۹۱۔

❷ سرولیم میور نے جب ''دی لائف آف محمد ﷺ'' لکھی تو اس کو دیکھ کر بہ قول سرسید کا دل کباب ہوگیا، اس کتاب کی خطرناکی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ سرسید اس کا جواب لکھنے کے لیے انگلینڈ گئے تاکہ وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کر کے اس مستشرق کے دجل فریب کا پردہ چاک کرسکیں، چنانچہ ''خطبات احمدیہ'' کے نام سے ایک معرکہ آرا کتاب لکھی جو آج بھی اس موضوع پر ایک مفید اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

❸ اس مستشرق (منٹگمری واٹ) نے حضور ﷺ کی لائف، محمد ایٹ مدینہ اور محمد دی مکہ کے نام سے لکھی۔

''محمد ﷺ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے'' ❶ سر ولیم میور نے اس سے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کا نسبی تعلق خاندان اسماعیل سے ثابت نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں ''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسماعیل کی اولاد سے خیال کیا جائے ان کی عین حیات میں پیدا ہوئی تھی اور اس طرح پر محمد ﷺ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑ لیے گئے تھے اور اسماعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے۔'' ❷

اس الزام کی لغویت اس قدر واضح ہے کہ اس پر نقد و تبصرہ کی حاجت نہیں، اہل علم کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ آپ ﷺ کا تعلق خانوادۂ اسماعیل سے تھا، یہ امر کبھی نزاعی رہا ہی نہیں، یہ محض مستشرقین کے دماغ کی اختراع ہے۔

ان کی دروغ گوئی کی انتہا یہ ہے کہ انھوں نے یہ لغو بات بھی لکھ دی کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام نبوت سے پہلے بت پوجتے تھے، مارگولیتھ لکھتا ہے: ''محمد ﷺ اور خدیجہ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا'' ❸ اس نے اس گندے الزام کے ثبوت میں مسند امام احمد بن حنبل کی ایک روایت (ج ۴، ص ۲۲۲) نقل کی ہے جو درج ذیل ہے:

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی وعو یقول لاخدیجة، ای خدیجة، والله لا اعبد الات والعزی، والله لا اعبد ابداً قال فتقول خدیجة: خل الات وخل العزی، قال كانت صنمینع التی كانو ایعبدون ثم یضطجعون.

''مجھ سے خدیجہ بنت خویلد کے ایک ہم سایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب کو حضرت خدیجہ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ، باخدا میں کبھی لات وعزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر

❶ سیرت النبی، ج ۱، ص ۱۵۳ (بر حاشیہ)۔ ❷ سیرت النبی، ج ۱، ص ۱۵۱ (بر حاشیہ)۔
❸ سیرت النبی، ج ۱، ص ۱۷۹۔۱۸۰ (بر حاشیہ)۔

بھی نہ کیجئے)، اس نے کہا کہ لات وعزیٰ وہ بت تھے جن کی پرستش وہ (اہل عرب) سونے سے پیشتر کر لیا کرتے تھے۔"

ایک غیر مسلم، جو عربی زبان سے ناواقف ہوگا، مارگولیتھ کے اس انکشاف کو تسلیم کرلے گا کہ آنحضور ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آغاز اسلام سے پہلے فعل شرک کے مرتکب ہوئے تھے لیکن عربی زبان سے واقف شخص اس تحقیق کو پڑھ کر اپنا سر پیٹ سے لے گا کہ جہل وتعصب کی اس سے بڑی مثال علم وتحقیق کی دنیا میں مشکل سے مل سکے گی۔

علامہ شبلی نے مارگولیتھ کی اس تحقیق پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے: "ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کـانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات وعزیٰ کی پرستش کرتے تھے، آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو تثنیہ (کانا) کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات وعزیٰ کی پرستش سے آنحضرت ﷺ کا سخت انکار مذکور ہے۔" ❶

مستشرقین نے پیغمبر اسلام کے دعویٰ نبوت کی تردید میں جس واقع کو سب سے زیادہ شہرت دی اور اس سلسلے میں خوب رنگ آمیزی کی ہے وہ شام کے سفر میں عیسائی راہب بحیرا سے آپ ﷺ کی ملاقات کا واقعہ ہے، انھوں نے اس واقعہ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ نبی ﷺ کی تعلیمات دراصل بحیرا راہب کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں، دوسرے لفظوں میں اسلامی تعلیمات کا ماخذ انسانی ذہن ہے، وحی والہام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، ڈریپر "معرکہ علم ومذہب" میں لکھتا ہے:

> "بحیرا راہب نے بصرہ کی خانقاہ میں محمد ﷺ کو نسطوری عقاید کی تعلیم دی...... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا...... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔" ❷

اس تاریخی روایت کے اخذ وقبول میں محدثین نے حد درجہ سہل انگاری کا ثبوت دیا ہے، یہ

---

❶ سیرت النبی، ج ا ص ۱۷۹۔۱۸۰ (بر حاشیہ)۔ ❷ سیرت النبی، ج ا ص ۱۶۷۔

ظاہر اس روایت سے پیغمبر اسلام کی عظمت و بزرگی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے محدثین اور پھر ان کی پیروی میں مسلم مؤرخین نے اس کو کسی جرح و نقد کے بغیر قبول کر لیا اور اس سازش کو نہ دیکھ سکے جو اس اختراعی روایت کے پیچھے کام کر رہی تھی، علامہ شبلی میری معلومات کی حد تک پہلے عالم اور مورخ ہیں جنھوں نے اس تاریخی بیان کو روایت اور درایت دونوں طریقوں سے جانچنے کے بعد اس کی صحت سے انکار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقایق سکھا دیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔'' ❶

پیغمبر اسلام کے بعد مستشرقین کے مذہبی تعصب اور ان کی علمی فتنہ انگیزی کا نشانہ قرآن مجید بنا ہے، اکثر مستشرقین کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ قرآن مجید الہامی کتاب نہیں ہے، یہ محمد ﷺ کی تالیف ہے اور اس کی تعلیمات کا مصدر و ماخذ تورات اور انجیل ہیں جیسا کہ بحیرا راہب کے واقعہ کے ضمن میں بیان ہوا، قرآن مجید پر مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ منظم کلام نہیں ہے بلکہ منتشر خیالات کا مجموعہ ہے اور اس میں عرب کی بدویانہ معاشرت کی جھلک نمایاں ہے اور ان ہی کے امور مسائل سے اس میں بحث کی گئی ہے، دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ خدا کے بجائے ایک انسان کا کلام ہے۔

مستشرقین کے اس مذہبی تعصب اور غیر علمی رویے کی وجہ بالکل ظاہر ہے، قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے عقاید و اعمال پر شدید تنقید کی ہیں اور ان کو باطل ٹھہرایا ہے، مثلاً عیسائیوں کا عقیدہ

❶ ایضاً۔

تثلیث، عقیدہ الوہیت مسیح، عقیدہ کفارہ، اکل اموال بالباطل اور رہبانیت وغیرہ اور یہودیوں کا کتمان حق تورات کے احکام سے ان کی روگردانی، بت پرستی، واقعہ ذبح کی پردہ پوشی، مصلوبیت مسیح اوران کے ایک فرقے کا انکار آخرت وغیرہ، اگر مستشرقین یہ تسلیم کر لیتے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا کہ اس کتاب میں ان کے عقائد واعمال پر جو تنقیدات کی گئی ہیں وہ صحیح ہیں، اور یہ اعتراض قومی خودکشی کے مترادف تھا، اس لیے انھوں نے اس کتاب کے کلام خداوندی ہونے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کی تردید تحقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

جارج سیل نے انگریزی زبان میں پہلی بار قرآن مجید کا ترجمہ تفسیر چار جلدوں میں ۱۷۳۴ء میں شائع کیا، اس کے دیباچہ میں اس نے ترجمہ وتفسیر کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ وتفسیر ان لوگوں کے لیے ہے یعنی پادریوں کے لیے جو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہیں، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ صرف پروٹسٹنٹ ہی کامیابی کے ساتھ قرآن مجید پر حملہ کر سکتے ہیں اور قدرت نے ان کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کو شکست فاش دیں، اس کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جعلی اور خودساختہ ہے۔ ❶

اس گندی ذہنیت کا مظاہرہ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو لندن ٹائمز میں ایک مطبوعہ مضمون کی صورت میں ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ قرآن کے بعض ایسے قدیم اجزا ہاتھ آئے ہیں جو موجودہ قرآن سے مختلف ہیں، علامہ شبلی نے اس خبر کے متعلق خدشات کا اظہار کیا اور وہ بعد میں سچ نکلے اور ثابت ہوگیا کہ یہ دشمنان اسلام کی ایک سازش تھی، بعض مستشرقین نے نبی ﷺ کے مختلف ناموں کی بنیاد پر تحریف قرآن کا دعویٰ کیا لیکن یہ دعویٰ بھی ریت کی دیوار کی طرح جلد ہی زمیں بوس ہوگیا۔

پیغمبر اسلام اور قرآن کے بعد مستشرقین نے اپنے افترا پردازی کا خاص نشانہ خلفائے راشدین بالخصوص خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بنایا، فاروقی خلافت کی صورت میں اسلام کا سیاسی اور روحانی نظام جس شاندار صورت میں متشکل ہوا وہ مستشرقین کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، چنانچہ انھوں نے الزام لگایا کہ کتب خانہ اسکندریہ خلیفہ دوم کے حکم سے جلایا گیا تھا، جرجی

❶ اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مضامین) مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء ج ۲ ص ۱۰۷۔

زیدان مسیحی نے اپنی کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' میں اس الزام کو نئے دلائل سے آراستہ کر کے پیش کیا، علامہ شبلی عالم اسلام کے پہلے عالم اور مصنف تھے جنھوں نے اس مسیحی مورخ کی کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا اور ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے اس کا جواب لکھا، انھوں نے اس کتاب میں محکم تاریخی دلائل کے ساتھ بہترین علمی و تحقیقی اسلوب میں جرجی زیدان کے لغو الزام کی تردید کی، علامہ کی اس گراں قدر علمی و مذہبی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''مشہور مسیحی مصری فاضل جرجی زیدان نے بیسویں صدی کے اوائل میں جب مصر سے اپنی مشہور کتاب تاریخ التمدن الاسلامی شایع کی تو علمی حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی، جرجی زیدان کی اس کتاب میں معلومات و مواد کی فراوانی کے ساتھ اموی وعباسی خلفا کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ اور بعض تاریخی حقائق کی تحریف سے کام لیا گیا تھا اور کتب خانہ اسکندریہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ لگا دینے کی اس بے اصل داستان کو دہرایا گیا تھا، جو عرصہ سے مسیحی مؤرخین کا وتیرہ بن گیا تھا، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی رگ حمیت بھڑک اٹھی اور مولف کا علامہ کی تعریف و توصیف اور ان کی کوششوں کا سراہنا، بعد مکانی اور خود مصر میں جید علما کی موجودگی کوئی بھی چیز علامہ شبلی کی راہ میں حایل نہ ہوسکی، انھوں نے عربی زبان میں ۱۹۱۲ء میں الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی کے نام سے کتاب لکھی جس میں پر زور دلائل سے ان الزامات کی تردید کی، ہندوستان اور مصر کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا اور اہل حمیت اور عرب فضلا بالخصوص علامہ سید رشید رضا نے ان کی اس خدمت کا ممنونیت و تشکر کے ساتھ ذکر کیا۔'' ❶

حقیقت یہ ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی پر علامہ شبلی کی تحریر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، ایک طویل مدت کے بعد عیسائی اہل علم نے اپنے پیش رؤوں کی اس علمی دروغ گوئی کا

❶ اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مضامین) مطبوعہ دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء ج ۲ ص ۲۸۰۔۲۸۱۔

اعتراف کیا، اس معاملے میں مشہور مورخ گبن (م۱۷۹۴ء) کی حق گوئی قابل تحسین ہے، یہ یورپ کا پہلا عیسائی مورخ ہے جس نے نہ صرف عیسائیوں کے مذکورہ الزام کی تردید کی بلکہ خود عیسائیوں کو کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا ذمہ دار قرار دیا۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ مستشرقین نے بعض دوسرے مسائل کے بارے میں بھی معاندانہ خامہ فرسائی کی ہے، مثلاً تعدد ازدواج حنفی فقہ کا رومن سے ماخوذ ہونا، اسلامی قانون کے ارتقاء میں رومن لا کے اثرات، جزیہ حقوق الذمیین اور سلاطین اسلام کی عیش کوشی وغیرہ، علامہ شبلی نے ان تمام امور سے متعلق مستشرقین کی غلط بیانیوں کی مدلل تردید کی ہے، پروفیسر نظامی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مدت العمر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمنر میں کیا گیا تو مولانا شبلی نے اس پر پُرزور تنقید کرتے ہوئے کہا: ''ہم بتا دیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا'' اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا، پادری بروچلی نے تعدد ازدواج پر اعتراض کیے تو مولانا شبلی کا قلم حرکت میں آیا، جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کی پردہ دری کا کام بھی مولانا شبلی ہی نے انجام دیا، آرمینیا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہوچکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، مولانا شبلی نے حقوق الزمیین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کر دیا۔'' [1]

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ مستشرقین نے بلا شبہ قرآن، سیرت نبی عربی اور خلیفہ دوم کے بارے میں دروغ گوئی اور افترا پردازی کی ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا، لیکن سائنسی علوم وفنون کے میدان میں کار ہائے نمایاں انجام دینے والے مسلم علماء فضلا کے علمی کارناموں کے اعتراف وتحسین میں انھوں نے انصاف ودیانت کا حق ادا کیا ہے، پروفیسر نظامی لکھتے ہیں:

[1] اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مضامین) مطبوعہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ص۲۲۔

''علوم اسلامی پر کام کرنے میں مستشرقین نے جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جدوجہد کا ثبوت دیا ہے اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم وفنون کے مطالعہ اور تحقیق میں بسر کردیں، اس کو نظرانداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا،

مولانا ابو الکلام آزاد نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا:

''تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کردینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کشکول خالی ہوجاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں''

مولانا شبلی نے طبقات ابن سعد، مناقب عمر بن عبدالعزیز، تجارب الامم وغیرہ کی اشاعت پر مستشرقین کو مبارک باد دی تھی اور ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا تھا،

تاریخ، جغرافیہ، لغت، طب، فلسفہ، ادب پر قدیم مسلمان علماء نے جو بیش بہا علمی کام کیے تھے ان کو مستشرقین کے ذوق نے تباہی سے بچایا اور علمی حلقوں تک پہنچایا۔'' ❶

اس میں کیا شبہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ مستشرقین نے مسلمانوں کے مذہبی اور عقلی علوم وفنون کے تحفظ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اس کا اعتراف سب نے کیا ہے، علامہ شبلی کے اعترافات ہم نقل کرچکے ہیں لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے علمی کاموں کی اہمیت گھٹانے اور بسا اوقات ان کی اخفا کی کوشش کی ہے، اس علمی تعصب کی طرف بہت سے اہل علم کی نظر نہیں جاسکی ہے اور اس میں پروفیسر نظامی بھی شامل ہیں۔ ❷

اکثر مستشرقین نے اپنے معروف قومی تعصب کی وجہ سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مسلم علماء نے یونانی علوم میں کوئی اضافہ نہیں کیا اور اس باب میں ان کی کوئی خدمت اگر قابل مدح ہوسکتی ہے تو یہ کہ انھوں نے یونانی علوم وفنون کے ضائع ہوجانے سے بچالیا اور شرح وتفسیر کرکے ان کو قابل فہم

---

❶ اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مضامین) مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص ۲۳۔

❷ جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، علامہ شبلی نے اپنے مختلف مقالات میں مسلم فلاسفہ کی علمی خدمات کو نمایاں کیا اور بتایا کہ انھوں نے یونانی فلسفہ میں کیا اضافہ کیا، کن کن مسائل میں ان سے اختلاف کیا اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کی، (مقالات شبلی، فلسفانہ مضامین، ج ہفتم) لیکن دیگر شعبہ ہائے علم میں مسلم فضلا کی علمی خدمات کے بارے میں مستشرقین کی غلط بیانیوں کا ازالہ نہ ہوسکا۔

اور لائق مطالعہ بنایا، مشہور ریاضی دان فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

"Mohammadan civilization in its great days was admirable in the arts and in many tecnical ways but at showed no capacity for independent speculation in theoretical matters its importance which must not be underrated is as a transmitter"❶

ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے:

"Arabs were better as commentators than as original thinkers"❷

ایک مغربی فاضل نے مسلم حکام کے بارے میں یہ تحقیر آمیز جملہ لکھا ہے کہ وہ فلسفہ ارسطو کے قائل تھے۔ ❸ اکثر مستشرقین نے امام غزالی کو اپنی تنقید کا نشانہ محض اس وجہ سے بنایا کہ انھوں نے اپنی کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' میں ارسطو کے الٰہیاتی مسائل کی غلطیاں واضح کیں، مغرب کے اتنے بڑے امام فلسفہ کی توہین ان کے لیے نا قابل برداشت تھی، چنانچہ انھوں نے نہ صرف ان کی مذمت کی بلکہ یہ الزام بھی لگایا کہ وہ فلسفہ وسائنس کے دشمن تھے اور ان ہی کی وجہ سے مسلمان فلسفہ وسائنس کے میدان میں پیچھے رہ گئے، میکس میر ہاف لکھتا ہے:

''اسلامی شریعت کے ابتدائی ایام میں تمام علوم کے مطالعہ کی اجازت ہر شخص کو حاصل تھی لیکن مشہور عالم دین اور فلسفی امام غزالی (۱۱۱۱ء) کے عہد سے سائنسی علوم کا مطالعہ ممنوع قرار پایا مبادا کہ اسلامی عقائد بالخصوص آغاز کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں مشکوک وشبہات پیدا ہو جائیں۔'' ❹

افسوس کہ بہت سے مسلمان اہل قلم مغربی فضلا کی اس افتراء پردازی کا شکار ہوئے ہیں، مثال کے طور پر پروفیسر نسیم انصاری نے لکھا ہے کہ ''ہمارے علما نے مسئلہ کے اس رخ پر غور نہیں کیا اور وہ

---

❶ ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی، برٹرینڈ رسل، لندن، ۱۹۵۷ء ج ا ص ۲۹۸

❷ ایضاً، ص ۳۰۶۔

❸ مقالات شبلی (فلسفانہ مضامین) دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء ج ہفتم، ص ا۔

❹ دی لیگیسی آف اسلام، مرتبہ تھومس آرنلڈ والفریڈ ہیوم، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۴۷ء ص ۳۳۷۔

غزالی کی باتوں میں آ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں سائنس پڑھ کر ہمارے عقائد خراب نہ ہو جائیں۔'' ❶

ان اہل علم کو نہیں معلوم کہ امام غزالی فی نفسہ فلسفہ کے مخالف نہیں تھے، ان ہی کی کوششوں سے بغداد کے مدرسہ مستنصریہ کے نصاب تعلیم میں فلسفہ کو داخل کیا گیا ملحوظ ہے کہ ابتداء میں سارے عقلی علوم کا شمار جن میں سائنسی علوم بھی شامل تھے، فلسفہ کے زمرے میں ہوتے تھے، امام غزالی کو فی الواقع فلسفہ سے جو اختلاف تھا وہ اس کے چند مابعد الطبیعیاتی مسائل کے بارے میں تھا، حدوث وقدم عالم، خدا کا علم کلی اور حشر اجساد وغیرہ ان کے نزدیک فلسفہ کی دیگر شاخوں میں کوئی ایسی بات نہیں جو مذہب کے خلاف ہو۔

بہر حال مستشرقین نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی علمی تحقیق کا سہرا کسی مسلمان عالم کے سر نہ بندھے، چنانچہ جب بھی انھیں کسی مسلم فاضل کی کسی اہم علمی تحقیق کا سراغ ملا، وہ فوراً جھوٹ کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے اور ارشاد ہوا کہ یہ کوئی نئی تحقیق نہیں، فلاں یونانی عالم کتاب میں یہ چیز پہلے سے موجود ہے اور مسلمانوں کی جن علمی تحقیقات کو وہ کوشش کے باوجود قدیم مغربی فضلا کی تحریروں میں دریافت نہ کر سکے، ان کی پردہ پوشی کی ہر ممکن کوشش کی، مثلاً علامہ ابن نفیس (علاء الدین ابو الحسن علی بن ابی حزم القرشی الدمشقی، المعروف بہ ابن نفیس، متوفی ۱۲۸۸ء) نے تیرہویں صدی میں ریوی دوران خون (Pulmonary blood circulation) کو دریافت کر لیا تھا لیکن مغرب کے اہل علم نے اس دریافت کا سہرا میچل سرویتس (م ۱۵۵۳ء) کے سر باندھ دیا، جب انیسویں صدی میں قطعی دلائل سے ثابت ہو گیا کہ یہ تحقیق علامہ ابن نفیس کی ہے تو بھی وہ مدتوں اس کے اعتراف سے پہلو تہی کرتے رہے، آخر میں میکس میر ہاف نے بادل نہ خواستہ تسلیم کر لیا کہ ریوی دوران خون کی دریافت ابن نفیس نے کی ہے لیکن یہ بھی کہہ دیا اس نے خود ڈسکشن (چیر پھاڑ) نہیں کیا تھا، دوسرے لفظوں میں اس نے ریوی دوران خون کا جو انکشاف کیا وہ محض قیاسی نوعیت کا تھا اور بالکل اتفاق سے درست نکلا۔ ❷

---

❶ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جنوری ۱۹۸۸ء ص ۲۵۔

❷ عبدالکریم، ابن النفیس، مطبوعہ پیرس، ۱۹۵۲ء ص ۴۴۔

مستشرقین کی قومی تعصب اوران کی غیر علمی روش کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ انھوں نے اکثر مسلم حکماء فضلا کے ناموں کوتبدیل کردیا تا کہ یہ معلوم نہ ہوسکے کہ یہ مسلم تھے، چنانچہ انھوں نے ابن سینا کو Avicenna، امام غزالی کو Al-Gazel ابن رشد کو Avirroes اور ابن الہیثم کو Al-Haizam بنا دیا، دوسرے مسلم علماء فضلا کے ناموں کے ساتھ بھی انھوں نے یہی سلوک کیا ہے، اس سے قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ مستشرقین خالص عقلی علوم کے باب میں کس درجہ شدید قومی تعصب میں مبتلا تھے۔

گزشتہ صفحات میں مستشرقین کی علمی خدمات کے اجمالی جائزے سے دو باتیں بالکل واضح ہوگئیں، ایک یہ کہ مغربی فضلا نے اسلامی علوم وفنون کو جن میں مذہبی علوم بھی شامل ہیں، جس غیر معمولی کاوش سے محفوظ کیا وہ قابل تعریف ہے لیکن ان کے مقاصد اچھے نہیں تھے اوران کا علمی رویہ غیر معروضی تھا، اس علمی خدمت کے پیچھے ان کی صلیبی ذہنیت کارفرما تھی، دوسرے یہ کہ مستشرقین کی علمی خیانتوں کی پردہ دری میں علامہ شبلی نے جو مہتم بالشان علمی جدوجہد کی وہ قابل ستائش ہے اور اس راہ میں کاوش کی دعوت دیتی ہے۔

# آنحضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر یورپین تصانیف

ڈاکٹر محمد حمادہ
تلخیص: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

آنحضور ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق مغرب میں شروع دن سے لکھنے لکھانے اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے لیکن زیادہ تر دشمنی اور تعصب کے ماحول میں۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ دنیا کو تحمل، برداشت اور رواداری کا درس دینے والا مغرب بذات خود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق بے حد تعصب، جہالت اور عدم برداشت کا مظہر رہا ہے اور صدیوں سے چلی آنے والی دشمنی اور تعصب کی روایت کو موجودہ دور میں بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

مغرب میں آنحضور ﷺ کی ذات کے متعلق جو جھوٹا اور غلط پروپیگنڈا کیا جاتا رہا اور جس کی رو میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی بہہ گئے، اس کا مطالعہ دراصل مغربی ذہن کا مطالعہ کرنے کے لیے بے حد ضروری اور اہم ہے۔ ہم مغرب میں مطالعہ سیرت کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱: ابتدائی دور

۲: صلیبی جنگوں کا دور

۳: نشاۃ ثانیہ سے لے کر انیسویں صدی تک کا دور

۴: انیسویں صدی اور مابعد کا دور

## ابتدائی دور

عیسائیوں کی قدیم ترین کتاب جس میں رسول اکرم ﷺ کا ذکر ہے، وہ سیبوس الارمنی کی ہے جو پہلی صدی ہجری/ ساتویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، اس میں صرف یہ ذکر ہے کہ محمد ﷺ،

اسماعیلی تھے، انھوں نے نبوت کا دعوی کیا اور اپنے وطن کے لوگوں کو دین ابراہیمی کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔ یہ کتاب لینن گراڈ سے ۱۸۷۹ء میں چھپی (۱۰۶ صفحات) اس کا روسی زبان میں ترجمہ مستشرق باخیان کی نگرانی میں ہوا اور ۱۸۶۲ میں چھپا (صفحات ۱۱۶۔۱۱۸) ❶ ظاہر یہ ذکر ضمنی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلا عیسائی جس نے آنحضور ﷺ پر تصنیف وتالیف کا آغاز کیا یوحنا الدمشقی (John of Dinascus)(۷۰۰تا۷۴۹ء) تھا۔ اس کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے پورے تعصب اور دجل وفریب کے ساتھ اسلام کے خلاف لکھا۔

اس کی ولادت دمشق میں ہوئی، خلیفہ اموی کی خدمت میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ عیسوی تعلیمات کے لیے دہرا (کنیسہ) میں چلا گیا۔ اس نے اسلام کا ذکر ایک ''بت پرست جاہلی مذہب'' کے طور پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کعبہ کا ''افرودیت'' نامی بت کے ساتھ تعلق تھا، اس نے ایک مسلمان اور ایک عیسائی کے درمیان خیالی مکالمہ بھی نقل کیا ہے جس میں اس نے مسیحیت کا بھرپور طریقے سے دفاع کیا ہے۔ یوحنا نے ان دونوں کی گفتگو دوسرے عیسائیوں کی رہنمائی کے لیے نقل کی ہے، اس نے رسول اکرم ﷺ کا ذکر کسی نئے دین کے بانی کے طور پر کرنے کی بجائے (العیاذ باللہ) ایک بدعتی کے طور پر کیا ہے اور یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ محمد ﷺ مسیحی تھے اور آپ نے عیسائیت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی، ❷ یہ غلط فہمی سترہویں / اٹھارہویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ اس نے اسلام کا تعارف ایک بت پرست مذہب کے طور پر کرایا ہے اور یہ کہ ان عقائد کی تعلیم آنحضور ﷺ کو ایک اربانی نامی راہب نے دی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کریم میں محمد ﷺ کا ذکر جمل اللہ (اللہ کے اونٹ) کے طور پر آیا ہے۔ اسی سے اس کے مبلغ علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۲: اسی طرح کا ایک رسالہ ہے جو عبدالمسیح بن اسحاق الکندی سے منسوب ہے لیکن خود مغرب میں

---

❶ دیکھیے The Christian approch to the Moslem A historical Study:J.T. Addison، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک ۱۹۴۲ء، ص ۲۶۔

❷ ایضاً۔

یہ مشکوک ومشتبہ ہے۔

اس رسالے کو مغرب میں انیسویں صدی میں عربی متن کے ساتھ (Tiea) نے لنڈن سے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا اور اس کے ساتھ اس کا انگریزی میں خلاصہ بھی دیا، اسی طرح معروف متعصب مسیحی مولف ولیم میور نے بھی ''رسالہ الکندی'' کے نام سے اپنی کتاب میں اسے ضمیمہ کے طور پر لنڈن سے طبع کیا۔ یہ رسالہ عہد وسطی میں بھی بے حد معروف رہا، اس کا لاطینی ترجمہ پطرس نامی شخص نے کیا جو طلیطلہ (اندلس) کا رہنے والا تھا، اس کا خلاصہ فیسائنت دو بو فیہ کی کتاب Speculum (دیکھیے آیندہ صفحات) میں شامل ہیں۔

عیسائیوں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی نسبت الکندی کی طرف درست ہے، ان کے مطابق الکندی جو المامون الرشید العباسی (۱۹۹۔۲۱۸ھ/ ۸۱۳۔۸۳۳ء) کے زمانے کا معروف نسطوری عالم تھا، نے یہ رسالہ لکھ کر خلیفہ کے چچازاد بھائی عبداللہ عباسی کو بھیجا، جس نے اسے قبول اسلام کی دعوت دی تھی۔

اس رسالے میں مسیحیت کے حق میں کئی دلائل و براہین پیش کیے گئے ہیں جن میں خصوصی طور پر قدیم مسیحی کتب کی مدد سے عقیدۂ تثلیث کا دفاع کیا گیا ہے، بعدازاں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ایسے دلائل جن سے نبوت کا اظہار اور اثبات ہوتا ہے، یہاں مفقود ہیں جو مولف کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں وافر مقدار میں نظر آتے ہیں اس کے خیال میں قرآن مجید کی آیات میں تناقض ہے اور جب غور سے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں ایسی آیات نظر آتی ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں، آخر میں اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے اور پھر اس نے عبداللہ کو عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ [1]

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مصنف کا یہ نام محض وہم ہے، المامون کے زمانے میں بغداد میں اس نام کا کوئی شخص موجود نہ تھا۔ مورخین نے المامون کے دورے کے تمام

[1] The Deveolopment of Dublin Review, the Christian attitude to Islam,: Daniel Norman(موسم سرما ۱۹۵۱ء)eexxx ۵ ص در۔

اہل علم وفضل کے نام درج کیے ہیں ان میں عرب بھی ہیں اور غیر عرب بھی، مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، لیکن اس رسالے یا اس شخص کے نام کی طرف کوئی ادنی اشارہ بھی موجود نہیں۔ کئی عیسائی علماء بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔

۳: اسی دور کا ایک اور مولف نیکتیاس البیزنطی (Nicatas of Byzantion) ہے، جس نے "دحض الاسلام" نامی کتاب باسل اول (۸۶۷۔۸۸۶ء) کے زمانے میں اس کی فرمائش پر تحریر کی، اس بوزنطی حکمراں نے یہ خواہش کی تھی کہ مسلمانوں کی عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور مصنف عیسائیت کے فضائل ومحاسن اور اسلام کے نقائص پر کتاب مرتب کرے، چنانچہ اس کتاب کے حصہ اول میں بوزنطی کنیسہ کے عقائد کے مطابق مسیحی عقائد، مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور حضرت مسیح کی الوہیت وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مولف نے رسول اکرم ﷺ اور قرآن کے خلاف زہر اگلتے ہوئے العیاذ باللہ بار بار نبی اکرم ﷺ کے لیے کاذب لفظ استعمال کیا ہے، اسی طرح کا خیال تھا کہ قرآن کریم جھوٹ اور غلط بیانیوں کا بے اصل مجموعہ ہے، نیز یہ کہ قرآن الوہیت مسیح اور ان کی صلیب پر لٹکائے جانے کی مخالفت کرتا ہے اور قرآن کا تصور ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ بھی اس کے خیال میں درست نہیں ہے۔

اس طرح قرون وسطی میں آنحضور ﷺ کی شخصیت کے بارے میں مغرب پوری طرح جہالت اور بدترین تعصب کا شکار تھا۔ ان کا گمان تھا کہ العیاذ باللہ آپ ﷺ ایک بدعتی فرقے کے بانی ہیں۔

۴: مسلمانوں کے لیے "بدعتی ہونے" کے نظریے کی اشاعت تھیوفانس (Theophanes موجودہ مابین ۷۵۷۔۸۱۸ء) نے بھی کی۔ اس نظریے کی مغرب میں وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی۔ حتی کہ انستاسیوس نامی پادری نے کلیسا کی تاریخ میں بھی اسے درج کیا، اس کتاب میں ان تمام اہم واقعات کا ذکر ہے جو آپ کی حیات طیبہ میں پیش آئے، مصنف نے سچ اور جھوٹ دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ملایا کہ تمام حقائق مسخ ہوگئے۔ مثلاً یہ کہ آپ

نے ابتدائی زندگی میں یہودیت اور مسیحیت کا مطالعہ کیا تھا اور تمام کتب مقدسہ پڑھی تھیں اور یہ کہ ایک ایسے راہب نے جسے کلیسا نے نکال دیا تھا، محمد ﷺ کے دعوائے نبوت میں مدد کی تھی اور یہ کہ العیاذ باللہ آپ کو دورے پڑتے تھے۔

اس دور میں مسلمانوں کے متعلق جزیرہ نمائے آئبیریا یعنی اندلس کے مسیحیوں نے کتابیں لکھیں، وہ اسلام سے پہلی ہجری کے آخری سالوں میں روشناس ہوئے تھے لیکن ان تحریروں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ''جہل مطلق'' نظر آتا ہے، آئبیریا میں برضا و رغبت اسلام کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو رہی تھی، اس لیے یہاں کے مسیحیوں نے اسلام کی اشاعت روکنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے:

**اول:**...... یہ کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق جھوٹی اور غلط سلط خبروں اور روایتوں کو پھیلایا۔

**دوم:**...... یہ کہ انھوں نے اسلام کے خلاف وہ تحریک شروع کی جسے مغرب والوں نے ''شہادت کی تحریک'' کا نام دیا ہے۔

اس تحریک کا آغاز عبدالرحمان الاوسط (۲۰۶۔۲۳۸ھ) کے زمانے سے عجب انداز سے ہوا، کچھ لوگ مسلمان قاضی کے پاس جاتے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان اقدس میں دیدہ و دانستہ گستاخی اور بدزبانی کا مظاہرہ کرتے، قاضی انھیں اسلامی احکام کی روشنی میں قتل کی سزا دیتا، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ تحریک مکمل طور پر ختم ہوگی تاہم مغرب ان لوگوں کو شہید قرار دیتا ہے، اس تحریک کا بانی ایک پادری ''الفارو'' نامی تھا۔ [1]

اس ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہت ہسپانوی عیسائی شوقیہ طور پر عربی زبان وادب سیکھتے

---

[1] اس کی تفصیل اندلس کے تمام مورخین مثلاً ڈوزی وغیرہ نے دی ہے، شان اقدس میں گستاخی کی اس تحریک کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب ہر دور میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ذہنی اذیت دے کر اور خصوصاً اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بدزبانی کر کے ذہنی خوشی اور مسرت محسوس کرتا رہا ہے، موجود دور میں ڈنمارک اور ناروے کے گستاخان نبوت کا شجرہ بھی شاید اندلس کے ان ہی بدفطرت لوگوں کے ساتھ ملتا ہے۔

اور عربی میں شاعری کرتے تھے، جب کہ عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا، اس کا اعتراف فارو نے کیا ہے۔ ❶ اس لیے اُس نے اسلام سے بدلہ لینے کی مذموم کوشش کی۔

۶: یہاں کے مصنفوں میں ایک پادری پولیوغیوس القرطبی (Euloguis of Cordova) بھی تھا جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مسلمانوں کے زیرِ سایہ گزارا اور اگر وہ چاہتا تو تمام حقائق معلوم کرسکتا تھا لیکن اس نے دانستہ ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے تمام معلومات ایک لاطینی نسخے سے حاصل کیے، جو اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ❷

اس نے اندلس کی ''خودکشی یا حصول شہادت کی تحریک'' کے دفاع میں رسول اکرم ﷺ کا ذکر انتہائی غلیظ زبان میں کیا ہے، اس نے یہ بھی لکھا کہ پیغمبرِ اسلام کو امید تھی کہ ان کے جسم کو ان کی وفات کے تین دن کے بعد فرشتوں کی مدد سے آسمان پر اٹھالیا جائے گا (العیاذ باللہ)۔ ❸

۷: اسی دور کی ایک اور کتاب جس کی مغرب میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی گئی، ہسپانوی پادری پدروسان باسکوال (Padro San Pascual) کی کتاب ''الشیعة المحمدیة'' (Sobroel seton Mahmoetana) ہے۔ ❹

اس نے بھی سیرت طیبہ کو حتی الوسع بگاڑ کر اپنی طرف سے جعلی اور من گھڑت قصے کر کے پیش کرنے کی کوشش کی، جیسے اس نے مکی دور میں اسلام قبول کرنے والوں میں بنوقریظہ کے یہودیوں کو بھی شامل کیا ہے۔

اندلس کے مذکورہ بالا دونوں پادریوں کی کتابیں ایک عرصے تک مغربی مولفین کے لیے اہم مصادر و ماخذ بنی رہیں۔

۸: پادری فینسانیت دوبوفیه (۱۲۶۴ء) نے اسلام کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کتاب مرآة

❶ گستاف: حضارہ الاسلام، عربی ترجمہ عبدالعزیز جاوید، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ص ۸۱۔۸۲۔

❷ خدا بخش صلاح الدین: Contribution to the History of islamic civilization، بار سوم، ج ۱، کلکتہ یونیورسٹی کلکتہ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۸۲۔

❸ ایضاً، ص ۱۸۳۔

❹ Daniel Norman، کتاب مذکورہ شمارہ ۲۳۱، ۱۹۵۹ء، ص ۲۹۶۔

التاریخ (Speculum Historiale) (کتب ۲۳۔ فصول ۲۴۔ ۶۸) میں کیا۔ ❶

یعنی یورپ میں اس وقت لکھی جانے والی تمام کتابوں کا لب ولہجہ مکمل طور پر مخاصمانہ اور مناظرانہ تھا اور ان میں کسی ایک مولف نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا انصاف سے مطالعہ کر کے حقائق پیش کرتا۔

خلاصۂ بحث

سطور بالا میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جن مغربی تصانیف کا ذکر آیا ہے ان میں درج ذیل باتیں قدر مشترک کے طور پر شامل رہی ہیں:

۱: اسلام کے خلاف لکھنے والے ابتدائی دور کے عیسائیوں اور مغربی مولفین کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے خدا واسطے کا بیر تھا یہ لوگ جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتے۔

۲: اس دور میں جن لوگوں نے آنحضور ﷺ کے خلاف قلم اٹھایا، ان میں زیادہ تر کا تعلق عیسائیوں کے مذہبی طبقے سے تھا، یہ سب کسی نہ کسی کنیسہ کے پادری تھے، جن کے دل اسلام کی مخالفت اور عداوت کی بنا پر پوری طرح سیاہ ہو چکے تھے۔

۳: اس دور میں لکھی گئی کتابیں زیادہ تر جہل مرکب کا مجموعہ تھیں، آنحضور ﷺ کے بارے میں لکھنے والے سرے سے اسلام اور پیغمبر اسلام سے یا تو واقف نہ تھے یا پھر انھوں نے دانستہ اسلام کی تصویر غلط اور بھونڈے انداز میں پیش کی۔

۲: صلیبی جنگوں کا دور

گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام اور مسیحیت کے مابین اس تصادم کا آغاز ہوا جسے ''صلیبی جنگوں'' (Crusades) کا دور کہا جاتا ہے اور جو ۱۰۹۶ء سے ۱۳۹۱ء تک جاری رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس دور میں مسیحی علماء اپنے مخالفین کے متعلق صحیح حقائق جانتے اور انھیں پیش کرتے مگر انھوں نے اپنے زمانے کے حالات اور واقعات سے کوئی اثر نہیں لیا اور بدستور اپنی سابقہ روش پر کاربند رہے۔ اس دور کے تمام مولفین کا تذکرہ ممکن نہیں، چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

❶ خدا بخش، کتاب مذکور، ص ۱۹۱۔

۱: پطرس الوقور (Peter The Venerable) نے جو کلونی کے ایک کلیسا کا پادری تھا، ۱۱۴۱ء میں دو لوگوں روبرٹ اور اہرمن کو عربی کتابوں کے لاطینی ترجمہ کے لیے ملازم رکھا، انھوں نے چار کتابوں کا ترجمہ کیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ جن کتابوں کا انھوں نے ترجمہ کیا اُن کا اصل نام کیا تھا لیکن پادری مذکور نے ان تراجم پر مشتمل اپنی کتاب کا نام "حیات المسلمین المکروہین الضالین" (Chronica menio so et ridiculasa cenarum) رکھا۔ کتاب کے نام سے ہی واضح ہے کہ اس نے اس کتاب میں کیسے کیسے گل کھلائے ہوں گے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے خاندان، آپ ﷺ کے حیات مبارکہ اور خلفائے راشدین سے یزید اول اور حضرت حسینؓ کی شہادت تک واقعات کا ذکر گیا ہے۔

اسی روبرٹ نے قرآن کریم کا لاطینی بھی ترجمہ کیا، جو بہت معروف ہوا، حالانکہ یہ ترجمہ صحیح نہیں تھا، یہ ترجمہ پادری پطرس کو پیش کیا گیا تو اس نے بھی اس میں حذف و ترمیم کی، تاہم وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ مسلمان بت پرست تھے یا "ایک بدعتی فرقہ" تھے لیکن یہ ضرور کہا کہ دونوں میں سے کوئی صورت بھی ہو، اس مذہب کو ختم کرنا ضروری ہے، خواہ اس کے لیے گستاخی اور استہزاء کی تحریک ہی کیوں نہ اپنائی جائے۔ ❶

اس کی اس کتاب سے جواب تک محفوظ ہے، پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی معلومات کے حصول کا دائرہ محض قرآن کریم تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس نے سیرت رسول سے بھی مدد لی جس کا اس نے لاطینی میں ترجمہ کروایا تھا۔

اس کتاب سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بغض و عداوت کے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی اور یورپ کی تمام زبانوں میں اس کتاب کے ذریعہ اور بھی لٹریچر تیار کیا گیا، کچھ لوگوں نے اشعار میں بھی اپنے ہفوات کو نظم کیا۔

۲: ان لوگوں میں والٹر سینی (Walter Sens) بھی شامل ہے، جس نے لاطینی میں حیات رسول

---

❶ The Western attitude towards islam During the Period of crusdes: Munro D.c اور Speculam، ج ۱، (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۱ء)، ص ۳۲۹۔۳۳۷۔

کونظم کیا۔

۳: الیگزینڈر ڈیوپونٹ(Alexander Dupont)نے فرانسیسی زبان میں یہی کام کیا۔ ❶

۴: ایک شعری مجموعہ امبریکومینز (Embrico Mains)

اورتوسی ہیلڈ برٹ (Touss Hildbert) نے مرتب کیا۔

ان کا یہ شعری مجموعہ حیات محمد(Avita Mahmeta)کے نام سے طبع ہوا، ایف ہوبنر(F.Hubner)نے اس کی تحقیق کی اور اسے معروف رسالے Historicle Vicrteljaher Schft شارہ ۲۴ سال ۱۹۳۵(ص ۴۴۱۔۴۹۰) میں شائع کیا۔ ۱۱۴۲/اشعار پر مشتمل یہ شعری مجموعہ جھوٹی اور من گھڑت روایتوں سے پُر ہے، جیسے آنحضور ﷺ کی مدد کے لیے ایک کسی مجہول جادوگر کی مدد کا ذکر۔ ❷

والٹر سینی کا اوپر ذکر آ چکا ہے،اس کے شعری مجموعہ کا نام(Otio de machomet)تھا اور اس کی لفظی تحقیق (RBc Heyens) نے کی اور اسے رسالے(Socric Frudiri)کے شارہ ۸ سال ۱۹۵۶،ص ۲۸۵۔۳۲۸ میں شائع کیا،اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۹۰ تھی،اس قصیدے کا حال بھی حسب سابق تھا۔

۵: اسی دور میں پہلے صلیبی حملے کی تاریخ پر لکھی جانے والی مغربی کتاب (Gesta Dei Perfrancos)کے مولف گلبرٹ آف نوجنٹ(Guelbert of Nogent)نے رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ پر بھی ایک پوری فصل لکھی ہے۔مگر مولف کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اسے آنحضور ﷺ کا نام تک معلوم نہیں، وہ آپ کو ماتھومس(Mathomus) لکھتا ہے۔اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اسے کوئی ایسا ماخذ نہیں ملا جس سے وہ رسول اکرم ﷺ کے حالات لکھنے میں مدد لے سکتا،لہٰذا اس نے صرف ان روایات کا ذکر کیا ہے جو اہل مغرب

---

❶ Speculan اور The Wester attiuted to islam during the period of crusales: Munro D.C(مطبوعہ جولائی ۱۹۳۱ء)،ص ۳۲۹۔۳۳۷۔

❷ خدا بخش صلاح الدین، کتاب مذکورہ،ص ۱۹۱۔

زبانی طور پر ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہتے تھے، اسی طرح اسے آنحضور ﷺ کے زمانے کا بھی صحیح علم نہیں اس نے اس راہب کا ذکر کیا ہے جسے کلیسا نے ناراض ہو کر نکال دیا تھا، اس نے کلیسا سے بدلہ لینے کے لیے نوجوان محمد کو تیار کیا (العیاذ باللہ) اسی نے آپ کو نیا دین پیش کرنے کے لیے آمادہ کیا اور آپ کی شادی ایک مال دار عورت خدیجہؓ سے کروائی۔

اسی طرح یہ خرافات بھی بیان کی کہ محمد نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ عن قریب ایک معجزہ پیش کرنے والا ہے، اچانک ایک گائے آئی وہ محمد کے سامنے جھکی اور اس کے سینگوں پر ایک کتاب تھی، اس دن سے کسی کو بھی آپ ﷺ کی نبوت میں شبہہ نہ رہا۔

اس کی کتاب میں واحد بات جو صحیح تھی یہ تھی کہ مسلمان محمد کو نہ تو خدا مانتے ہیں اور نہ ہی ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۶: اسی دور میں ایک شخص میتھیو برس نے گلبرٹ مذکور کی کتاب کو سامنے رکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام پر کتاب لکھی۔

۷: اسی طرح جیکس دی وٹری (Jaques de Vitry) نے مسلمانوں کی ''ہدایت'' اور انھیں نصرانیت کی طرف لانے کے لیے ایک کتاب تصنیف کی، اس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق انتہائی گندی اور رکیک زبان استعمال کی۔ اس نے بڑی مشکل کے ساتھ آپ کے عہد کی تعیین کی اور مسلمانوں کے لیے پہلی مرتبہ دو ایسے الفاظ استعمال کیے جو صدیوں استعمال ہوتے رہے، ان میں ایک سارا سینی (Saraceni) منسوب بہ سارہ زوجہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرا ہاجرینی منسوب بہ حضرت ہاجرہ (زوجہ حضرت ابراہیمؑ) ہے۔

۸: اسی صدی میں دو ایسے مصنف سامنے آئے جنھوں نے آنحضور ﷺ کے متعلق کچھ مزید معلومات لوگوں کے سامنے پیش کی، ان میں سے ایک ولیم آف مال میسبری (Wileam of malmesbury) اور دوسری پطرس الفونسی (Petrus Alponsi) تھا، انھوں نے مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کچھ صحیح حقائق پیش کیے۔ جیسے ولیم آف میسبری نے عام مغربی خیالات کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ مسلمان محمد کو خدا نہیں مانتے بلکہ وہ یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ محمد اللہ کے نبی اور رسول ہیں، ولیم نے یہ کتاب ۱۱۲۰ء کے قریب لکھی تھی۔

۹: پطرس الفونسی ہسپانیہ کا ایک یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا، اس نے ایک یہودی اور مسیحی کے مابین مکالمہ (Dialogue of christian and a jew) لکھا جس میں بارہویں صدی عیسوی تک لکھی جانے والی کتابوں کی بہ نسبت اسلام مسلمانوں کے متعلق بہت معلومات ہیں۔

۱۰: عیسائی ولیم طرابلسی (William of Tripoli) نے ۱۲۷۱ء کے قریب ایک کتاب لکھی جس کا مقصد مسلمانوں میں تبلیغ کا کام کرنے والی مسیحی مہمات کی مدد کرنا تھا اس نے یہ تو بتایا کہ محمد ﷺ چالیس برس کی عمر میں دعوائے نبوت کیا اور آپ پر وحی حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت سے آتی تھی لیکن ساتھ ہی اس نے کئی جھوٹی اور غلط باتوں کا بھی ذکر کیا جس میں کلیسا سے ناراض راہب کا ذکر خاص طور پر شامل ہے۔ ❶

۱۱: آخر میں دانتے کا ذکر مناسب ہوگا جس نے ''الکومیدیا الالہیہ'' (۱۴)(Al-Comedia) کے نام سے کتاب لکھی۔

دانتے ۱۲۶۵۔۱۳۲۱ء کے درمیان زندہ رہا، اس کو قرون وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے مابین ایک پل کا درجہ دیا جاتا ہے، دانتے نے سلطان صلاح الدین ایوبی کا ذکر دنیا کی بڑی شخصیات میں کیا ہے اور چھ مسلمان فلسفیوں بشمول ابن سینا اور ابن رشد کو جنت اور دوزخ کے درمیان میں دکھایا ہے جب کہ خاکم بدہن اس نے آنحضور ﷺ کو جہنم کے اٹھائیسویں درجے میں پیش کر کے اپنے خبث باطن کا اظہار کیا ہے۔ اور وجہ یہ لکھی کہ آپ العیاذ باللہ کنیسہ سے دشمنی رکھتے تھے اور آپ نے دین میں بدعت کی ابتدا کی گویا وہ آنحضور ﷺ کو ایک عیسائی سمجھتا تھا۔ اس سے اس کی خباثت وجہالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

## ۳: مغرب میں مطالعہ سیرت کا متاخر دور (تا انیسویں صدی عیسوی)

یورپ اپنی بیداری کے دور میں بھی اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے متعلق بدستور

❶ خدا بخش صلاح الدین، کتاب مذکورہ، ص ۲۰۴۔

❷ Islam is Englis Literaure: B.P. امریکہ یونیورسٹی، بیروت، پریس، ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۔

جہل مرکب، جھوٹے اور من گھڑت قصوں کا شکار رہا اور علمی اور فکری بیداری کے دعووں کے باوجود اس کی اس روش میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ❶

اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق لکھنے کے لیے ایک نئے ماخذ کا اضافہ ہوا، یہ ان لوگوں کی یادداشتیں تھیں جو صلیبی حملوں میں مسیحی لشکر کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑنے اور ان سے القدس الشریف کو آزاد کرانے کے لیے گئے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود اکثریت تک ان کی رسائی نہ تھی۔ ❷ یہ لوگ بڑی آسانی سے اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے تعصب اور خبث باطن اور اظہار کرنے کے لیے ان یادداشتوں کا ہی سہارا لیا۔

ان کی جہالت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ روشن خیالی کے دعووں کے باوجود اس دور میں بھی بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ محمد ﷺ العیاذ باللہ مسلمانوں کے خدا تھے اور مسلمان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ سولہویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں ایسی فرضی تصویریں پائی جاتی ہیں جن کو Mammentry کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ بتوں کی تزئین و آرائش کے لیے استعمال ہوتا تھا اور دونوں الفاظ رسول اکرم ﷺ کے اسم مبارک ''محمد'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر جہالت اور خبث باطن کی اور کیا مثالیں ہوں گی۔

اس دور میں بھی وہ گروہ موجود تھا جو یہ گمان کرتا تھا کہ محمد ﷺ عیسائی مذہب سے الگ ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنا ایک الگ بدعتی فرقہ بنا لیا تھا، تاہم ان میں ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کو ایک مستقل دین اور مذہب قرار دیتا تھا لیکن آنحضور ﷺ سے کذب و فریب جیسے الزامات منسوب کرتا تھا۔ (العیاذ باللہ)

ہاں جو بات ان میں مشترک تھی وہ یہ کہ اسلام ہی ان کا دشمن اعظم ہے۔ ❸

---

❶ Islam is Englis Literaure: B.P. امریکہ یونیورسٹی، بیروت، پریس، ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۔

❷ بارکی ف ج: نتاج التاریخی ومعالجہ للشرقین الادنی والاوسط، در مورخوا الشرق الاوسط، تحریر برنا رد لوئیس ب م ہولٹ لنڈن، مطبعہ جامعہ اوکسفرڈ ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۹۔

❸ بحوالہ واٹ د، م: کارلائل، محمد، در صحیفہ ہیبرٹ، عدد ۵۳، شعبان ۱۹۵۳ء، ص ۲۴۹۔

اس زمانے میں یورپ پوری طرح ترکی کے حملوں کی زد میں تھا، سولھویں صدی کے وسط میں سلیمان القانونی کی ترک فوجیں (ویانا) تک جا پہنچی تھیں، اسی لیے بیداری کے دعوی کے باوجود ان لوگوں سے اسلام کے متعلق انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

تعصب بڑھنے کی ایک اور وجہ سولھویں صدی عیسوی میں مارٹن لوتھر کے تحت ابھرنے والی پروٹسٹنٹ تحریک بھی تھی، جس نے صدیوں کی پاپائیت اور کلیسائی جور و ستم کے خلاف آواز اٹھا کر اس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیتھولک لوگوں کا خیال تھا کہ پروٹسٹنٹوں کے عقائد مسلمانوں سے مشابہ ہیں حالانکہ پروٹسٹنٹوں نے ہمیشہ اس الزام کی تردید کی، مگر کیتھولک فرقہ نے پروٹسٹنٹوں کے طرز استدلال کو بھی ''دشمن کبیر'' یعنی مسلمانوں کے انداز استدلال سے مشابہ قرار دیا۔ چنانچہ انھوں نے اس دور میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دشمنی اور نفرت کے اظہار کے لیے رسول اکرم ﷺ کے نام کے ساتھ کسی نامناسب لفظ کا اضافہ کر دیا کریں گے۔ ❶

مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کا نیا دور اٹھارہویں صدی سے شروع ہوا، جب مغرب کے تین بڑے ممالک برطانیہ، فرانس، ہالینڈ نے تجارتی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے ارض مشرق خصوصاً اسلامی ملکوں کے ساتھ روابط پیدا کیے۔ ان ملکوں کی حکومتوں کی سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ و تعلیم کے لیے وسیع پیمانے پر مشنری تبلیغی سرگرمیوں کی ابتدا کے ساتھ اسلامی اور عربی کتب کا بڑا ذخیرہ مغربی کتب خانوں میں منتقل ہوا، جن کے ترجمہ، مطالعہ اور تجزیہ کا نیا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پیرس، لندن، آکسفورڈ اور کیمرج وغیرہ جامعات میں عربی شعبے قائم ہوئے۔ اسی دور میں قرآن کریم کے مختلف مغربی زبانوں میں ترجمے ہوئے، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں قرآن کریم کے ابتدائی تراجم ۱۶۴۹ء میں سامنے آ چکے تھے۔

اس دور میں یورپ کے مصادر و مآخذ حسب ذیل ہوئے۔

۱: مخطوطات جو ان کے قومی ورثے کے طور پر لاطینی زبان میں موجود تھے۔

---

❶ Montgomry Watt. LH : the historical journal on meehammad Early، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۲۴۹۔

۲: عربی اور اسلامی کتب، اصل زبان میں یا کسی یورپی زبان میں ترجمہ۔

۳: مغربیوں کے سفرنامے جو مشرق کے مختلف ملکوں میں گئے۔

موخرالذکر میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اپنی تبلیغی اور دعوتی مہمات کے سلسلے میں مشرقی ممالک میں گئے تھے اور ان کے دل پہلے ہی تعصب اور جہالت کی بنا پر سیاہ ہو چکے تھے، اس لیے ان کے سفرناموں نے لوگوں کی جہالت اور تعصب میں اضافہ ہی کیا۔

۱: عہد بیداری میں بھی ''کبوتر'' والا قصہ جو العیاذ باللہ آنحضور ﷺ کے کان میں سرگوشی کرتا تھا بدستور مغربی ادب کا حصہ رہا، شیکسپیئر کے ڈرامے ہنری اول، ہنری دوم (ص ۱۴۰) میں یہ عبارت ملتی ہے۔

کیا کبوتر نے محمد کو الہام کیا؟

تب تو تجھے پھر.......... عقاب نے الہام کیا ہوگا۔ ❶

۲: شیکسپیئر سے پہلے انگریزی شاعر جان لیڈگیٹ (John Lydgate) (م ۱۴۵۱ء) آنحضور ﷺ کا اپنی شاعری میں العیاذ باللہ ایک ماہر جادوگر اور ماہر فلکیات کی حیثیت سے ذکر کیا۔

۳: ہیگن (Hadgen) نامی شاعر نے بھی آنحضور ﷺ کی جادوگری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ﷺ نے جادو سے عرب کی مال دار عورت خدیجہ سے شادی کی۔ دونوں کی جہالت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا نام اول الذکر نے گارڈیجان (Gadigan) لکھا ہے اور یہ کہ وہ کورازان (Corazan) کے ملک کی ملکہ تھیں۔ ❷

لیڈگیٹ نے اس کبوتر کو جو آنحضور ﷺ کے کان میں سرگوشی کرتا تھا، دودھ کے رنگ کی طرح سفید قرار دیا۔ ❸ اور رسول اکرم ﷺ کی وفات کے متعلق بعینہ وہی داستان نقل کی جو قرون

---

❶ Hitti P.K. Islam and the West Princeton Dian Nastran co: ص ۵۴۔

❷ Smith BP، کتاب مذکورہ، ص ۵۴۔

❸ ایضاً، ص۔

وسطیٰ میں رائج تھی۔

غرض علمی اور فکری بیداری کے اس دور میں جس بے باکی کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جھوٹ گھڑے گئے، اس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔

۴: بیکن نے بھی اپنے مضمون ''جرأت'' میں لکھا کہ:

''محمد نے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ وہ ان کے سامنے پہاڑ کو بلائے گا، جو ان کی بات سنے گا اور مانے گا، یہ سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے، محمد نے کئی مرتبہ پہاڑ کو بلایا، مگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، یہ دیکھ کر محمد ذرا بھی شرمندہ نہ ہوا اور اس نے کہا کہ اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آیا تو کوئی بات نہیں، وہ پہاڑ کے پاس چلا جاتا ہے۔❶ معروف انگریزی کہاوت If the mountain woluld not come to Mohommet, Mohoomet will go to the mountain. اسی فرضی اور جھوٹی قصے پر مبنی ہے۔''

۵: پروٹسٹنٹ تحریک کے بانی مارٹن لوتھر نے بھی ایک دوسرے انداز میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب اور نفرت پھیلانے کی کوشش کی، اس نے کہا کہ مسلمانوں کی ہدایت کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے دل پتھر کے ہیں انھوں نے کتاب مقدس کو رد کیا ہے اور تمام دلائل و براہین سے انکار کیا ہے، لوتھر کے خیال میں اسلام صرف ترکوں کا دین ہے، جو یورپ کے لیے سیاسی اور فوجی پہلو سے خطرہ ہیں، اس لیے امریکہ سمیت بہت سے یورپین ملکوں میں ترک کا لفظ ''مسلم'' کے مترادف تھا، لوتھر نے بھی اسلام کی مخالفت میں کمی نہیں کی۔

۶: ایک اور مغربی بدطینت شخص فلکٹن پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ گمان ظاہر کرتا تھا کہ محمد یا تو یاجوج تھے یا ماجوج یا پھر دونوں۔

۷: ۱۵۹۷ء میں ایک مجہول الاسم شخص نے ''سیاستہ الامبراطوریۃ الترکیۃ'' کے نام سے کتاب لکھی جس میں اسلام اور اس کی اخلاقی مبادیات کے متعلق پہلی مرتبہ کچھ صحیح اور درست باتیں کہی گئیں۔❷

---

❶ فرانسس بیکن، المقالات والنصائح، نیویارک مطبع بیٹریا ویز، ص ۴۹، ۵۰۔

❷ Addison، کتاب مذکورہ، ص ۲۴۔

لیکن مغرب میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق انتہائی متعصبانہ کتب کی اشاعت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

۸: چنانچہ بیڈویل (Bedwell م ۱۶۳۲ء) نے ایک کتاب "محمد" Mohamedis impostarae کے نام سے لکھی۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ کتاب کا موضوع کیا تھا۔ ❶

۹: اسی طرح جینی برارڈ (Genebrard، ۱۵۳۵۔۱۵۹۷ء) نے جو ایک مشہور کیتھولک مناظر تھا، اس بنا پر استہزاء کیا کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید کو عبرانی، یونانی یا لاطینی کے مقابلے میں عربی میں لکھا اور یہ کہ العیاذ باللہ محمد ﷺ وحشی تھے اور اس زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے، جو ان کے وحشی مقاصد کو پورا کر سکے۔

۱۰: اسی سولہویں صدی میں ایک نامعلوم شخص نے ایک کتاب (دجالو العالم الثلاثة De Tribus Impostaribes کے نام سے (العیاذ باللہ) تحریر کی، جس میں اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا، اس کے باوجود اس دور کے مسیحیوں میں یہ کتاب خوب پھیلی۔

سترہویں صدی عیسوی میں کچھ عربی کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوا جس سے تعصب تو کم نہیں ہوا لیکن لوگوں کی اسلام کے متعلق معلومات بہتر ہونے لگیں۔

۱۶۴۹ء (۲۴) ❷ میں انڈری ڈوریئر (Andre Du Ryer) نے فرانسیسی میں اور کچھ عرصے کے بعد انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، عربی کی کئی کتابوں کے بھی انگریزی تراجم ہوئے۔

۱۱: برطانیہ میں مستشرق ایڈورڈ پوکوک (Edward Pococke) نے اور فرانس میں پٹیس ڈی لاکروکس (Petes de la croix) ہوئے۔ پوکوک آکسفورڈ (۱۶۹۱ء) میں عربی کی تعلیم دیتا تھا، وہ کچھ عرصہ شام میں بھی رہا تھا۔ اس نے ۱۶۵۰ء میں ابوالفرج العبری کی کتاب "تاریخ مختصر الدول" کا ترجمہ شائع کیا۔ العبری ایک عیسائی پادری تھا اور شام کے ایک کلیسا میں لاٹ پادری کے منصب پر فائز تھا، تیرہویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں اس نے

❶ Addison، کتاب مذکورہ، ص ۲۴۔ ❷ ایضاً۔

مذکورہ کتاب تحریر کی، ترجمہ کا نام اس نے Specimen Historical Arabum رکھا۔ العبری مذکور کی کتاب کا رسول اکرم ﷺ کی ذات، ظہور اسلام اور اسلام کی اشاعت سے کوئی مرکزی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ تمام مباحث ضمنی طور پر زیر بحث آئے تھے۔ اسی لیے اس کتاب کے ذریعے اصلی ماخذ پر مبنی ایسا مواد سامنے آیا جو نسبتاً حقیقت کے قریب تھا، اسی لیے اسے مغرب میں عہد حاضر تک ایک اچھے ماخذ کے طور پر قبول کیا جاتا رہا۔ ❶ اس میں آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ اور قدیم عربوں کی عادات کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا، پوکوک نے اس کے متعدد نسخے جمع کر کے پوری طرح تصحیح اور تحقیق کی، حواشی میں کئی فرضی قصوں کی تردید کی، مثال کے طور پر اس نے لکھا کہ معلق تابوت کے قصے پر مسلمان ضرور ہنسیں گے، اسی طرح اس نے کبوتر والے قصے کی بھی تردید کی۔ ❷

۱۲: ۱۶۹۱ء میں ایک پادری لیوس مراکشی (Lousi Maracci) نے قرآن مجید کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جس کے ساتھ اسی نے ایک ضمیمہ بعنوان Prodromus alrefu Tation em Accorani شامل کیا، جس میں اس نے اسلامی مصادر کی مدد سے سیرت طیبہ کا بھی ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمان مؤلفین کی کتب کو صحیح مانتا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ ''جب ہم اپنی کتابیں اپنے دشمنوں کے سامنے پیش کریں تو وہ طاقت ور اور قوی حجت والی ہوں'' اس کے باوجود اس پادری کی تحریر تعصب اور خباثت سے خالی نہیں تھی، اس نے آنحضور ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ نامناسب الفاظ کا اضافہ کیا، مجموعی طور پر اس کی یہ کتاب مناظرانہ ومجادلانہ انداز کی ہے۔ ❸

اسی صدی میں ایک مصنف (Alexander Ross) نے دو کتابیں اسلام اور پیغمبر اسلام

---

❶ Daniel Normn، کتاب مذکور، ص ۲۹۵۔

❷ Hitti, P.K، کتاب مذکور، ص ۵۴۔

❸ Muhammadanism Hurgronje e Snoudr، نیویارک، Putman's sons، ۱۹۳۶ء، ص ۱۹۔

کے متعلق تحریر کیں لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے کہ ان کتابوں کا مولف وہی ہے۔

۱۳: پہلی کتاب کا عنوان (A Brief Sketch of the life and death of Mahmot the Prophet of the Turks another of the Al-coran accompanying to the translation of the koran) ہے۔ اس نے آنحضور ﷺ کے متعلق وہ تمام قصے اور جھوٹی کہانیاں جو قرون وسطی میں متداول تھیں، نقل کر دیں اور آنحضور ﷺ کے بارے میں انتہائی گھٹیا اور غلیظ زبان استعمال کی۔ ❶

۱۴: دوسری کتاب کا عنوان پاندی بلیا (Pandeblia) ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا اس وقت تک دستیاب مآخذ کی مدد سے نسبتاً بہتر طریقے سے ذکر کیا گیا ہے اور یہ کتاب سابقہ کتب میں نقل کردہ فضول خرافات سے بھی خالی ہے۔

۱۵: اسی صدی میں ہوتیجر نے اپنی کتاب تاریخ الشرق (Historia Orientlis) میں جو زورچ سے ۱۶۵۱ء میں طبع ہوئی، ایک مستقل فصل اسلامی اور کیتھولک تعلیمات کے مابین مشابہت دکھانے کے لیے مختص کی۔ اس نے چھٹی فصل میں اس الزام کی تردید کی ہے۔ کہ پروٹسٹنٹوں نے اسلامی عقائد کو مسخ کیا ہے بلکہ یہ کہا کہ بیلرمن (Bellarmine) نے کیتھولک فرقے کے عقائد کی صحت پر جو دلائل دیے ہیں، وہ مسلمانوں کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

۱۶: ہمفری پریڈوکس (Humphry Prideaux) نے جو ۱۶۹۷ء میں نوروچ (Norwich) کا ڈین تھا۔ سیرت طیبہ کے متعلق ایک کتاب لکھی جو برسوں تک مغربی مولفین کا اہم ماخذ رہی ❷ اس نے اس کتاب کا نام درج ذیل رکھا:

The true nature of imoprture fully displayed in the life of Mahmomet, with a discaurse anien'd for the vindication of

---

❶ Smith، کتاب مذکور ص ۲۹، ۳۰۔

❷ Hurgronje، کتاب مذکور ص ۱۸۔

christianity from the charge of offered to consideration of the peists of the present age.

اس کتاب کے ۱۶۹۷ء میں دو ایڈیشن چھپے، بعد میں اس کے کئی ایڈیشن طبع ہوئے اور فرانسیسی میں ۱۶۹۸ء میں اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ❶

دراصل اسی زمانے میں ڈیسنٹ کے نام سے ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر تو عقیدہ رکھتا تھا لیکن وحی الٰہی، رسولوں اور آسمانی شریعتوں کا منکر تھا، ان دونوں فرقوں یعنی قدامت پرستوں اور ڈیسنٹ کے درمیان بحث وجدال کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک فرقہ دوسرے کے یہ الزام دیتا تھا کہ اس کے عقائد مسلمانوں کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

مصنف نے یہ کتاب کلیسا کے فرقوں کے مابین ہونے والے تصادم کو رفع کرنے کے لیے لکھی تھی، مصنف کے خیال میں عیسائی فرقوں کی ان حرکتوں نے خدا کو ان سے ناراض کر دیا تھا اور ان پر مسلمانوں کو مسلط کر دیا گیا تھا، اس کی تالیف کا مقصد مذہبی ہونے کے ساتھ اسلام کی غلطیوں اور عیسائیت سے تناقض کو دکھانا تھا۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے کا عنوان ''حیات محمدؐ'' ہے، یہ ۱۸۰۸ء کی طباعت کے ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ ڈیسنٹ کے الگ ہونے والے فرقے کے تعلق سے ۱۱۵۔۳۰۷ صفحات کا ہے، تیسرا حصہ مصادر وماٰخذ کی تفصیل پر ہے جس میں عربی، یہودی، کلدانی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی کتب سے استفادہ نے پورے یورپ میں بڑی شہرت بخشی۔

بریڈوکس نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو قلم بند کرنا نہیں ہے بلکہ العیاذ باللہ حتی الوسع آپ ﷺ کی کذب بیانی کو بدترین صورت میں واضح کرنا ہے، مصنف نے یہ تاثر دیا ہے کہ اس نے ۳۶ عربی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جن کے نام اس نے حاشیے میں

---

❶ The treatment of Arabic History by Priodox edited by Lewis Bernard and Held P.m andL Holt P.M sale, Historians of the Middle East, لنڈن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۲۳ء، ص ۲۹۱۔

درج کیے ہیں لیکن کتاب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس بدبخت اور شیطان صفت انسان نے ان کتابوں کے یورپی زبانوں کے صرف تراجم سے استفادہ کیا ہے اور خود مصنف کو عربی نہیں آتی ❶ اور اس کا منبع علم صرف تین چار کتابوں تک محدود ہے یعنی توماس لاینیوس کی تاریخ المسلمین (لائیڈن ۱۶۶۳ء) ایڈورڈ پوکوک کی مختصر تاریخ العرب (آکسفورڈ ۱۶۶۳ء)(Contextis Gemarum) آکسفورڈ ۱۶۵۹ء اور تیسری کتاب المکین (Almakin) جسے عبرانی لاطینی میں اریپینیوس (Erpenius) نے ترجمہ کیا اور ابن العبری کی کتاب جس کا لاطینی ترجمہ پوکوک نے کیا۔

اس نے ترجمہ قرآن کے لیے روبرٹ انگلش مین (Robert the Englishmann) کے ترجمہ پر اکتفا کیا جسے اس نے بارہویں صدی عیسوی میں مکمل کیا تھا اور جسے بیبلیانڈر (Bibiander) نے شائع کیا تھا۔

۱۷: ڈچ مولف ایچ رولانڈ (H. Roland) کی کتاب De Religione Mahommediea کی صورت میں جو روترخت سے ۱۷۰۳ء میں طبع ہوئی، پہلی مرتبہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو تعصب کی بجائے اعتدال سے پیش کیا اور اس نے یورپ میں اس اصول کو متعارف کرایا کہ مشرق کو اس کے اپنے مآخذ کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام جسے مسیحی مصنفین نے انتہائی غلط انداز میں اور بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ لاکھوں مسلمانوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوا؟ ❷

اس نے لکھا کہ جس طرح دین اسلام کی مخالفت کی گئی اور اسے بگاڑ کر پیش کیا گیا، ایسا کسی اور دین کے ساتھ نہیں کیا گیا اور اگر مسیحیت مسلمانوں کے ساتھ روابط رکھتی تو اسے بے حد فوائد حاصل ہوتے لیکن اس کتاب کو مغرب کے متعصب ماحول میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

۱۸: اسی زمانے میں ایک اور کتاب سامنے آئی، جو اس سے بھی زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ لکھی گئی تھی، یہ کتاب کونٹ ڈی بولین ولرز (Count de Boulian Villlers) نے

❶ ایضاً، ص ۲۹۰۔۳۰۲۔

❷ Hurgronje، کتاب مذکورہ، ص ۲۰۔